BNEC101DET

ہندوستانی معاشی تاریخ (مغلیہ اور برطانوی دور)

(Indian Economic History (Mughal and British Period))

بی۔اے۔(آنرز)

چار سالہ پروگرام

پہلا سمسٹر (معاشیات)

مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدرآباد۔32، تلنگانہ، بھارت

Copyright © 2025, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad

All right reserved. No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronically or mechanically, including photocopying, recording or any information storage or retrieval system, without prior permission in writing form the publisher (registrar@manuu.edu.in)

ISBN	:	978-81-992584-1-9
Course	:	Indian Economic History (Mughal and British Period)
First Edition	:	September 2025
Copies	:	500
Price	:	160

Course Coordinator

Dr. Fasalurahman P. K., Asst. Prof. (Economics), CDOE, MANUU

Editorial Board/Editors

Dr. Fasalurahman P.K., Assistant Professor, Economics, CDOE, MANUU

Mr. Mohd Waseem, Assistant Professor (C), CDOE, MANUU

Mr. Mustajab Khatir, Assistant Professor, Department of Economics, MANUU

Prof. Farida Siddiqui, Head, Department of Economics, MANUU

Language Editor

Mr. Mustajab Khatir, Assistant Professor, Department of Economics, MANUU

Mr. Mohd Waseem, Assistant Professor (C), CDOE, MANUU

Production

Prof. Nikhath Jahan, Professor (Urdu), CDOE MANUU

Mr. P Habibulla Assistant Registrar, Purchase & Stores Section, MANUU

Dr. Mohd Akmal Khan, Assistant Professor (C)/Guest Faculty, CDOE MANUU

Mohd Abdul Naseer Section Officer, CDOE MANUU

Shaik Ismail, UDC, CDOE, MANUU

Syed Faheemuddin, LDC Purchase & Stores Section, MANUU

On behalf of the Registrar, Published by:

Centre for Distance and Online Education

Maulana Azad National Urdu University

Gachibowli, Hyderabad-500032 (TG), India

Director: dir.dde@manuu.edu.in *Publication:* ddepublication@manuu.edu.in

Phone number: 040-23008314 Website: manuu.edu.in

CRC Prepared by Mohd Waseem, CDOE, MANUU

Printed at: Print Time & Business Enterprises

فہرست

پیغام		وائس چانسلر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی	5
پیغام		ڈائریکٹر، مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم	6
کورس کا تعارف		کورس کوآرڈی نیٹر (معاشیات)	7
اکائی نمبر	**اکائی کا نام**	**مصنف**	**صفحہ نمبر**
بلاک I: مغلیہ ہندوستان			
.1	مغلیہ ہندوستان: ریاست، آبادی اور معیشت	ڈاکٹر داؤد ابراہیم	9
.2	مغل ہندوستان میں مالگزاری نظام، زرعی پیداوار اور زرعی بحران	جناب محمد عاصم	20
.3	مغل دور میں صنعت اور فنکاری، ملکی اور غیر ملکی تجارت، مالیاتی نظام	جناب محمد عاصم	40
.4	مغلیہ ہندوستان: شہری زندگی، معاشی بحران اور سرمایہ داری کا کردار	ڈاکٹر داؤد ابراہیم	57
بلاک II: برطانوی ہندوستان			
.5	ایسٹ انڈیا کمپنی، نوآبادیات کی طرف منتقلی، ہندوستان میں برطانوی معاشی کنٹرول کی نوعیت کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر داؤد ابراہیم	76
.6	آبادی، معیشت، اور تجارت: برطانوی ہندوستان کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر فصل الرحمان پی۔کے۔	90
.7	زراعت، زمینی مالگزاری، صنعت—برطانوی ہند کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر سید میر ابوالحسین	107
.8	زوال صنعت، دولت کی نکاسی برطانویوں کے تقاضے اور ترجیحات	ڈاکٹر سید میر ابوالحسین	129
	فرہنگ		148
	تجویز کردہ اکتسابی مواد		150
	نمونہ امتحانی پرچہ		152

مصنفین کی تفصیلات

(Writer's Details)

Dr. Daud Ibrahim, Assistant Professor (Contractual), Department of History, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad	ڈاکٹر داؤد ابراہیم، اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹرکچول)، شعبۂ تاریخ، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
Mr. Mohd Aasim, Assistant Professor (Contractual), Centre for Distance and Online Education, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad	جناب محمد عاصم، اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹرکچول)، مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
Dr. Syed Meer Abul Hussain, Assistant Professor (Contractual), Centre for Distance and Online Education, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad	ڈاکٹر سید میر ابوالحسین، اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹرکچول)، مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
Dr. Fasalurrahman P. K., Assistant Professor (Economics), Centre for Distance and Online Education, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad	ڈاکٹر فصل الرحمان پی۔کے۔، اسسٹنٹ پروفیسر (معاشیات)، مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

پروف ریڈرس(Proofreaders):

اول: جناب محمد وسیم

دوم: جناب مستجاب خاطر

سوم: ڈاکٹر فصل الرحمان پی۔کے۔

ٹائٹل پیج(Title Page): جناب ابراہم اکرم صدیقی

پیغام

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (MANUU) 1998 میں پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ کے ذریعے قائم کی گئی۔ یہ ایک مرکزی جامعہ ہے جس نے این اے اے سی کی جانب سے گریڈ +A حاصل کیا ہے۔ اس جامعہ کے قیام کے مقاصد ہیں: (1) اردو زبان کا فروغ، (2) پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کو اردو میڈیم میں قابل رسائی اور دستیاب بنانا، (3) روایتی اور فاصلاتی طریقۂ تعلیم کے ذریعے تعلیم فراہم کرنا، اور (4) خواتین کی تعلیم پر خصوصی توجہ دینا۔ یہ وہ نکات ہیں جو اس مرکزی جامعہ کو دیگر تمام مرکزی جامعات سے ممتاز کرتے ہیں اور اسے ایک انفرادیت بخشتے ہیں۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی مادری زبانوں اور علاقائی زبانوں میں تعلیم حاصل کرنے پر زور دیا گیا ہے۔

اردو کے ذریعے علم کے فروغ کا مقصد یہی ہے کہ اردو جاننے والے طبقے کے لیے عصری علوم اور مضامین تک رسائی آسان بنائی جائے۔ ایک طویل عرصے تک اردو میں درسی مواد کی کمی رہی ہے۔ اردو یونیورسٹی کے پاس اب اردو میں 350 سے زیادہ کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے اور ہر سمسٹر کے ساتھ اس تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔

اردو یونیورسٹی این ای پی 2020 کے وژن کے مطابق مادری / گھریلو زبان میں تعلیمی مواد فراہم کرنے کے قومی مشن کا حصہ بننے کو اپنے لیے ایک اعزاز سمجھتی ہے۔ مزید یہ کہ اردو بولنے والا طبقہ اردو میں مطالعے کے مواد کی عدم دستیابی کے سبب نئے اُبھرتے شعبوں اور جدید تر معلومات کے موجودہ میدانوں میں تازہ ترین معلومات و اطلاعات کے حصول سے محروم نہیں رہے گا۔ مذکورہ بالا میدانوں میں مواد کی دستیابی کی بدولت حصولِ معلومات کا نیا شعور بیدار ہوا ہے جو یقیناً اردو داں طبقے کی دانشورانہ ترقی پر اثر انداز ہو گا۔

فاصلاتی اور آن لائن طلبہ کے لیے تعلیم و تدریس کے عمل کو سہل بنانے کے لیے یونیورسٹی کا سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن (CDOE) اردو اور متعلقہ مضامین میں خود اکتسابی مواد (SLM) کی تیاری کو یقینی بناتا ہے۔

MANUU فاصلاتی اور آن لائن لرننگ کے طلبہ کے لیے SLM بلا معاوضہ فراہم کرتا ہے۔ یہ مواد اُردو کے ذریعے علم حاصل کرنے میں دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کے لیے برائے نام قیمت پر دستیاب ہے۔ تعلیم تک رسائی کے دائرے کو مزید پھیلانے کے مقصد سے، اردو / ہندی / انگریزی / عربی میں eSLM یونیورسٹی کی ویب سائٹ پر مفت ڈاؤن لوڈ کے لیے دستیاب رکھا گیا ہے۔

مجھے بے حد خوشی ہے کہ متعلقہ فیکلٹی کی محنت اور مصنفین کے مکمل تعاون کی بدولت FYUG بی۔اے، بی۔ایس سی اور بی۔کام کی کتابوں کی اشاعت کا عمل بڑے پیمانے پر شروع ہو گیا ہے۔ فاصلاتی اور آن لائن لرننگ کے طلبہ کی سہولت کے لیے خود اکتسابی مواد (SLM) کی تیاری اور اشاعت کا عمل یونیورسٹی کے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہم اپنے خود تعلیمی مواد کے ذریعے اردو جاننے والے ایک بڑے طبقے کی ضروریات کو پورا کرنے کے قابل ہوں گے اور اس یونیورسٹی کے مقصدِ قیام کو پورا کریں گے اور اپنے ملک میں اپنی موجودگی کو جائز ٹھہرا سکیں گے۔

نیک تمناؤں کے ساتھ!

پروفیسر سید عین الحسن
شیخ الجامعہ، مانو

پیغام

موجودہ دور میں فاصلاتی تعلیم کو دنیا بھر میں ایک نہایت مؤثر اور مفید طریقۂ تعلیم کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اور بڑی تعداد میں لوگ اس طریقۂ تعلیم سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے بھی اردو زبان بولنے والی عوام کی تعلیمی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے قیام کے وقت سے ہی فاصلاتی تعلیم کا طریقہ متعارف کرایا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے 1998 میں ڈائریکٹوریٹ آف ڈسٹنس ایجوکیشن (نظامتِ فاصلاتی تعلیم) کے ساتھ کام کا آغاز کیا اور 2004 سے باقاعدہ پروگرام شروع ہوئے، اس کے بعد مختلف شعبہ جات قائم کیے گئے۔

یو جی سی نے ملک میں نظام تعلیم کو مؤثر طور پر منظم کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ اوپن اینڈ ڈسٹنس لرننگ (ODL) موڈ کے تحت چلنے والے مختلف پروگرام، جو سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن (CDOE) میں چل رہے ہیں، یو جی سی-ڈی ای بی کے منظور شدہ ہیں۔ یو جی سی-ڈی ای بی نے فاصلاتی اور باقاعدہ تعلیم کے نصاب کو ہم آہنگ کرنے پر زور دیا ہے تاکہ فاصلاتی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کے معیار کو بہتر بنایا جاسکے۔ چونکہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ایک دُہرے طرز (ڈوئل موڈ) کی یونیورسٹی ہے جو فاصلاتی اور روایتی دونوں طریقۂ تعلیم کی خدمات فراہم کرتی ہے، اس لیے اپنے مقاصد کو یو جی سی-ڈی ای بی کے رہنما خطوط کے مطابق حاصل کرنے کے لیے اس نے چوائس بیسڈ کریڈٹ سسٹم (CBCS) متعارف کرایا جس کا خود اکتسابی مواد (Self Learning Materials) یو جی سی کے قوانین اور کریڈٹ فریم کے مطابق نئے سرے سے تیار کیا جاچکا ہے۔

سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن (CDOE) کل انیس (19) پروگرام پیش کرتا ہے جن میں یو جی، پی جی، بی ایڈ، ڈپلومہ اور سرٹیفکیٹ پروگرام شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تکنیکی مہارتوں پر مبنی پروگرام بھی شروع کیے جا رہے ہیں۔ سی ڈی او ای نے جولائی 2025 سے این ای پی-2020 کے مطابق چار سالہ یو جی پروگرام کا آغاز کیا ہے۔ بی اے، بی ایس سی اور بی کام کے آنرز پروگراموں کو این سی ایف کے مطابق ڈیزائن کیا گیا ہے جس سے طلبہ کو آنرز ڈگری حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔ سال 2026-2025 سے ایم بی اے پروگرام او ڈی ایل موڈ میں متعارف کرایا گیا ہے۔

مانو نے طلبہ کی سہولت کے لیے نو ریجنل سنٹرز (بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر) اور چھ سب ریجنل سنٹرز (حیدرآباد، لکھنؤ، جموں، نوح، وارانسی اور امراوتی) کا ایک وسیع نیٹ ورک قائم کیا ہے۔ اس کے علاوہ وجے واڑا میں ایک ایکسٹینشن سنٹر بھی قائم کیا گیا ہے۔ ان ریجنل اور سب ریجنل سنٹروں کے تحت ایک سو پچاس سے زیادہ لرنر سپورٹ سنٹر (LSCs) اور بیس پروگرام سنٹر بیک وقت چلائے جا رہے ہیں تاکہ طلبہ کو تعلیمی اور انتظامی سہولیات فراہم کی جاسکیں۔ سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا بھرپور استعمال کرتا ہے اور اپنے تمام پروگراموں میں صرف آن لائن موڈ کے ذریعے ہی داخلے فراہم کرتا ہے۔

طلبہ کے لیے سیلف لرننگ میٹیریل (SLM) کی سوفٹ کاپی سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن کی ویب سائٹ پر دستیاب کرائی جاتی ہیں اور آڈیو و ویڈیو ریکارڈنگ کے لنک بھی ویب سائٹ پر فراہم کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ طلبہ کو ای۔ میل اور واٹس ایپ گروپ کی سہولت بھی فراہم کی جارہی ہے جن کے ذریعے انہیں پروگرام کے مختلف پہلوؤں جیسے کورس رجسٹریشن، اسائنمنٹ، کاؤنسلنگ، امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔ باقاعدہ کاؤنسلنگ کے علاوہ گزشتہ دو برسوں سے طلبہ کے تعلیمی معیار کو بہتر بنانے کے لیے زائد تدارکی (Remedial) آن لائن کاؤنسلنگ بھی فراہم کی جارہی ہے۔

امید کی جاتی ہے کہ سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن تعلیمی اور معاشی طور پر پسماندہ آبادی کو عصری تعلیم کے دھارے میں شامل کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرے گا۔ تعلیمی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے نئی تعلیمی پالیسی (NEP-2020) کے مطابق مختلف پروگرامز میں تبدیلیاں کی گئی ہیں اور توقع ہے کہ اس سے اوپن اینڈ ڈسٹنس لرننگ کے نظام کو مزید مؤثر اور کارآمد بنانے میں مدد ملے گی۔

پروفیسر محمد رضا اللہ خان

ڈائرکٹر، سی ڈی او ای، مانو

کورس کا تعارف

پیارے طلباوطالبات،

ہندوستانی معاشی تاریخ (مغلیہ اور برطانوی دور) کے کورس میں خوش آمدید۔ اس مضمون کا انتخاب آپ کو ہندوستان کی معاشی ترقی کے دو اہم تاریخی ادوار کے بارے میں گہری سمجھ فراہم کرنے کے لیے ڈیزائن کیا گیا ہے۔ یہ 2 کریڈٹ کا کورس آپ کو مغلیہ سلطنت اور برطانوی نو آبادیاتی دور کے معاشی نظام، پالیسیوں، اور تبدیلیوں کو سمجھنے میں مدد دے گا۔ ان ادوار کا مطالعہ کرکے آپ ہندوستان کی معیشت کی تاریخی بنیادوں اور اس کے ارتقا پر اثر انداز ہونے والے عوامل کے بارے میں قیمتی معلومات حاصل کریں گے۔

یہ کورس دو بلاکس میں تقسیم کیا گیا ہے، ہر بلاک میں چار اکائیاں ہیں۔ پہلا بلاک مغلیہ ہندوستان پر مرکوز ہے، جس میں اس کے معاشی ڈھانچے اور طریقہ کار کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ آپ آبادی، ریاست، اور معیشت؛ زرعی پیداوار اور زرعی بحران؛ زمینی محصول کا نظام؛ صنعت اور فنکاری؛ اندرونی اور بیرونی تجارت؛ مالیاتی نظام؛ شہری کاری اور معیار زندگی؛ اور اورنگزیب کے بعد کے معاشی چیلنجوں جیسے موضوعات کا مطالعہ کریں گے۔ یہ بلاک مغلیہ معیشت کی خوش حالی اور پیچیدگیوں کو اجاگر کرتا ہے، جو قبل از نو آبادیاتی ہندوستان کو سمجھنے کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔

دوسرا بلاک برطانوی ہندوستان پر مرکوز ہے، جس میں نو آبادیاتی حکومت کے زیر اثر معاشی تبدیلیوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس بلاک میں نو آبادیاتی نظام کی طرف منتقلی، کلیدی رجحانات، آبادیاتی تبدیلیاں، تجارت، اور زراعت، صنعت وغیرہ میں ساختی تبدیلیوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ، مالیات، ریلوے، اور صنعتوں کے زوال اور دولت کے نکاس کے تباہ کن اثرات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ آپ برطانوی حکومت کی ضروریات اور ترجیحات کا بھی تجزیہ کریں گے، جنہوں نے ہندوستان میں معاشی پالیسیوں کو تشکیل دیا۔ یہ بلاک اس بات کی تنقیدی بصیرت فراہم کرتا ہے کہ کیسے نو آبادیاتی حکومت نے ہندوستان کی معیشت کو تبدیل کیا، جو اکثر اس کے لوگوں اور وسائل کے نقصان پر ہوا۔

یہ کورس دلچسپ اور فکر انگیز بنایا گیا ہے، جس میں ہر اکائی میں تفصیلی وضاحتیں اور سوالات شامل ہیں تاکہ آپ کی سمجھ کو بہتر بنایا جا سکے۔ میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ مواد کو غور سے پڑھیں، تاریخی تناظر پر غور کریں، اور دی گئی مشقوں میں حصہ لیں۔ اس کورس کے اختتام تک، آپ کو مغلیہ اور برطانوی ہندوستان کی معاشی تاریخ کی جامع سمجھ حاصل ہو جائے گی، جو آپ کو جدید ہندوستان کی تشکیل میں تاریخی قوتوں کی قدر کرنے کے قابل بنائے گی۔

میں آپ سب کے لیے اس معلوماتی سفر میں کامیابی کے لیے دعاگو ہوں۔ امید ہے کہ یہ کورس آپ کو تاریخ اور معاشیات کے درمیان دلچسپ تعلق کو دریافت کرنے کی ترغیب دے گا!

ڈاکٹر فضل الرحمان پی۔ کے۔

کورس کوآرڈی نیٹر، معاشیات

ہندوستانی معاشی تاریخ (مغلیہ اور برطانوی دور)

بلاک I: مغلیہ ہندوستان

اکائی 1: مغلیہ ہندوستان: ریاست، آبادی اور معیشت

(Mughal India: State, Population and Economy)

اکائی کے اجزا:

1.0 تمہید (Introduction)

1.1 مقاصد (Introduction)

1.2 مغل ریاست (Mughal State)

1.2.1 ریاست کی نوعیت

1.2.2 مغل ہندوستان کی آبادی (Population in Mughal India)

1.2.3 مغل دور میں آبادی میں اضافے کے اسباب (Reasons for Population Growth during the Mughal Era)

1.2.4 معیشت

1.3 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

1.4 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

1.4.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1.4.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1.4.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1.0 تمہید (Introduction)

مغل سلطنت (1526-1857) برصغیر پاک وہند کی ایک اہم سلطنت تھی، جو اپنی شاہی ساخت، فوجی طاقت اور ثقافتی کامیابیوں کے لیے مشہور تھی۔ مغلوں کا ہندوستانی معاشرے، ثقافت اور معیشت پر گہرا اثر تھا۔ مغل سلطنت 1526 میں قائم ہوئی، جب بابر نے پانی پت کی پہلی جنگ میں دہلی کے سلطان ابراہیم لودی کو شکست دی۔ بابر، جو تیمور لنگ اور چنگیز خان کی نسل سے تھے، نے ہندوستان میں مغلیہ

سلطنت کی بنیاد رکھی۔ مغلوں نے مرکزی حکومت کا نظام اپنایا، جس میں شہنشاہ کو اعلیٰ اختیارات حاصل تھے۔ شہنشاہ کے علاوہ اس کے مقرر کردہ کلیدار، صوبیدار اور فوج دار جیسے انتظامی افسران ریاست کے مختلف حصوں پر حکومت کرتے تھے۔ اکبر کے زمانے میں منصب داری نظام اور جاگیر داری نظام عمل میں آیا جس کا مقصد ریاست کے انتظامی ڈھانچے کو مضبوط کرنا تھا۔ مغل دور میں ہندوستان کی آبادی 15 کروڑ کے لگ بھگ سمجھی جاتی تھی۔ یہ تخمینہ اس وقت کی مردم شماری اور تاریخی ذرائع پر مبنی ہے۔ مغل سلطنت کے عروج پر، جیسا کہ اکبر کے دور حکومت (1556-1605) میں، آبادی کا ایک بڑا حصہ زراعت اور دستکاری میں ملازم تھا۔ مغلیہ سلطنت معاشی نقطہ نظر سے بہت خوش حال تھی۔ ان کی معیشت بنیادی طور پر زراعت پر مبنی تھی، جس میں گندم، چاول، دالیں جیسی اہم فصلیں اور دیگر کاروباری مصنوعات شامل تھیں۔ تجارت بھی ایک اہم معاشی سرگرمی تھی اور ہندوستان کو بیرونی تجارت سے بہت فائدہ ہوا، خاص طور پر سونا، چاندی، کپڑا (خاص طور پر مغلوں کے ریشم اور سوتی کپڑے) اور مسالوں کی تجارت میں۔ مغلوں کے زمانے میں زمینی ٹیکس (خراج) آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ تھا، جو کسانوں سے وصول کیا جاتا تھا۔ اکبر کے زمانے میں زمینی محصولات کی وصولی کا ایک نظام تیار کیا گیا جسے "زمینداری نظام" یا "دہ شالہ" نظام کہا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ، مغلوں نے بہت سے اہم تعمیراتی کام بھی انجام دیے، جیسے تاج محل، آگرہ قلعہ، بلند دروازہ اور لال قلعہ، جو ان کی معاشی خوش حالی اور تعمیراتی کمال کی عکاسی کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر مغل ریاست کی حکمرانی، آبادی اور معاشی حالات برصغیر پاک وہند کے تاریخی اور ثقافتی ورثے کے طور پر اہم ہیں۔ اس اکائی میں انہیں موضوعات پر تفصیل سے گفتگو کی جائے گی۔

1.1 مقاصد (Introduction)

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ مندرجہ ذیل نکات کو سمجھنے کے قابل ہو جائیں گے:

- مغل دور کی سلطنت کی نوعیت اور اس سے متعلق مختلف مورخین کے نظریات۔
- مغل دور میں آبادی کے بارے میں آپ اپنے علم میں اضافہ کر پائیں گے
- آبادی کے بڑھنے کے کیا اسباب تھے، اس کو سمجھ سکیں گے اور یہ بھی جان پائیں گے کہ مورخین کی اس موضوع پر کیا رائے ہے
- مغل دور کے معاشی حالات کا جائزہ لے سکیں گے۔

1.2 مغل ریاست (Mughal State)

مغل دور (1526-1857) ہندوستانی تاریخ کا ایک انتہائی اہم اور خوش حال دور تھا، جس میں مغل بادشاہوں نے برصغیر پاک وہند میں ایک مضبوط اور مرکزی انتظامی نظام کی بنیاد رکھی۔ مغل سلطنت نے نہ صرف ایک مرکزی اور منظم نظم ونسق قائم کیا بلکہ ثقافتی اور مذہبی لحاظ سے ایک خوش حال معاشرہ بھی تشکیل دیا۔ مغل حکمرانوں نے اپنے نظام حکومت کے ذریعے ریاست کی شکل کو منظم کیا اور اسے استحکام اور خوش حالی فراہم کی۔

مغلیہ سلطنت میں ریاست کا ڈھانچہ بنیادی طور پر مرکزی تھا۔ شہنشاہ کو ریاست کا اعلیٰ ترین حکمران سمجھا جاتا تھا، اور اس کی طاقت

سب سے زیادہ تھی۔ شہنشاہ کی حکمرانی ہر سطح پر موثر تھی، خواہ وہ زمینی محصول کی وصولی ہو، انصاف کا انتظام ہو یا فوجی آپریشن۔ شہنشاہ کے تحت مختلف عہدیداروں کا ایک وسیع نیٹ ورک تھا، جیسے دیوان، منصب دار اور صوبیدار، جو ریاست کے انتظامی کاموں کو سنبھالتے تھے۔ ان افسروں کا بنیادی کام ریاست کے اندرونی حالات کو مضبوط بنانا اور شاہی احکامات کو ہر سطح پر نافذ کرنا تھا۔

مغلیہ سلطنت کی عسکری تنظیم انتہائی مضبوط اور منظم تھی۔ شہنشاہ اکبر کے دور میں فوجی تنظیم میں اہم اصلاحات کی گئیں۔ فوج کا بنیادی مقصد ریاست کی سرحدوں کی حفاظت اور سلطنت کو اندرونی اور بیرونی خطرات سے بچانا تھا۔ مختلف ذاتوں اور طبقوں سے سپاہی بھرتی کیے گئے اور فوجی افسروں کا تقرر "منصب" کی بنیاد پر کیا گیا۔ عسکری تنظیم کو مزید موثر بنانے کے لیے اکبر نے شاہی دربار سے افسران کو منسلک کیا اور ان کی تعداد اور عہدوں کا تعین کیا۔

مغل ریاست میں عدالتی نظام ایک ٹھوس اور منظم نظام کے تحت چلتا تھا۔ شہنشاہ کو سپریم جج سمجھا جاتا تھا، اور اس کے حکم کی تعمیل کرنا لازمی تھا۔ اس کے باوجود شہنشاہ نے عدالتی امور کے لیے مختلف قاضیوں اور معاوین کو مقرر کیا تھا، جو مقامی سطح پر انصاف کا انتظام کرتے تھے۔ مغل دور میں، شریعت اور ہندو قانون دونوں پر عمل کیا گیا، اور مذہبی رواداری کو فروغ دیا گیا۔ شہنشاہ اکبر نے اپنے دور حکومت میں انصاف کی رسائی اور مساوی بنانے کے لیے بہت سی اصلاحات کی تھیں۔

1.2.1 ریاست کی نوعیت (Nature of State)

آر پی ترپاٹھی کے مطابق، مغل ریاست کی شکل مرکزیت پر مبنی تھی، جس میں شہنشاہ کی طاقت سب سے زیادہ تھی۔ شہنشاہ نہ صرف حکمران تھا بلکہ سپریم جج اور فوجی سربراہ بھی تھا۔ ترپاٹھی نے مغل انتظامیہ کو منظم اور موثر سمجھا، جس میں ریاست کو مختلف عہدیداروں اور منصب داروں کے ذریعے چلایا جاتا تھا۔ انہوں نے اکبر کی مذہبی رواداری کی پالیسی کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جس کی وجہ سے مختلف مذاہب اور ثقافتوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہوئی۔ مغل فوجی تنظیم کو بھی ترپاٹھی ریاست کے استحکام اور توسیع میں اہم سمجھتے تھے۔

عرفان حبیب کے مطابق مغل ریاست کی شکل مرکزی اور تجارتی تھی جس میں شہنشاہ کی طاقت سب سے زیادہ تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اکبر کے دور حکومت میں ریاست کا انتظامی ڈھانچہ مرکزیت پر مبنی تھا، اور اس نے ریاست کی بنیاد زراعت اور تجارت پر رکھی تھی۔ حبیب کے مطابق مغل بادشاہوں نے اپنی انتظامی اصلاحات اور شاہی سرپرستی سے ایک خوش حال اور مستحکم معاشرے کی بنیاد رکھی۔ ان کا یہ بھی ماننا تھا کہ مغل حکومت نے مذہبی رواداری کو فروغ دیا، خاص طور پر اکبر کے دور میں، جس کی وجہ سے مختلف برادریوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہوئی۔

اطہر علی کے مطابق مغل ریاست کی شکل فوجی اور سیاسی طاقت کی مرکزیت پر مبنی تھی۔ ان کا ماننا تھا کہ مغلیہ سلطنت میں شہنشاہ کا اقتدار اعلیٰ تھا اور ریاست کے زیادہ تر فیصلے فوجی اور انتظامی حکام کے زیر کنٹرول تھے۔ اطہر علی کے مطابق اکبر کے دور میں زمینی محصولات اور عسکری تنظیم کے نظام کو بڑی اہمیت دی گئی جو ریاست کے استحکام کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری تھا۔ ان کا یہ بھی ماننا تھا کہ مغل حکومت

سیاسی تنازعات اور سامراجی توسیع پر زیادہ مرکوز تھی۔

سر جادوو ناتھ سرکار کے مطابق، مغل ریاست کی شکل ایک مرکزی اور مضبوط انتظامیہ تھی، جس میں شہنشاہ کی طاقت سب سے زیادہ تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اکبر نے انتظامیہ کی اصلاح کی اور ایک خوش حال اور منظم نظام حکومت قائم کیا، جس میں انصاف، محصول اور فوج کو موثر طریقے سے سنبھالا جاتا تھا۔ ان کا یہ بھی ماننا تھا کہ اکبر نے اپنے دور حکومت میں تمام طبقات اور مذاہب کے درمیان ہم آہنگی برقرار رکھی، اس طرح ریاست کے استحکام اور امن کو برقرار رکھا۔ سر جادوو ناتھ سرکار کے مطابق مغلیہ سلطنت کا انتظامی ڈھانچہ شہنشاہ کی ذاتی کارکردگی پر مبنی تھا۔

ارون کے مطابق مغل ریاست کی شکل مرکزی اور طاقتور تھی جس میں شہنشاہ کی طاقت سب سے زیادہ تھی۔ ان کا خیال تھا کہ مغل بادشاہوں نے انتظامی نظام کو ہموار کیا، بنیادی طور پر زمین کی آمدنی اور فوجی ڈھانچے پر توجہ دی۔ ارون کے مطابق، اکبر نے مذہبی رواداری کی پالیسی اپنا کر ریاست کی خوش حالی اور استحکام کو یقینی بنایا، اور مختلف مذاہب کے درمیان ہم آہنگی کو برقرار رکھا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ مغل سلطنت کا استحکام شاہی طاقت اور انتظامی کارکردگی کی وجہ سے تھا۔

1.2.2 مغل ہندوستان کی آبادی (Population in Mughal India)

بابر کے زمانے میں ہندوستان کی آبادی کے بارے میں بہت کم معلومات دستیاب ہیں۔ بابر نے اپنی کتاب "بابر نامہ" میں ہندوستان کے مختلف خطوں کو بیان کیا ہے، لیکن آبادی کے بارے میں کوئی خاص اعداد و شمار نہیں بتائے ہیں۔ بابر اور اس کے جانشین ہمایوں کی حکمرانی ابتدائی طور پر کئی جنگوں اور اندرونی تنازعات سے متاثر ہوئی جس کا آبادی پر منفی اثر پڑا۔ اکبر کے دور حکومت میں انتظامی اصلاحات اور امن کی وجہ سے آبادی میں اضافہ دیکھنے میں آیا۔ اکبر نے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں سروے (کسانوں اور زمینداروں کی تعداد کے بارے میں معلومات) کروائے تھے۔ ان اعداد و شمار سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت ہندوستان کی آبادی تقریباً 15 کروڑ تھی۔ اکبر کے زمانے میں زراعت میں بہتری آئی، دریائی آبپاشی کا نظام بہتر ہوا اور تجارت کو فروغ ملا، جس کی وجہ سے معاشی سرگرمیاں بڑھیں اور آبادی میں اضافہ ہوا۔ جہانگیر اور شاہجہاں کے دور میں بھی ہندوستان کی آبادی بڑھتی رہی۔ ان شہنشاہوں کے دور میں امن کا ماحول تھا اور بہت سے علاقوں میں قانونی اصلاحات ہوئیں جس سے سماجی حالت میں بہتری آئی۔ شاہجہاں کے زمانے میں ہندوستان کی تخمینہ آبادی 18 سے 20 کروڑ کے درمیان تھی۔ شاہجہاں نے دارالحکومت دہلی میں بنیادی ڈھانچے کو فروغ دیا اور فن اور ثقافت کے میدان میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔ ان اصلاحات نے آبادی میں اضافے کو فروغ دیا۔ اورنگ زیب کے دورِ حکومت میں ہندوستان کے بعض علاقوں میں آبادی میں کمی دیکھی گئی۔ ایک طرف جہاں اس نے انتظامی ڈھانچے کو مضبوط کیا اور سلطنت کو وسعت دی، وہیں دوسری جانب اس کی سخت گیر پالیسیوں نے کئی علاقوں میں بدامنی اور تصادم کو جنم دیا۔ ان حالات کے نتیجے میں کچھ علاقوں کی آبادی پر منفی اثرات مرتب ہوئے۔ اس کے باوجود اورنگ زیب کے زمانے میں ہندوستان کی آبادی کا تخمینہ تقریباً 20 کروڑ تک پہنچ گیا تھا۔ 18ویں صدی کے اوائل میں مغل سلطنت کا زوال شروع ہوا۔ اس عرصے کے دوران برصغیر پاک و ہند کو کئی بیرونی حملوں اور اندرونی تنازعات کا سامنا کرنا پڑا جس کی وجہ سے آبادی میں کمی واقع

ہوئی۔ ان تنازعات اور وبائی امراض کا آبادی پر منفی اثر پڑا لیکن اس کے باوجود 18ویں صدی میں ہندوستان کی کل آبادی 20 کروڑ کے لگ بھگ رہی۔

1.2.3 مغل دور میں آبادی میں اضافے کے اسباب

(Reasons for Population Growth during the Mughal Era)

مغل دور میں آبادی میں اضافے کی بہت سی وجوہات تھیں جن کا تعلق سماجی، معاشی، سیاسی اور انتظامی اصلاحات سے تھا۔ مغلیہ سلطنت میں زراعت کو خاص اہمیت دی گئی تھی، کیونکہ زراعت ہندوستان کی معیشت کی بنیادی وجہ تھی۔ اکبر، شاہجہاں اور دیگر شہنشاہوں نے زرعی اصلاحات کے لیے بہت سے اقدامات کیے تھے۔ اکبر اور بعد میں دوسرے مغل شہنشاہوں نے دریاؤں سے بڑے آبپاشی کے نظام کو وسعت دی جس سے زرعی پیداوار میں اضافہ ہوا۔ نہروں اور آبی ذخائر کی تعمیر نے کاشتکاری کو مستحکم کیا اور اچھی فصل کے لیے پانی کی مناسب فراہمی کو یقینی بنایا۔ مغلوں نے نئے علاقوں میں کاشت کاری اور بنجر زمینوں کو زراعت کے لیے استعمال کرنے کی حوصلہ افزائی کی۔ اس کے نتیجے میں خوراک کی پیداوار میں اضافہ ہوا اور زیادہ زمین زراعت کے لیے استعمال ہوئی۔ مغل سلطنت کے دوران تجارت کو بھی فروغ دیا گیا، جس سے نہ صرف معاشی حالت بہتر ہوئی بلکہ آبادی کے اضافے میں بھی مدد ملی۔ اس کے چند اہم پہلو درج ذیل ہیں:

مغلوں نے سمندری اور زمینی راستوں کے ذریعے بیرونی ممالک کے ساتھ تجارتی روابط کو فروغ دیا۔ فارس، عرب، وسطی ایشیا اور یورپ کے ساتھ تجارت میں اضافہ ہوا، جس سے سرمائے کا بہاؤ بڑھا اور شہری کاری (Urbanization) کو تقویت ملی۔ ملک کے اندر تجارتی نیٹ ورک کو بھی وسعت دی گئی، اور زرعی مصنوعات، ٹیکسٹائل، مصالحہ جات، دھاتیں اور شیشے کے سامان کی تجارت عام ہوئی۔ یہ تمام عوامل نہ صرف معیشت کو مضبوط بنانے میں مددگار ثابت ہوئے بلکہ عوام کے معیارِ زندگی کو بہتر بنانے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔

مغل سلطنت کے بیشتر حصوں میں خاص طور پر اکبر اور شاہجہان کے دور میں امن و استحکام کا ماحول تھا۔ مغلوں کی مضبوط اور مرکزی انتظامیہ نے زیادہ تر علاقوں میں امن و امان برقرار رکھنے میں مدد کی، جس سے شہریوں کو ان کی زندگیوں میں استحکام اور تحفظ کا احساس ہوا۔ اس امن اور سلامتی نے تجارت، زراعت اور سماجی زندگی کی ترقی کے لیے موزوں ماحول فراہم کیا۔ مغلوں نے اپنی سلطنت کو وسعت دی اور نئے علاقے شامل کیے، نئے وسائل تک رسائی حاصل کی۔ نیز، مغلوں نے اختلافات اور تنازعات کو کم کیا، جس کی وجہ سے بڑی آبادی کی کفالت ممکن ہوئی۔

مغل بادشاہوں نے کئی انتظامی اور سماجی اصلاحات نافذ کیں، جن سے آبادی میں اضافے کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ اکبر نے اپنی پالیسی کے تحت مذہبی رواداری کو فروغ دیا، جس سے مختلف برادریوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہوئی۔ اس رواداری کے باعث عوام کو ذہنی سکون ملا، جس کا اثر خاندانوں کی وسعت اور آبادی کے بڑھتے ہوئے رجحان پر بھی پڑا۔ اکبر اور بعد کے شہنشاہوں نے مالیاتی نظام میں بھی اصلاحات کیں، خاص طور پر ٹیکس کے نظام میں بہتری لاتے ہوئے کسانوں پر بوجھ کم کیا۔ ان اقدامات سے زرعی پیداوار میں اضافہ ہوا اور کسانوں کو بہتر معاشی حالات میسر آئے، جس کے نتیجے میں ان میں زیادہ بچے پیدا کرنے کی سکت اور رجحان پیدا ہوا۔ یوں یہ انتظامی اور معاشی

اصلاحات آبادی میں اضافے کا ایک اہم سبب بنیں۔

مغل دور میں صحت کے شعبے میں بھی کچھ بہتری آئی، حالانکہ اس وقت کا طبی نظام آج کے معیار کے اعتبار سے بہت پسماندہ تھا۔ تاہم، کچھ اقدامات کیے گئے تھے: مغلوں نے صحت کی کچھ خدمات متعارف کروائیں، جیسے عوامی حمام اور ڈسپنسریاں، جو وبائی امراض پر قابو پانے میں مددگار ثابت ہوئیں۔ مغلوں کے دور حکومت میں فارسی اور عربی طبی طریقوں کو اپنایا گیا اور بعض بڑے شہروں میں ہسپتال قائم ہوئے۔ اس سے بیماریوں پر قابو پانے اور وبائی امراض کو روکنے میں مدد ملی جس کا آبادی میں اضافے پر مثبت اثر پڑا۔

اگر اس نتیجے کو وسیع تر انداز میں سمجھا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ مغل دور میں ہندوستان کی آبادی میں اضافے کے پیچھے متعدد پیچیدہ اور مختلف عوامل کارفرما تھے، جن کا تعلق معاشی، سماجی، سیاسی اور ثقافتی اصلاحات سے تھا۔ یہ ترقی صرف ایک یا دو وجوہات کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ مجموعی طور پر کئی پہلوؤں اور عوامل کا مشترکہ اثر تھا، جس نے آبادی میں نمایاں اضافہ ممکن بنایا۔

مغل دور میں ہندوستان کی آبادی کے بارے میں مختلف مؤرخین نے مختلف اندازے لگائے ہیں اور ان کے اندازوں میں اختلاف ہو سکتا ہے کیونکہ اس وقت آبادی کے اعداد و شمار درست طریقے سے درج نہیں کیے گئے تھے۔ تاہم بعض ممتاز مورخین کے مطابق مغل دور میں ہندوستان کی آبادی کا تخمینہ اس طرح لگایا گیا ہے: ای ایس مورلینڈ (E.S. Morland) ایک برطانوی مورخ اور انتظامی افسر تھا جس نے ہندوستانی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر اہم تحقیق کی، خاص طور پر مغل دور میں ہندوستان کی معاشی حالت، آبادی اور زرعی اصلاحات پر۔ 20ویں صدی کے ابتدائی سالوں میں اس کا کام بہت متاثر کن تھا، اور اس نے مغلوں کے دور حکومت میں ہندوستان کی ترقی کے عمل کو سمجھنے کے لیے بہت سے اہم نظریات متعارف کروائے تھے۔ مغل آبادی کے بارے میں مورلینڈ کے نتائج بنیادی طور پر زرعی اصلاحات، تجارتی خوش حالی، صحت کی بہتر خدمات اور سیاسی استحکام سے متعلق تھے۔ اس کے مطابق مغلوں کے دور حکومت میں آبادی کا تخمینہ 15 کروڑ (150 ملین) لگایا جا سکتا ہے اور مختلف اصلاحات کی وجہ سے یہ تعداد بتدریج بڑھتی رہی۔ اس کے نقطہ نظر سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغل حکومت نہ صرف سیاسی اور ثقافتی نقطہ نظر سے اہم تھی بلکہ معاشی اور سماجی استحکام کے نقطہ نظر سے بھی موثر تھی جس سے آبادی میں اضافہ ہوا۔

1.2.4 **معیشت** (Economy)

مغل دور میں ہندوستان کا معاشی نظام پیچیدہ اور متنوع تھا، جس میں زمینی محصول، ٹیکس، تجارت اور صنعت نے اہم کردار ادا کیا۔ مغل بادشاہوں نے ان چاروں اہم شعبوں میں اصلاحات کیں اور انہیں مؤثر طریقے سے نظم و نسق میں رکھا، جس کے نتیجے میں سلطنت کی مالی حالت اور انتظامی ڈھانچہ مضبوط ہوا۔ اس حصے میں ہم مغل دور کے محصول نظام، زمینی بندوبست، تجارت اور صنعت پر تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

.1 زراعت (Agriculture)

بابر اور ہمایوں کے دور میں ہندوستان کی معیشت اب بھی اپنی ابتدائی شکل میں تھی۔ بابر (30-1526) نے ہندوستان میں دہلی سلطنت کو شکست دے کر مغل سلطنت کی بنیاد رکھی، لیکن اس کی حکومت بہت مختصر تھی اور اس عرصے میں معاشی نظام میں زیادہ تبدیلی

نہیں آئی۔ بابر نے اپنی زیادہ تر توجہ فوجی مہمات اور تنازعات پر مرکوز کی، معاشی اصلاحات پر کوئی ٹھوس کوششیں نہیں کیں۔ تاہم، بابر نے کچھ علاقوں میں زمینی محصول کا نظام نافذ کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ زیادہ کارگر ثابت نہیں ہوا۔ ہمایوں کے دور میں بھی معیشت میں استحکام نہیں تھا۔ ہمایوں نے اپنے اقتدار کو دوبارہ قائم کرنے کے لیے کئی جنگیں لڑیں اور ان تنازعات کے معیشت پر منفی اثرات مرتب ہوئے۔ ہمایوں کے زمانے میں زراعت ریاست کی آمدنی کا بنیادی ذریعہ تھی، لیکن لینڈ ٹیکس کے نظام میں کوئی قابل ذکر اصلاحات نہیں کی گئیں۔ کاروباری سرگرمیاں اور صنعتیں بھی پہلے کی نسبت کمزور تھیں اور ان کی حالت بہتر بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔

مجموعی طور پر، بابر اور ہمایوں کے دور میں ہندوستانی معیشت میں کوئی قابل ذکر ترقی نہیں ہوئی، کیونکہ ان کی توجہ زیادہ تر فوجی اور انتظامی استحکام پر مرکوز تھی۔

اکبر کے دور حکومت (1556-1605) میں ہندوستان میں زمینی محصول کے نظام میں اہم اصلاحات کی گئیں، جن کا مقصد ریاست کے لیے مستحکم اور باقاعدہ محصول وصول کرنا تھا۔ اکبر نے ایک مستقل اور منظم زمینی محصول کا نظام نافذ کیا، جس سے نہ صرف ریاست کو زیادہ آمدنی ہوئی بلکہ کسانوں پر دباؤ بھی کم ہوا۔ یہ انتظام "دہسالہ نظام یا ضبطی" کے نظام کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اکبر نے سلطنت کے مختلف علاقوں میں زمین کا تفصیلی سروے کیا۔ زمین کی پیداوار، پیداواری صلاحیت اور معیار کا جائزہ لیا گیا۔ ہر زمین کی درجہ بندی اس کی پیداواری صلاحیت کی بنیاد پر کی گئی۔ اس سروے کے نتیجے میں کسانوں سے وصول کی جانے والی آمدنی کا تعین ایک یقینی اور شفاف طریقے سے کیا گیا۔

مغل دور کی معیشت بنیادی طور پر زراعت پر منحصر تھی۔ ہندوستانی سماج کا بڑا حصہ زراعت سے وابستہ تھا اور ریاست کی آمدنی کا زیادہ تر حصہ بھی زراعت سے حاصل ہوتا تھا۔ زیادہ تر زمین زرعی کاموں کے لیے استعمال ہوتی تھی اور اس کی اہم پیداوار اناج جیسے گندم، چاول، جو اور کپاس تھی۔ مغل بادشاہ اکبر کے زمانے میں زمینی محصول کا نظام (زمینداری نظام) بہتر ہوا تھا۔ اکبر نے "دہسالہ" یا ضبطی کا نظام نافذ کیا، جس میں زمین کی پیداوار کو سرکاری طور پر ماپا اور اندازہ کیا جاتا تھا۔ اس نظام کے ذریعے ریاست کو باقاعدہ ٹیکس ملتا تھا جس سے انتظامیہ کو آسانی سے چلانے میں مدد ملتی تھی۔ اکبر کے دور میں، زمینی محصول کا نظام، جسے ضبطی نظام (یا دہسالہ) کہا جاتا ہے، 10 سال کی مدت (1570-80) کے دوران فصلوں کی پیداوار اور قیمتوں کی بنیاد پر زمین کا اندازہ لگانا شامل تھا، اور اسے اس کے وزیر خزانہ راجہ ٹوڈر مل نے نافذ کیا۔

دہسالہ نظام کے تحت ہر سال زرعی پیداوار کا اندازہ لگایا جاتا تھا اور اس کی بنیاد پر محصولات کی شرح کا تعین کیا جاتا تھا۔ یہ شرح عام طور پر پیداوار کی ایک مقررہ فیصد تھی، عام طور پر ایک تہائی (1/3)، لیکن مخصوص علاقوں میں قدرے زیادہ یا کم ہو سکتی ہے۔ اس نظام میں خاص طور پر اکبر کے زمانے میں محصولات کی وصولی میں کوئی ناانصافی یا ضرورت سے زیادہ ٹیکس نہیں تھا۔

2. **تجارت** (Trade)

مغلیہ دورِ حکومت میں تجارت نے ہندوستانی معیشت کو نمایاں طور پر متاثر کیا۔ مغل حکمرانوں نے تجارت کی حوصلہ افزائی کے لیے بہت سی اصلاحات اور اقدامات متعارف کروائے، جس کے نتیجے میں ہندوستان کی تجارت پوری دنیا میں پھیل گئی۔ اس دور میں ہندوستانی

تاجروں نے نہ صرف اندرونی تجارت کی بلکہ بیرونی ممالک سے بھی تجارت کی۔ مغل دور میں تجارت کی توسیع بنیادی طور پر زمینی، سمندری راستے، ٹیکس نظام اور تجارتی پالیسیوں سے تھی۔

مغل دور میں ہندوستان میں اندرونی تجارت کا مضبوط نیٹ ورک تھا۔ کپڑا، مصالحے، اناج، پھل، چائے، چاول اور دیگر زرعی مصنوعات کی تجارت ہندوستان کے مختلف حصوں میں ہوتی تھی۔ تاجروں کے لیے بڑے بازار (ہاٹ) اور تجارتی مراکز تیار کیے گئے، جن میں بڑی تعداد دہلی، لاہور، احمد آباد، مراد آباد اور بنگال ہیں۔ ان بازاروں میں مختلف اشیا کا تبادلہ ہوتا تھا اور تاجر ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں سامان بھیجتے تھے۔

ہندوستان کی اندرونی تجارت کو آسان بنانے کے لیے سڑکوں اور دریاؤں کے ذریعے آمدورفت کے لیے تجارتی راستے قائم کیے گئے۔ تاجر اہم تجارتی راستوں پر اندرونی سامان کی تجارت کرتے تھے۔ دہلی اور احمد آباد جیسے شہر بڑے تجارتی مراکز بن گئے۔

مغل دور میں بیرونی تجارت کو بھی ایک اہم مقام حاصل تھا۔ ہندوستان خاص طور پر مسالوں، ریشم، چائے، کپڑوں اور سونے اور چاندی کے لیے مشہور تھا۔ اس عرصے کے دوران یورپی ممالک جیسے پرتگال، ڈچ، فرانس اور برطانیہ سے تاجر تجارت کے لیے ہندوستان آئے۔ مغلیہ سلطنت میں سمندری اور زمینی راستوں سے بیرونی تجارت کو فروغ دیا گیا۔

مغل دور میں، بنگال میں چٹگام، مچلی پٹنم، اور ہوگلی جیسی بندر گاہیں ہندوستان کے مغربی ساحل پر تیار ہوئیں۔ یورپی تاجر ان بندر گاہوں کے ذریعے ہندوستان کے ساتھ تجارت کرتے تھے۔ مغل بادشاہ اکبر اور شاہجہان کے دور میں ان بندر گاہوں پر تجارتی سرگرمیوں کو فروغ ملا۔ سورت خاص طور پر یورپی تاجروں کے لیے ایک بڑے تجارتی مرکز کے طور پر قائم کیا گیا تھا۔

ہندوستان سے برآمد ہونے والی اہم اشیاء یہ تھیں:

ٹیکسٹائل: ہندوستانی کپاس اور ریشم کے کپڑے (خاص طور پر وہ جو مغل دور میں تیار ہوئے) کی غیر ملکی منڈیوں میں بڑی جگہ تھی۔

مصالحہ جات: ہندوستان مصالحے، خاص طور پر ادرک، ہلدی، الائچی، دار چینی اور مرچ کا ایک بڑا پیداکار تھا۔

چائے اور ریشم: چائے اور ریشم بھی ہندوستان سے برآمد کیا جاتا تھا۔

زیورات: سونے اور چاندی کے زیورات کی ہندوستان میں بہت مانگ تھی اور اسے درآمد کیا جاتا تھا۔

مغلیہ دور میں تجارت کی سہولت کے لیے کرنسی کا مضبوط نظام موجود تھا۔ اکبر کے زمانے میں "اکبری روپیہ" کا بڑے پیمانے پر استعمال ہوا، جو تجارت لیے ایک مستحکم کرنسی تھی۔ اس کے علاوہ چاندی اور تانبے کی کرنسیوں جیسی دوسری کرنسیاں بھی رائج تھیں جو تجارتی لین دین میں استعمال ہوتی تھیں۔

مغل دور میں ہندوستانی تاجر نہ صرف اندرونی تجارت میں سرگرم تھے بلکہ بیرونی تجارت میں بھی حصہ لیتے تھے۔ اس وقت ہندوستان کے مختلف ممالک خاص طور پر وسطی ایشیا، یورپ اور جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک کے ساتھ تجارتی تعلقات تھے۔ ہندوستانی

مسالوں، کپڑوں، ریشم، چائے اور زیورات کی بہت مانگ تھی، جس کی وجہ سے ہندوستانی تاجروں کا غیر ملکی بازار میں بھی اچھا کاروبار تھا۔

3. صنعتیں (Industries)

مغل دور ہندوستانی تاریخ کا ایک اہم اور خوش حال دور تھا، جس میں نہ صرف فن اور ثقافت کو فروغ ملا بلکہ صنعتوں اور دستکاری کی بے مثال ترقی بھی ہوئی۔ مغل بادشاہوں نے اپنے دور حکومت میں مختلف صنعتوں کی حوصلہ افزائی کی جن میں ٹیکسٹائل کی صنعت، دھات کی صنعت، کاغذ کی صنعت اور دیگر کاریگری نمایاں تھیں۔ فن کی طرف مغل حکمرانوں کی دلچسپی اور سرپرستی نے ہندوستانی صنعتوں کو ایک نئی جہت دی۔

کپڑے کی صنعت: مغل دور میں ٹیکسٹائل کی صنعت میں بہت ترقی ہوئی۔ ہندوستان میں مختلف قسم کے کپڑے بنائے جاتے تھے جن میں بنیادی طور پر ریشم، سوتی اور اونی کپڑے شامل تھے۔ بنارس، احمد آباد اور دہلی جیسے شہروں میں اعلیٰ معیار کے کپڑے بنائے جاتے تھے۔ بنارسی ساڑیاں، کشمیری شال، اور ڈولا (ریشم) کے کپڑے مغل دور میں کافی مشہور تھے۔ یہ کپڑے یورپ، وسطی ایشیا اور دیگر ممالک کو بڑے پیمانے پر برآمد کیے جاتے تھے۔ مغل دور میں، کاریگروں اور بنکروں کی اچھی شہرت تھی، اور انہیں شاہی سرپرستی حاصل تھی، جس سے ان کے کام کی مہارت میں مزید اضافہ ہوا۔

دھات کی صنعت: مغل دور میں دھات کی صنعت نے بھی ترقی کی۔ اشیا خاص طور پر تانبے، پیتل، چاندی اور لوہے کی بنی تھیں۔ مرادآباد اور بنارس جیسی جگہوں پر دھاتی دستکاری اور کاسٹنگ کا کام ہوا اور ان علاقوں کی دھاتی مصنوعات غیر ممالک میں بھی مشہور تھیں۔ مغل دور میں تانبے کی دستکاری، کانسے کی چیزیں اور چاندی کے برتن ہندوستانی کاریگروں نے بنائے تھے، جو پوری دنیا میں مشہور تھے۔ مغل بادشاہوں نے ان کاریگروں کی سرپرستی کی اور ان کے کام کو سراہا جس سے دھات کی صنعت کو مزید فروغ ملا۔

مغل دور میں کاغذ اور مصوری کی صنعتوں کو بھی ایک اہم مقام حاصل تھا۔ اکبر کے دور حکومت میں کاغذ بنانے کا کام بھی بڑھ گیا اور ہندوستان میں کاغذ کی پیداوار میں اضافہ ہوا۔ مغل دربار میں مصوری اور تام چینی کو بہت اہمیت حاصل تھی اور یہ فن ہندوستانی اور اسلامی اثرات کا امتزاج تھا۔ شہنشاہوں نے مصوروں اور کاغذ سازوں کی سرپرستی کی، جس نے ہندوستانی مصوری اور کاغذ کی صنعت کو ایک نئی سمت دی۔

تعمیراتی صنعت: مغل دور میں فن تعمیر اور تعمیراتی صنعت نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ اس دور میں ہندوستان میں بہت سی عظیم الشان اور منفرد عمارتیں تعمیر کی گئیں جن میں تاج محل، قطب مینار، لال قلعہ اور فتح پور سیکری جیسی عمارتیں شامل ہیں۔ ان عمارتوں کی تعمیر میں کاریگری، فن تعمیر اور تعمیراتی طریقوں کو بہت زیادہ ترقی دی گئی۔ اس کے علاوہ مساجد، محلات اور باغات کو سجانے کے لیے مختلف قسم کے پتھر اور پچی کاری کا استعمال کیا جاتا تھا، جو اس وقت کی تعمیراتی صنعت کی ایک منفرد مثال تھی۔

مغلیہ دور میں زرعی صنعت کی بھی اہمیت تھی۔ کسان زرعی آلات استعمال کرتے تھے، جو لوہے اور تانبے کی دستکاریوں سے بنائے جاتے تھے۔ زراعت کو فروغ دینے کے لیے مغل بادشاہوں نے زرعی آلات کی پیداوار اور فراہمی کو بہتر بنایا۔

1.3 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

- مغل سلطنت ایک مضبوط اور منظم مرکزی نظام حکومت پر قائم تھی، جہاں تمام اختیارات شہنشاہ کے پاس ہوتے تھے۔
- سلطنت کو مختلف صوبوں میں تقسیم کیا گیا تھا، جہاں صوبہ داروں کے ذریعے مؤثر حکمرانی کی جاتی تھی۔
- مغل سلطنت ایک متنوع معاشرہ تھا جس میں مختلف مذاہب، ذاتوں اور ثقافتوں کے لوگ شامل تھے۔
- اکبر نے زمینی محصول کے نظام میں اصلاحات کیں، جس سے ٹیکس کا نظام شفاف اور منصفانہ بنا اور معیشت مستحکم ہوئی۔
- اصلاحات سے کسانوں اور ریاست کے تعلقات بہتر ہوئے، اور زرعی شعبے کو فروغ ملا۔
- ٹیکسٹائل، دستکاری اور دھات سازی سمیت مختلف صنعتیں ترقی پزیر ہوئیں، اور برآمدات میں اضافہ ہوا۔
- تجارتی راستوں، صنعتوں اور زراعت پر لگائے گئے ٹیکسوں سے سلطنت کو مستحکم آمدنی حاصل ہوئی۔
- مغل دور کا معاشی اور انتظامی نظام بعد کے حکمرانوں کے لیے بھی ایک مضبوط بنیاد ثابت ہوا۔

1.4 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

1.4.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. دہسالہ نظام کو کس مغل بادشاہ نے شروع کیا تھا؟

(a) اکبر (b) بابر

(c) جہانگیر (d) شاہ جہاں

2. مغل دور کی دو بندرگاہوں کا نام بتائیں؟

3. مغل دور میں برآمد ہونے والی دو اشیا کا نام لکھیں۔

4. مورلینڈ کے مطابق اکبر کے دور میں مغل آبادی کتنی تھی؟

(a) 150 million (b) 100 million

(c) 120 million (d) 90 million

5. مغل دور میں آبادی بڑھنے کے دو اسباب کا ذکر کریں۔

6. اکبر نامہ کس کی تصنیف ہے؟

(a) ابوالفضل (b) نظام الدین

(c) بدایونی (d) اکبر

7. مغل دور کی دو صنعتوں کا نام لکھیں۔

8. عام طور پر مغل دور میں زرعی محصول کتنا تھا؟

(a) 1/3 (b) 1/2

(c) 1/4 (d) 1/6

9. آئین اکبری کے مصنف کا نام بتائیں؟

(a) ابوالفضل (b) نظام الدین

(c) بدایونی (d) اکبر

10. مغل دور میں ڈولا کس کپڑے کو کہا جاتا تھا؟

(a) ریشم (b) سوتی

(c) اونی (d) کشمیری شال

جوابات	1	2	3	4	5	6	7	8	9	10
	a			a		a		a	a	a

1.4.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. مغل دور کی ریاست پر ایک نوٹ تحریر کریں۔
2. مغل دور میں آبادی کو لے کر مورخین کی رائے کا اظہار کریں۔
3. مغل دور میں زرعی نظام پر ایک مضمون لکھیں۔
4. مغل دور میں تجارتی سرگرمیوں پر بحث کریں
5. مغل دور میں صنعتی نظام کا تنقیدی جائزہ لیں۔

1.4.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. مغل سلطنت کی نوعیت پر تفصیلی نوٹ لکھیں۔
2. مغل دور کی آبادی پر تفصیل سے بحث کریں۔
3. مغل دور کے معاشی حالات کا جائزہ لیں۔

اکائی 2: مغل ہندوستان میں مالگزاری نظام، زرعی پیداوار اور زرعی بحران

(Land Revenue System, Agricultural Production and Agrarian Crisis in Mughal India)

اکائی کے اجزا:

2.0 تمہید (Introduction)

2.1 مقاصد (Objectives)

2.2 مالگزاری کی تخمینہ کاری کے طریقے
(Methods for the Assessment of Land Revenue)

2.3 زرعی پیداوار (Agricultural Production)

2.3.1 پیداواری صلاحیت اور پیداوار (Productivity and Production)

2.4 آبپاشی اور زرعی تکنیک (Irrigation and Agricultural Technology)

2.4.1 کاشتکاری کے ذرائع اور طریقہ کار (Means and Methods of Cultivation)

2.4.2 آبپاشی کے ذرائع (Sources of Irrigation)

2.5 زرعی بحران (Agrarian Crisis)

2.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

2.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

2.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

2.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

2.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

2.0 تمہید (Introduction)

مغل سلطنت، جس کی بنیاد بابر نے 1526ء میں پانی پت کی پہلی جنگ کے بعد رکھی، جنوبی ایشیا کی تاریخ میں سب سے طاقتور اور پائیدار سلطنتوں میں سے ایک کے طور پر ابھری۔ وسیع علاقوں پر محیط اس سلطنت کا انتظامی ڈھانچہ بڑی حد تک ایک مؤثر مالگزاری نظام اور

زرخیز زرعی معیشت پر منحصر تھا۔ اپنے عروج کے دور میں خاص طور پر اکبر (1556-1605)، جہانگیر (1605-1627) اور شاہ جہاں (1628-1658) کے دور میں، سلطنت کا استحکام براہ راست مالگزاری اور زرعی پیداوار سے جڑا ہوا تھا۔ سولہویں صدی کے آخر میں تیار کی گئی ابوالفضل کی تصنیف آئین اکبری کے مطابق، تقریباً 80 سے 90 فیصد حکومت کی آمدنی، زرعی محصولات سے حاصل ہوتی تھی، جو اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ زرعی وسائل سلطنت کی مرکزی بنیاد تھے۔ مغل ہندوستان میں زراعت متنوع اور علاقائی اعتبار سے مختلف تھی، جس میں گندم، چاول، جو اور باجرے جیسے اناج کے ساتھ ساتھ کپاس، نیل، گنے اور مصالحے جیسی تجارتی فصلیں بھی شامل تھیں۔ آبپاشی زیادہ تر روایتی نظاموں جیسے کنوؤں، تالابوں اور نہروں پر منحصر تھی۔ جدید تکنیکوں کی عدم موجودگی کے باوجود کسان پیداواری سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے لاکھوں لوگوں کی غذائی ضروریات پوری کرتے رہے۔ عرفان حبیب لکھتے ہیں، "زرعی ڈھانچہ، مغل انتظامیہ کا اعصابی مرکز تھا، زمینی محصولات کی مؤثر وصولی نے سلطنت کی اقتصادی قسمت کو شکل دی۔" ریاست کا زرعی پیداوار پر انحصار مالگزاری کے پیچیدہ پیمائش اور تخمینے کے نظام کے ارتقا کا سبب بنا۔ خاص طور پر اکبر کے وزیر مالیات، راجہ ٹوڈر مل نے محصولات کو منظم کرنے اور یکسانیت پیدا کرنے کے لیے بھرپور کوششیں کیں۔ تاہم، یہ نظام اپنی ترقی کے باوجود کسانوں پر شدید دباؤ ڈالتا تھا۔ سترہویں صدی کے آخر تک، اورنگزیب (1658-1707) کے دور تک آتے آتے سلطنت کی طویل جنگوں، توسیع اور انتظامی عملے میں اضافے نے محصول کی طلب کو بڑھا دیا۔ محصول کی طلب میں زمینداروں کے بڑھتے ہوئے کردار سے صورت حال مزید بگڑتی گئی، جو اکثر کسانوں کا استحصال کرتے تھے۔ ستیش چندا لکھتے ہیں، "زرعی بحران، سلطنت کے قلعے میں ایک بڑی دراڑ بن گیا اور اس نے نہ صرف پیداوار کو کم کیا بلکہ دیہی سماج کو بھی ریاست سے دور کر دیا۔" قدرتی آفات جیسے قحط، سیلاب اور ٹڈیوں نے بحران کو مزید گہرا کر دیا، جب کہ مسلسل بغاوتوں اور جنگوں نے بازاروں تک رسائی اور آبپاشی کے وسائل کو بھی متاثر کیا۔ اٹھارہویں صدی کے اوائل میں، محصول کا بڑھا ہوا بوجھ، ماحولیاتی کمزوریاں، اور انتظامی بدعنوانی مل کر ایک وسیع زرعی بحران کا سبب بن گئیں۔ کسان قرض میں ڈوبتے، زمینیں کھوتے اور بے گھر ہوتے گئے، جس سے دیہی بغاوتیں پیدا ہوئیں اور مغل حکومت کی گرفت کمزور ہوئی۔ زرعی بحران صرف ایک اقتصادی مسئلہ نہیں تھا بلکہ اس کے گہرے سماجی اور سیاسی اثرات بھی مرتب ہوئے، جنہوں نے سلطنت کے زوال کو تیز کر دیا۔ یہ اکائی مغل ہندوستان میں مالگزاری نظام، زرعی پیداوار اور زرعی بحران کے باہمی تعلقات کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔ انتظامی اصلاحات، محصول کے طریقے، فصلوں کے رجحانات اور تاریخی شواہد کا جائزہ لیتے ہوئے ہم اس بات کو سمجھیں گے کہ مغل حکومت کی خوش حالی کس طرح زرعی بنیاد پر قائم تھی اور اس نظام میں موجود کمزوریاں کس طرح اس کے زوال کا سبب بنیں۔

2.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- مغلوں کے مالگزاری نظام سے متعارف ہوں گے۔
- مالگزاری کی تخمینہ کاری کے طریقوں کو سمجھ پائیں گے۔

- زرعی محصولات کی شرح اور مقدار کا اندازہ کرپائیں گے۔
- مختلف قسم کی فصلوں اور زرعی پیداوار کو جان سکیں گے۔
- آخری مغل دور میں زرعی بحران کے بارے میں جان سکیں گے۔

2.2 مالگزاری کی تخمینہ کاری کے طریقے (Methods for the Assessment of Land Revenue)

ہندوستان میں برطانوی حکومت کے ابتدائی حکمرانوں نے زرعی محصولات کو زمین کے کرائے (Rent of the Soil) کے طور پر دیکھا کیونکہ ان کے خیال سے بادشاہ یا حکمراں ہی تمام زمینوں کا مالک ہوتا تھا۔ لیکن ان کے اس نظریے کی بعد کی تحقیق اور مطالعے سے تردید ہوگئی اور یہ واضح ہوگیا کہ مغلوں کے ذریعے نافذ العمل زرعی محصول، زمین پر نہیں بلکہ فصلوں کی پیداوار پر تھا۔ لہٰذا یہ زمین کے کرائے سے مختلف تھا۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں اس سلسلے میں یہ جواز پیش کیا ہے کہ محصولات کا نفاذ، دراصل انصاف اور تحفظ فراہم کرنے کی اجرت یا معاوضہ ہے۔ زرعی محصولات کے لیے مغلیہ حکومت میں فارسی اصطلاح "مالِ واجب" یا "مال" کا استعمال کیا گیا ہے۔ "خراج" کی اصطلاح بھی بعض بعض ماخذ میں نظر آجاتی ہے۔ تاہم یہ اصطلاح عمومی طور پر مستعمل نہیں تھی۔ زرعی محصولات کی وصولیابی کا عمل دو مرحلوں میں منقسم تھا؛ تشخیص یا جمع (Assessment) اور حاصل (Actual Collection)۔

تشخیص کے تحت حکومت کے مطالبے کا تعین کیا جاتا تھا اور اسی تشخیص کی بنیاد پر محصول کی حقیقی وصولیابی خریف اور ربیع کی فصلوں کے لیے الگ الگ کی جاتی تھی۔

تشخیص یا جمع

مغلیہ سلطنت میں 'تشخیص' یا 'جمع' سے مراد زمین سے وصول کی جانے والی آمدنی یا لگائے گئے محصول کا وہ تخمینہ تھا جو سرکاری طور پر طے کیا جاتا تھا۔ یہ ایک طرح کی متوقع رقم تھی جو کھیت کی پیداوار اور زمین کی زرخیزی کو دیکھتے ہوئے سرکاری اہلکار، کسان یا زمیندار پر عائد کرتے تھے۔ یعنی یہ وہ مقدار تھی جو حسابی طور پر وصول کی جانی چاہیے تھی۔

حاصل

'حاصل' سے مراد وہ حقیقی رقم یا پیداوار ہے جو کسانوں یا زمین داروں سے حقیقت میں وصول کی جاتی تھی۔ اکثر اوقات تشخیص شدہ رقم اور اصل وصولی میں فرق ہوتا تھا، کیونکہ کبھی کسان پوری رقم ادا نہیں کرپاتے تھے یا بدانتظامی اور بدعنوانی کے باعث حکومت تک مکمل محصول نہیں پہنچ پاتا تھا۔

ہندوستان میں کھیتی یا زراعت کی موسمی تقسیم کے پیش نظر خریف اور ربیع کی فصلوں کی تخمینہ کاری یا تشخیص کا عمل الگ الگ کیا جاتا تھا۔ جب تخمینہ کاری کا عمل پورا ہو جاتا تھا تب حکومت کی جانب سے ایک دستاویز جاری کیا جاتا تھا۔ جسے 'پٹہ'، 'قول' یا 'قول و قرار' کہا جاتا تھا۔ جس میں محصول کی شرح اور مقدار درج ہوتی تھی۔ اس کے جواب میں پٹہ حاصل کرنے والے کو قبولیت نامہ تحریر کرنا ہوتا تھا جس میں طے شدہ شرائط کے علاوہ یہ درج ہوتا تھا کہ وہ کب اور کیسے محصول ادا کرے گا۔ مغل ہندوستان میں تشخیص یا تخمینہ کاری کے کئی طریقے رائج

تھے ان میں سے عام طور پر رائج کچھ طریقوں کا ذکر ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

1. غلہ بخشی (Crop Sharing)

اسے ہندی اور دیگر علاقائی زبانوں میں "بٹائی" یا "بھاولی" بھی کہا جاتا تھا۔ ابوالفضل نے آئین میں غلہ بخشی کے تین طریقے درج کئے ہیں۔

کھیت بٹائی: اس طریقے میں کھیت کو الگ الگ حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ ایک حصہ حکومت کے لیے اور دوسرا کسان کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔ پیداوار کے بعد دونوں حصوں کا غلہ الگ کر کے بانٹ لیا جاتا تھا۔

بھاگ بندی: اس طریقے میں پیداوار کو برابر یا طے شدہ حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر آدھا کسان کا اور آدھا حکومت کا، یا پھر ایک تہائی حکومت اور دو تہائی کسان کے حساب سے بانٹ لیا جاتا تھا۔ یہ طریقہ نسبتاً آسان تھا اور کسان کو فصل کا بقیہ حصہ فوراً مل جاتا تھا۔

لانگ بٹائی: اس طریقے میں کھیت میں کھڑی فصل کا اندازہ لگایا جاتا تھا، یعنی بیج، زمین کی حالت اور پیداوار کی صلاحیت کے حساب سے یہ طے کیا جاتا کہ کتنی پیداوار ہوگی اور اس میں سے حکومت کا حصہ کتنا بنے گا۔ اس تخمینے کی بنیاد پر کسان سے حکومت کا حصہ وصول کیا جاتا تھا۔ اس میں کبھی اناج کی صورت میں اور کبھی نقد رقم میں محصول وصول کیا جاتا تھا۔

غلہ بخشی کا طریقہ عرفان حبیب کے مطابق "اصل میں تشخیص کا طریقہ نہیں بلکہ محصول حاصل کرنے کا طریقہ ہے۔" تاہم دفتری دستاویز "نگارنامۂ منشی" کے مطابق غلہ بخشی زرعی محصولات کی جانچ اور حصولیابی کا سب سے بہتر طریقہ تھا۔ کیونکہ اس میں کاشت کار اور ریاست (حکومت) دونوں موسمی اتار چڑھاؤ کا جوکھم برابر اٹھاتے تھے۔ نگارنامۂ منشی اور "احکام عالمگیری" کے مطابق حکومت کے نقطۂ نظر سے بھی یہ کسی مخصوص گاؤں کی پیداواری صلاحیت کی پڑتال کے لیے مناسب طریقہ تھا۔ "فرہنگ کاردانی" کے مطابق یہ طریقہ اس وقت فائدہ مند ہوجاتا تھا جب بازاروں میں اناج کی قیمت بڑھ جاتی تھی۔ ابوالفضل کے مطابق ریاستی نقطہ نظر سے یہ طریقہ بہت مہنگا تھا۔ کیونکہ اس میں بڑی تعداد میں مستعد اور چوکنے نگہبانوں کی ضرورت پڑتی تھی ورنہ اس میں بے ایمان اور غیر دیانتدار اہلکاروں کے ذریعے وصولیابی میں بدعنوانی کے امکانات بڑھ جاتے تھے۔ لہذا "آداب عالمگیری" کے مطابق جب اورنگ زیب نے اس طریقے کو دکن میں لاگو کیا تو محصولات کی وصولیابی کا خرچ، چاق و چوبند نگہبانی کے وسیع انتظام کے سبب دوگنا ہوگیا۔

2. ہست و بود (Hast-o-Bud)

یہ زرعی محصولات کی تشخیص کے طریقوں میں سب سے سہل اور مختصر طریقہ تھا۔ اس کے تحت سرکاری عامل یا امین گاؤں کا معائنہ کر کے اچھی اور بری زمین کے رقبوں کا اندازہ کر کے کل پیداوار کا تخمینہ لگاتے تھے اور اس کی بنیاد پر محصولات کا تعین کرتے تھے۔ اسی طرح ایک اور بہت ہی آسان اور سرسری طریقہ یہ تھا کہ ہلوں کی تعداد کا شمار کر کے علاقے میں رائج شرح کے مطابق محصولات کا تعین کیا جاتا تھا۔ ان دونوں طریقوں کی کمیاں صاف نظر آتی ہیں۔ پہلے طریقے میں ہر چیز تشخیص کار کی ایمانداری اور تجربے پر منحصر ہوتی تھی۔ اور دوسرے میں مطالبات محصول کی عدم یکسانیت نظر آتی ہے۔

3. کنکوت/دانہ بندی (Kankut)

ہست و بود طریقۂ تشخیص کی کمیوں کو کچھ حد تک ایک نئے طریقے "کنکوت" کے نفاذ سے دور کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس طریقے کو "دانہ بندی" بھی کہا گیا ہے۔ ابوالفضل اور دیگر عصری تحریروں کے مطابق "کنکوت" دو لفظوں "کن" اور "کوت" کا مرکب ہے۔ "کن" کے معنی "اناج" اور "کوت" کا مطلب "پیائش" ہے۔ اسی طرح "دانہ" یعنی اناج اور "بندی" یعنی پیائش ہے۔ اس طریقے میں محصول کا تعین دو مراحل میں کیا جاتا تھا۔ پہلے زمین کی پیائش جریب (رسی) یا قدموں سے ناپ کر کی جاتی تھی۔ اس کے بعد ہر فصل کے لیے الگ الگ شرح پیداوار کا تخمینہ نکال کر پوری فصلی زمین پر محصول کی مقدار کا تعین کر لیا جاتا تھا۔ اگر تشخیص کار کو محض معائنہ کی بنیاد پر شرح پیداوار کا تخمینہ نکالنے میں کسی طرح کی دقت معلوم ہوتی تھی تو وہ عمدہ، اوسط اور ادنٰی زمینوں کی شرح پیداوار کے نمونوں کی پیائش کر کے ایک اوسط شرح پیداوار کا تخمینہ نکال لیتا تھا۔ ابوالفضل کے مطابق طریقۂ کنکوت کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ بنیادی طور پر اس میں مالگزاری کا تعین جنس میں کیا جاتا تھا۔ لہٰذا "دستور العمل نویسندگی" اور "خلاصۃ السیاق" کے مطابق کنکوت میں پہلے پوری فصل کی شرح پیداوار کی بنیاد پر تشخیص کر لی جاتی تھی پھر اس میں سے کاشت کار کا حصہ نکال لیا جاتا تھا۔ اس کے بعد بچے ہوئے حصے، (محصول) کو الگ الگ فصلوں کے لیے نرخ بازار کی فہرست (Schedule of Prices) کے مطابق نقد میں منتقل کر لیا جاتا تھا۔

اس طرح دیکھا جا سکتا ہے کہ طریقۂ کنکوت یا دانہ بندی حقیقی پیداوار پر مبنی ہونے کی وجہ سے بہت حد تک طریقۂ غلہ بخشی سے مشابہ ہے لیکن اس میں نگہبانی اور فصلوں سے اناج الگ کرنے کی ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے یہ کافی سستا تھا۔ جب کہ پیائشی درستگی کے لحاظ سے بہت کارگر بھی تھا۔ پھر بھی اس طریقے میں تشخیص کار کو شرح پیداوار کا تعین کرنے کے وسیع اختیارات دیے جانے کی وجہ سے بدعنوانی کے امکانات موجود تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ بھکر کے گورنر نے 76-1675ء میں وہاں کے تشخیص کار کو وسیع تر اختیارات سے محروم کرنے کے لیے حکم جاری کیا کہ "طریقۂ کنکوت کے تحت محصول کی شرح یکساں طور پر پانچ من فی بیگہ کے حساب سے طے کی جائے۔" اس طریقے کے نفاذ کی وجہ سے ہر فصل کے لیے ہر موسم میں پیائش کی ضرورت بہت حد تک کم ہو گئی۔ اس کی وجہ سے مغلیہ حکومت کا زرعی مالگزاری کا نظام طریقۂ ضبط کے قریب پہنچ گیا۔ عرفان حبیب کے مطابق لفظ "ضبط" کو ہندوستانی مالگزاری تحریروں میں ایک تکنیکی معنی میں لیا جاتا ہے جو عصری لغات میں موجود نہیں ہے۔ یہ جریب یا عمل جریب کے مترادف کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ جن کی بنیاد پر پیائش اور تشخیص کا عمل انجام دیا جاتا تھا۔ لہٰذا بقول عرفان حبیب "کنکوت" بطور "ضبط کنکوت" نظر آتا ہے۔ کیونکہ یہ تشخیص شدہ زمین کا احاطہ کرتا ہے۔ لیکن اصل میں 'ضبط' اپنے آپ میں ایک الگ ہی طریقۂ تشخیص تھا۔"

4. ضبط (Zabti)

مغل دور میں زرعی آمدنی (محصول) کا سب سے اہم اور مؤثر طریقہ ضبط کہلاتا تھا۔ اس طریقے کی بنیاد شیر شاہ سوری نے رکھی تھی، لیکن اکبر نے اپنے ابتدائی دورِ حکومت ہی میں اس کو باقاعدہ نافذ کیا۔ بعد میں اکبر نے اس میں مختلف تجربات اور اصلاحات کر کے اسے ایک مکمل اور کامیاب نظام کی شکل دے دی۔ اس نظام کی ابتدا، ارتقا اور تکمیل کی تفصیل ابوالفضل کی آئینِ اکبری اور سترہویں صدی کے

دوسرے معاصر دستاویزات میں ملتی ہے۔ آئین کے مطابق، شیر شاہ اور اس کے بیٹے اسلام شاہ کے زمانے میں ملک کا زیادہ تر حصہ اسی نظام کے تحت لایا گیا تھا۔ شیر شاہ نے زمین کی دو بڑی اقسام، یعنی پولج اور پرتی (یعنی وہ زمینیں جو ہمیشہ کاشت میں رہتی ہیں اور بیکار نہیں چھوڑ دی جاتیں) کے لیے پیداوار کی شرح (Crop Rate) مقرر کی تھی، جسے ریع کہا جاتا تھا۔ یہ شرح تین درجوں پر مبنی تھی: اعلیٰ، اوسط اور ادنیٰ۔ ان تینوں کا اوسط نکال کر عام شرح پیداوار مان لی جاتی، اور اس کا ایک تہائی حصہ حکومت محصول کے طور پر وصول کرتی۔ اکبر نے اپنے ابتدائی سالوں میں شیر شاہ کا یہی ریع برقرار رکھا۔ لیکن جب تخت نشینی کے بعد سیاسی حالات سنبھل گئے تو اکبر نے مالی معاملات، خصوصاً زرعی محصول پر خصوصی توجہ دی۔ اکبر کے دور میں مالیاتی اصلاحات کو دو بڑے مراحل میں تقسیم کیا جاسکتا ہے

پہلا مرحلہ (1563ء-1574ء)

اس دور میں مختلف تجربات کیے گئے تاکہ محصول کے تعین اور وصولی کو بہتر بنایا جاسکے۔

- اکبر کے آٹھویں سنِ جلوس (1563ء) میں اعتماد خان کو خالصہ زمینوں (یعنی براہِ راست شاہی انتظام میں رہنے والی زمینیں) کا انچارج بنایا گیا۔ اس نے جاگیری زمینوں سے خالصہ کو الگ کیا اور ان کی واضح حد بندی کی۔
- 1564ء میں مظفر خان تُربتی کو **دیوانِ کل** بنایا گیا اور راجہ ٹوڈر مل کو ان کا معاون مقرر کیا گیا۔
- 1565-66ء میں مقامی حساب نویسوں سے زرعی معلومات مثلاً زمین کا رقبہ، پیداوار اور اناج کی قیمتیں جمع کی گئیں۔
- 1566-67ء میں مزید اصلاحات کی گئیں اور مقامی اہلکاروں کو اعداد و شمار کی بنیاد پر محصول طے کرنے کا حکم ملا۔
- 1574ء تک آتے آتے تقریباً پورے شمالی ہندوستان کے زرعی اعداد و شمار جمع ہو گئے۔

دوسرا مرحلہ (1574ء-1580ء)

اس مرحلے میں تجربات کو ایک منظم اور پائیدار شکل دینے کی کوشش کی گئی۔

- 1574ء میں اکبر نے "کروڑی تجربہ" شروع کیا۔ اس کے تحت ہر صوبے میں 'کروڑی' نام کے افسر تعینات کیے گئے جو پیداوار، قیمتیں اور زمین کی زرخیزی کا ریکارڈ رکھتے تھے۔
- 1580ء میں انہی اعداد و شمار کی بنیاد پر "آئینِ دہ سالہ" نافذ کیا گیا۔ اس کے تحت گزشتہ دس برسوں کی پیداوار اور قیمتوں کا اوسط نکالا گیا، اور اسی اوسط کی بنیاد پر ہر فصل کے لیے نقد محصول کی شرح مقرر کی گئی۔
- زمین کی پیمائش کے لیے پہلے رسی کی جریب استعمال ہوتی تھی، لیکن اب 'طناب' (بانس کے ڈنڈے جن پر لوہے کے چھلے ہوتے تھے) رائج کیے گئے۔
- ہر صوبے کو الگ الگ مالگزاری حلقوں (Revenue Circles) یا محال میں تقسیم کیا گیا، تاکہ مقامی قیمتوں اور پیداوار کے لحاظ سے محصول مقرر کیا جاسکے۔

ضبطی نظام کی خصوصیات

- زمین کی پیمائش لازمی تھی۔
- ہر فصل کے لیے نقد محصول کی شرح مقرر تھی، جسے دستور یا دستور العمل کہا جاتا تھا۔
- محصول نقدی میں وصول کیا جاتا تھا۔
- دستور کی وجہ سے مقامی اہلکار اپنی من مانی نہیں کر سکتے تھے۔
- مقررہ شرح کی وجہ سے کسان اور حکومت دونوں کے لیے آمدنی و ادائیگی میں زیادہ استحکام آ گیا تھا۔

خامیاں اور کمزوریاں

- یہ نظام ان علاقوں کے لیے موزوں نہیں تھا جہاں زمین کی زرخیزی یکساں نہیں تھی۔
- اگر کسی سال پیداوار کم ہو جاتی تو کسان کو پورا محصول دینا پڑتا، جس کا بوجھ ان پر پڑتا۔
- کسانوں کو محصول کے ساتھ ساتھ محصول لینے والے اہلکاروں کے اخراجات کے لیے اضافی رقم بھی دینی پڑتی تھی۔
- پیمائش اور تشخیص کرنے والے اہلکار بدعنوانی کر سکتے تھے۔

ضبطی نظام کو سب سے پہلے اکبر نے سلطنت کے چھ بڑے صوبوں میں نافذ کیا: دہلی، الہٰ آباد، اودھ، آگرہ، لاہور اور ملتان۔ تاہم دیگر علاقوں میں حالات کے مطابق پرانے طریقے بھی جاری رہے۔

5. نسق

غلہ بخشی، کنکوت، ہست و بود، اور ضبط جیسے طریقۂ تشخیص کے علاوہ ایک اور طریقہ مغل عہد کی مالگزاری تحریروں میں نظر آتا ہے اور جس کی نوعیت و استعمال پر مؤرخین اور دانشوروں کے درمیان کافی اختلاف پایا جاتا ہے وہ ہے "نسق"۔ لفظ "نسق" کا ادبی مطلب نظم یا انتظام سے ہے۔ ابو الفضل نے اس اصطلاح کا استعمال اپنی تحریروں میں متعدد مقامات پر کیا ہے لیکن کہیں بھی اس کا مطلب واضح نہیں کیا ہے۔ عہد جدید کے مؤرخین نے اس پر کافی مباحثہ کیا ہے۔ لیکن ان کے ذریعے اخذ کئے گئے مطالب کو یقینی طور پر قبول کرنا مشکل ہے۔ نسق سے متعلق ابو الفضل کی تحریروں کے اقتباسات کو یکجا کر کے عرفان حبیب نے جو تجزیہ کیا ہے اس کے مطابق نسق اپنے آپ میں قطعی طور پر کوئی نرالا طریقہ تشخیص نہیں تھا۔ بلکہ رائج طریقہ تشخیص کا ذیلی یا معاون قاعدہ تھا۔ مثلاً ہندوستان میں یہ طریقہ ضبط کا معاون اور کشمیر میں طریقہ غلہ بخشی کا معاون نظر آتا ہے۔ اس طرح یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نسق ایک ایسا قاعدہ تھا جو کسی بھی بنیادی طریقہ تشخیص کے ساتھ بطور معاون جوڑ کر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا ابو الفضل نے اس ضمن میں جو اصطلاح بطور "نسق ضبطی" یا "نسق غلہ بخشی" استعمال کی ہے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ نسق خود میں کوئی آزاد طریقہ تشخیص نہیں تھا۔ چونکہ طریقہ ضبط میں مختلف فصلوں کی زیر کاشت زمینوں کی ہر سال نئی پیمائش اور تخمینہ کیا جاتا تھا جو ایک پریشان کن عمل تھا۔ لہٰذا کاشتکار اور حکومت دونوں کے حق میں تھا کہ ہر سال پیمائش سے نجات حاصل ہو جائے۔ اس لیے بعد میں کچھ ترمیمات کے ساتھ پچھلے سال کے پیمائشی اعداد و شمار کو ہی موجودہ سال کی فصلوں کے محصول کا حساب لگانے کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ مؤرخ عرفان حبیب کے مطابق: اگر ہم ابو الفضل کی فراہم کردہ معلومات کو مجموعی طور پر دیکھیں تو یہ

بات واضح ہوتی ہے کہ زرعی محصول کے لیے ہر سال نئی پیائش نہیں کی جاتی تھی۔ بلکہ ایک بار جمع کیے گئے شماریاتی اعداد و شمار (چاہے وہ زمین کے رقبے کے ہوں، نقدی کی مقدار کے، غلے کی مقدار کے یا ہلوں کی تعداد کے) کو بار بار استعمال کیا جاتا تھا۔ یعنی موجودہ سال کے محصول کے تعین کے لیے پچھلے برسوں کے اعداد و شمار یا شرحوں کو ہی بنیاد بنایا جاتا تھا۔ یہی اصول دراصل نسق کہلاتا تھا۔

6. اجارہ (Revenue Farming)

مغل عہد کے مالگزاری دستاویزات میں مذکورہ بالا مختلف طریقوں کے علاوہ ایک اور اصطلاح نظر آتی ہے۔ اس کا استعمال ایک منفرد طریقہ تشخیص کے طور پر کیا جاتا تھا۔ یہ طریقہ تھا "اِجارہ" یا "اجارہ داری"۔ اس سے مراد زرعی محصولات کے تعین کا ایسا طریقہ ہے جس کے تحت کوئی گاؤں یا جاگیر یا کوئی خاص علاقہ کسی فرد (اجارہ دار) کو ایک مخصوص محصول کی مقدار کے عوض میں متعینہ مدت کے لیے دے دیا جائے اور اجارہ دار کو اس علاقے کے کاشتکاروں سے تشخیص شدہ شرح کے مطابق محصولات کی وصولی کا اختیار تفویض کر دیا جائے۔ یہ طریقہ گو کہ انتظامی نقطہ نگاہ سے آسان اور فائدہ مند نظر آتا ہے کیوں کہ اس کے تحت حکومت کو یک مشت محصول کے پیشگی حصول کا امکان ہوتا تھا۔ لیکن عملی طور پر اس کی باطنی خرابیوں کے پیش نظر مغلیہ حکومت نے عام طور پر نہ تو اس کی حوصلہ افزائی کی اور نہ ہی اسے دائرۂ قانون میں شامل کیا۔ پھر بھی یہ طریقہ عملی طور پر مغل عہد کے مالگزاری نظام میں جابجا نظر آجاتا ہے۔ مالگزاری دستاویزوں کا جائزہ لینے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس طریقے کا استعمال عام طور پر ویران شدہ علاقوں کی زرعی تجدید کاری، نئے علاقوں کو زیر کاشت لانے یا ان علاقوں، جہاں کے کاشتکار قدرتی آفات یا قحط سالی کی وجہ سے کھیتی باڑی کی صلاحیت سے محروم ہو جاتے تھے، کی زرعی سرگرمیوں کو بحال کرنے کے لیے کیا جاتا تھا۔ لیکن کسی بھی حالت میں کسی مالگزاری عہدیدار یا اہلکار، چودھری، قانون گو، مقدم یا ان کے کسی رشتہ دار یا جانکار کو اجارہ حاصل کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کے علاوہ اصولی طور پر کسی اجارہ دار کو کاشتکاروں سے تشخیص شدہ شرح سے زیادہ محصول کا مطالبہ کرنے کا اختیار نہیں تھا۔ لیکن عرفان حبیب کو اس میں شبہ ہے کہ اجارہ دار کبھی ان معیاری اصولوں کی پاسداری کرتے ہوں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اجارہ داری کا رواج ضبطی صوبہ جات، گجرات، مغلیہ دکن اور خالصہ علاقوں میں نہیں تھا۔ لیکن جاگیری علاقوں میں یہ آہستہ آہستہ عام ہوتا گیا اور سترہویں صدی کے اختتام تک اکثر بڑے جاگیردار محصول کی یک مشت وصول یابی کے عوض اپنی جاگیروں کو نیلامی کے ذریعے سب سے زیادہ بولی لگانے والے اجارہ دار کو تفویض کرنے لگے تھے۔ کہیں کہیں بڑے اجارہ داروں نے اپنے علاقے کے کچھ حصوں کو اپنے ماتحتوں یا سپاہیوں کو ذیلی اجارہ کے طور پر تفویض کرنے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ اٹھارویں صدی میں اجارہ داری کا طریقہ محصول کی تشخیص اور حصول کے لیے بہت ہی عام ہو گیا تھا۔

2.3 زرعی پیداوار (Agricultural Production)

مغل عہد کا ہندوستان ایک وسیع اور زرخیز خطہ تھا جو نہ صرف مختلف نسلوں اور مذاہب کے لوگوں کا مسکن تھا بلکہ اپنی متنوع مٹی اور موسمی حالات کی بدولت زراعت کے اعتبار سے بھی نہایت اہم مقام رکھتا تھا۔ یہاں کی زمین پر طرح طرح کی فصلیں، پھل اور سبزیاں پیدا ہوتی تھیں جن پر پورے ملک کو فخر تھا۔ مغل دور کی زرعی پیداوار کو بنیادی طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: غذائی فصلیں جیسے

گیہوں، جو، باجرہ اور چاول جو عوامی خوراک کی بنیاد تھیں؛ نقدی فصلیں جیسے کپاس، نیل، گنا اور افیون جو سلطنت کی آمدنی اور صنعت و حرفت کے لیے نہایت ضروری تھیں؛ اور پھل، سبزیاں اور مصالحہ جات جیسے آم، کیلا، انار، کالی مرچ اور الائچی وغیرہ جو نہ صرف گھریلو ضرورت پوری کرتی تھیں بلکہ بیرونی تجارت میں بھی ہندوستان کی پہچان بنیں۔ ان زرعی اجناس کی اہمیت کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے آئندہ سطور میں ہم ان تینوں شعبوں کا تفصیلی جائزہ پیش کریں گے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ مغل معیشت میں زراعت کس طرح ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی تھی۔

1. غذائی فصلیں (Food Crops)

شمالی ہندوستان میں زیادہ تر موسمی فصلیں، دو بڑے فصلی موسموں، خریف (خزاں) اور ربیع (بہار) میں اُگائی جاتی تھیں، تاہم کچھ علاقوں میں کسان خریف اور ربیع کے درمیان قلیل مدتی فصلیں بھی اگاتے تھے تاکہ سال میں تین فصلیں حاصل کی جا سکیں۔ خریف کی سب سے اہم فصل چاول تھی، جو زیادہ تر بارش والے علاقوں میں اُگائی جاتی تھی، جب کہ ربیع کی سب سے اہم فصل گیہوں تھی، جس کی پیداوار زیادہ تر پنجاب، سندھ، مغربی اُترپردیش اور دیگر کم بارش والے علاقوں میں ہوتی تھی۔ بعض مآخذ کے مطابق بہار، بنگال، گجرات اور دکن کے کچھ علاقوں میں بھی گیہوں اُگائی جاتی تھی، جہاں چاول کی فصل بھی عام تھی۔ شمالی ہندوستان میں خشک فصلیں، جیسے کمبو، سرخ چنا اور اَرنڈ، مئی سے ستمبر یا اکتوبر میں بوئی جاتی تھیں اور اگست سے دسمبر یا جنوری تک کاٹ لی جاتی تھیں، جب کہ گیلی زمینوں پر اگست یا ستمبر میں راگی اور چولَم کی فصلیں اور فروری یا مارچ میں دھان کی فصل کاٹ لی جاتی تھیں۔ جَو بھی بڑے پیمانے پر میدانی علاقوں میں اُگائی جاتی تھی، جیسا کہ ابوالفضل کے آئینِ اکبری میں الہ آباد، اودھ، آگرہ، اجمیر، دہلی، لاہور اور ملتان کے حوالے دیے گئے ہیں۔

جنوبی ہندوستان میں مخصوص فصلوں کے لیے الگ الگ موسم کی ضرورت نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ یہاں گیلی زمینوں پر ایک ہی سال میں دو بار چاول کی فصل اُگائی جاتی تھی۔ پہلی دھان کی فصل جون یا جولائی سے دسمبر یا جنوری تک اور دوسری جنوری یا فروری سے اپریل یا مئی تک ہوتی تھی۔ جنوبی ہندوستان میں چاول کی کاشت کے دو موسم تھے: کدپاہ کار، جو گرمیوں میں اُگائے جاتے تھے، اور سامب پشنم، جو سردیوں میں کاشت کیے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ پنجاب اور دکن کے سیرابی علاقوں میں بھی چاول کی کاشت کے حوالے ملتے ہیں۔ ہر علاقے میں چاول کی مختلف اقسام اُگائی جاتی تھیں، جن میں موٹے سے لے کر عمدہ قسم تک شامل تھیں اور بنگال و بہار میں سب سے عمدہ قسم کے چاول پیدا ہوتے تھے۔

ان غذائی فصلوں کے علاوہ دالوں کی کاشت بھی بڑے پیمانے پر ہوتی تھی۔ اہم دالوں میں اَرہر، چنا، مونگ، موٹھ، اُرَد اور کھِساری شامل تھیں۔ کھِساری، بہار اور موجودہ مدھیہ پردیش کے علاقوں میں بڑے پیمانے پر اُگائی جاتی تھی، حالانکہ ابوالفضل نے اس کے صحت کے لیے نقصان دہ ہونے کا ذکر بھی کیا ہے، جس کی تصدیق جدید محققین بھی کرتے ہیں۔ جوار اور باجرہ بھی اہم فصلیں تھیں اور زیادہ تر ان علاقوں میں اُگائی جاتی تھیں جہاں گیہوں کی پیداوار ہوتی تھی۔ مکئی یا مکّا کی پیداوار سترہویں صدی کے دوسرے نصف میں بعض علاقوں میں دیکھنے کو ملتی ہے، جن میں راجستھان، مہاراشٹرا اور دیگر ممکنہ علاقے شامل ہیں۔ چاول اور گیہوں کے علاوہ دیگر غذائی اجناس، جیسے سبزیاں اور

پھل، بھی اہمیت رکھتے تھے۔ سبزیاں اور پھل نہ صرف گھریلو استعمال کے لیے پیدا کیے جاتے تھے بلکہ تجارت اور بازار میں فروخت کے لیے بھی استعمال ہوتے تھے۔ شمالی اور جنوبی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مخصوص سبزیوں اور پھلوں کی پیداوار عام تھی، جیسے آم، کیلا، تربوز، انار اور دیگر موسمی پھل، جو مقامی خوراک کا حصہ ہونے کے ساتھ ساتھ بیرونی منڈیوں میں بھی بھیجے جاتے تھے۔ اس طرح، مغل دور کی زرعی پیداوار کی وسعت، تنوع اور فصلوں کی مختلف اقسام نہ صرف اندرون ملک ضروریات پوری کرتی تھیں بلکہ سلطنت کی معیشت اور تجارت میں بھی بنیادی کردار ادا کرتی تھیں، اور ہندوستان کو ایک زرخیز اور تجارتی لحاظ سے اہم خطہ بناتی تھیں۔

2. نقد فصلیں (Cash Crops)

بنیادی طور پر جن فصلوں کی پیداوار، منڈی کے لیے ہوتی ہے انہیں نقد فصل کہا جاتا ہے۔ ان فصلوں کو فارسی کے دستاویزوں میں جِنس کامل یا جِنس اعلی (یعنی اعلی درجے کی فصلیں) کہا جاتا تھا۔ موسمی غذائی فصلوں کے برعکس، یہ تقریباً پورا سال کھیتوں پر قابض رہتی تھیں۔ سولہویں اور سترہویں صدیوں میں اہم نقدی فصلوں میں گنّا، کپاس، نیل اور افیون تھے۔ یہ تمام فصلیں ہندوستان میں زمانہ قدیم سے ہی اُگائی جاتی تھی۔ سترہویں صدی میں اس کی مانگ میں صنعتکاری اور تجارتی سرگرمیوں کی وجہ سے اضافہ ہوا۔ چونکہ اس صدی میں ان تمام اشیا کی تجارت کے لیے بڑے بڑے غیر ملکی بازار بھی کھل گئے تھے۔ بازار میں ان اشیا کے کثیر مطالبے پر ہندوستانی کسان نے فوری عمل کرتے ہوئے ان فصلوں کی کاشت میں اضافہ کیا۔

گنّا اس عہد میں سب سے زیادہ اُگائی جانے والی نقد فصل تھی۔ ابوالفضل نے اپنی آئین اکبری میں اسے آگرہ، اودھ، لاہور، ملتان اور الہ آباد کے دستوری حلقوں میں درج کیا ہے۔ حالانکہ بنگال کی چینی سب سے بہترین سمجھی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ملتان، مالوا، سندھ، خاندیش، برار اور جنوبی ہندوستان کے تقریباً علاقے میں اس کے اُگائے جانے کے حوالے ملتے ہیں۔ گنّے کے علاوہ کپاس دوسری نقد فصل تھی جس کی بڑے پیمانے پر کاشت کی جاتی تھی۔ موجودہ مہاراشٹر، گجرات اور بنگال کے حصے میں اس کی کھیتی بڑے پیمانے پر ہوتی تھی۔ اس عہد کے تاریخی مآخذ میں ذکر کیا گیا ہے کہ کپاس کی کھیتی، اجمیر، الہ آباد، اودھ، بہار، ملتان، تھٹّا (سندھ)، لاہور اور دہلی میں کی جاتی تھی۔ نیل ایک تیسری فصل تھی جس کی کھیتی مغل عہد میں بڑے پیمانے پر ہوتی تھی۔ اس کے پودے سے نیلا رنگ نکلتا تھا جس کی ہندوستان اور یوروپ میں بہت زیادہ مانگ تھی۔ اس کی موجودگی کے حوالے اودھ، الہ آباد، اجمیر، دہلی، آگرہ، لاہور، ملتان اور سندھ کے دستاویزوں میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس کی کاشت بنیادی طور پر گجرات، بہار، بنگال، مالوا اور جنوبی ہندوستان، دکن اور کورومنڈل میں کی جاتی تھی۔ بَیانہ اور سر کھیج نیل کی وہ اقسام تھیں جن کی سب سے زیادہ مانگ تھی۔ بیانہ جو آگرہ کے قریب ایک جگہ ہے جسے نیل کی بہترین قسم کی پیداوار کے لیے جانا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے یہاں کے نیل کی قیمت سب سے زیادہ تھی۔ اسی طرح احمد آباد کے قریب مقام سر کھیج کو معیار میں دوسرے نمبر پر سمجھا جاتا تھا اور اس کی قیمت بھی زیادہ تھی۔ اچھے قسم کے نیل کے دیگر مقامات اُترپردیش کے خُورجہ، علی گڑھ کے قریبی علاقے، سندھ کے سہوان اور دکن کے تلنگانہ تھے۔

نقد فصلوں میں اَفیم یا افیون کا بھی شمار ہوتا تھا۔ ہندوستان میں اس کی کھیتی کی اطلاع کئی مقامات سے ملتی ہے۔ مغل عہد میں بہار اور

مالوہ کے صوبوں میں سب سے اچھی قسم کی افیون پیدا ہوتی تھی۔ حالانکہ اس کی کاشت ہندوستان کے مختلف علاقوں جیسے، اودھ، بہار، دہلی، آگرہ، ملتان، لاہور، بنگال، گجرات اور راجستھان کے مارواڑ اور میواڑ میں بھی کی جاتی تھی۔ جہاں تک تمباکو کی کاشت کا سوال ہے اس کی کھیتی ہندوستان میں کچھ ہی عرصے پہلے پھیلی تھی۔ کیوں کہ آئین اکبری میں ابوالفضل نے اس کا ذکر دستوری حلقوں یا دوسرے خطوں میں فصل کے طور پر نہیں کیا ہے۔ مورخین کا خیال ہے کہ تمباکو کو ہندوستان میں پرتگالیوں نے سولہویں صدی کے دوران متعارف کرایا تھا۔ اس کی کاشت ملک کے تقریباً تمام حصوں میں اور خاص طور پر سورت اور بہار میں دیکھی گئی۔ کافی کی کھیتی کے سلسلے میں، مورخین کا یہ خیال ہے کہ اس کی کاشت ہندوستان میں سترہویں صدی کے دوسرے نصف میں ہوئی تھی جب کہ مغل دور میں چائے کو عام مشروبات میں شمار نہیں کیا جاتا تھا۔ سَن کی کھیتی مغل سلطنت کے تمام بنیادی صوبوں جیسے اودھ، الہ آباد، آگرہ، لاہور، اجمیر وغیرہ میں کی جاتی تھی۔ حالانکہ شہتوت کے پودوں پر ریشم کے کیڑے کی پرورش کے ذریعے ریشم کی زراعت آسام، کشمیر، مغربی ساحل میں اور خاص طور سے بنگال میں کی جاتی تھی۔ دراصل بنگال ریشم کی پیداوار کا ایک اہم خطہ تھا۔ جن پودوں کے بیج تیل نکالنے کے لیے استعمال ہوتے تھے وہ خوراک کے ساتھ نقد فصلوں کے زمرے میں آتے تھے۔ تیل پیدا کرنے والی اہم فصلیں تِل، ارنڈی اور اَلسی (تیسی) تھیں۔ الہ آباد، ملتان اور بنگال میں بھی تل کی کاشت کی اطلاع ملتی ہے۔ حالانکہ تل کے مقابلے دیگر تیل کے بیجوں کے پودوں کی کاشت کا رواج کم ہی تھا۔

3. **پھل، سبزیاں اور مصالحے** (Fruits, Vegetables, and Spices)

مغل عہد میں باغبانی کا عروج تھا۔ مغل بادشاہوں اور امراء نے بڑے تعداد میں باغات لگائے تھے۔ تقریباً ہر امیر کے باغات اُن شہروں کے مضافات میں تھے جہاں وہ رہتے تھے۔ باغات پوری منصوبہ بندی کے ساتھ لگائے گئے تھے۔ موجودہ ہندوستان میں پائے جانے والے مختلف پھل سولہویں اور سترہویں صدی میں متعارف کرائے گئے۔ اناناس بھی ایک ایسا ہی پھل ہے جسے پرتگالیوں نے لاطینی امریکہ سے ہندوستان میں روشناس کرایا۔ تھوڑے ہی مدت میں یہ پھل اتنا مشہور ہوا کہ پورے ہندوستان میں بڑے پیمانے پر اس کی کاشت ہونے لگی۔ پپیتا اور کاجو بھی اسی طرح سے ہندوستان میں لائے گئے، لیکن ان کا رواج تھوڑا دیر سے ہوا۔ کابل سے لاکر پیوند کاری (Grafting) کے ذریعے چیری کو کشمیر میں اگایا گیا تھا۔ پیوندکاری کی مشق بہت سے پھلوں کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے کی جاتی تھی۔ سنترے اور کھٹے پھلوں کی دیگر اقسام، خوبانی، آم اور دیگر پھلوں کی ایک بڑی تعداد کو پیوندکاری کے ذریعہ بہت بہتر بنایا گیا۔ ناریل نہ صرف ساحلی علاقے بلکہ اندرون ملک میں بھی اُگایا جاتا تھا۔ خربوزہ اور انگور کی مختلف اقسام کے بیج کابل سے منگوا کر شاہی باغات اور مغل امراء کے باغات میں بڑے سلیقے سے لگائے گئے۔ آم اور خربوزے تو کسان ندیوں کے کنارے ہر جگہ اُگاتے تھے۔ جہاں تک سبزیوں کی کاشت کا سوال ہے تو پورے ملک میں مختلف قسم کی سبزیاں اُگائی جاتی تھی۔ آئین اکبری میں اس عہد میں کھائے جانے والی سبزیوں کی ایک طویل فہرست دی گئی ہے۔ مورخین کا خیال ہے کہ آلو اور ٹماٹر سترہویں صدی اور اس کے بعد ہندوستان میں متعارف کرائے گے تھے۔ ہندوستان زمانہ قدیم سے ہی اپنے مصالحوں کے لیے جانا جاتا تھا۔ ہندوستان کے جنوبی ساحلی علاقوں نے ایشیاء اور یوروپ کے مختلف خطوں میں بڑے پیمانے پر مصالحوں کی برآمد کی۔ یہاں کالی مرچ، لونگ اور الائچی کی فراوانی تھی۔ ادرک اور ہلدی بھی بڑے پیمانے پر اُگائی جاتی تھی۔ ڈچ اور انگریز برآمد کے لیے بڑی مقدار میں سامان خریدا کرتے تھے۔ کشمیر میں کاشت کیا جانے والا زعفران اپنے رنگ اور ذائقے کے لیے جانا جاتا

تھا۔ پان بہت سے علاقوں میں اُگائے جاتے تھے۔ بہار کا مگھی پان اور بنگال کے دیگر مختلف قسم کے پان مشہور تھے۔ ساحلی علاقوں میں بھی سپاری پیدا کی جاتی تھی۔ حالانکہ بڑے جنگلی علاقے تجارتی لحاظ سے اہم مصنوعات فراہم کرتے تھے۔ طبی مقاصد کے لیے استعمال ہونے والا لگنم اور لٹھ بڑی مقدار میں بر آمد کیا جاتا تھا۔

2.3.1 پیداواری صلاحیت اور پیداوار (Productivity and Production)

مغل ہندوستان میں فصلوں کی پیداواری صلاحیت اور پر بیگھا پیداوار پر شیرین موسوی نے کام کیا ہے۔ اس لیے اس موضوع سے متعلق معلومات کے لیے ان کی تحقیق پر انحصار کیا جاسکتا ہے۔ اس سے متعلق آئین اکبری میں ضبطی صوبوں جیسے لاہور، ملتان، آگرہ، الہ آباد، اودھ اور دہلی کی فصلوں کی پیداوار اور محصولات کی شرح کا لیکھا جوکھا دیا گیا ہے۔ ہر فصل کی پیداوار کی شرح اعلی، درمیانی، اور کم درجے والی زمین کے مطابق دی گئی ہے اور اسی بنیاد پر پیداوار کی اوسط تیار کی گئی ہے۔ حالانکہ ابوالفضل ہمیں یہ نہیں بتاتے کہ ان تین اقسام کی بنیاد کیا تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ کم پیداوار ان زمینوں کی تھی جو بنا سنچائی والی تھیں جب کہ باقی دو ان کھیتوں کی ہیں جن کی سنچائی کی جاتی تھی۔ شیرین موسوی نے سولھویں صدی کے دستاویزوں سے دستیاب مختلف اعداد و شمار کی بنیاد پر قیاس آرائی کی ہے۔ ان کے مطابق کچھ بڑی فصلوں کی پیداوار اوسط، درمیانی، اور کم پیداوار والی فصل مندرجہ ذیل کے مطابق تھی۔ شیرین موسوی نے آئین اکبری میں درج فصل کی پیداوار کا موازنہ انیسویں صدی کے آخر میں ہونے والی پیداوار سے بھی کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر دو ادوار کے درمیان غذائی فصلوں کی پیداواری صلاحیت میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ پھر بھی نقد فصلوں کی صورت میں انیسویں صدی میں پیداواری صلاحیت میں ایک یقینی اضافہ دیکھا جاسکتا ہے۔

جدول 2.1: فصل کی اوسط پیداوار۔ (1595-96) (مَن اکبری فی بیگھا الٰہی)

گیہوں	13.49	جَو	12.93	چنا	9.71
باجرا	5.02	جَوار	7.57	کپاس	5.75
گنّا	11.75	سرسوں	5.13	تل	4.00

یہ اعداد و شمار، شیرین موسوی کی کتاب، The Economy of the Mughal Empire C. 1595: A Statistical Study کے صفحہ نمبر 82 سے لیے گئے ہیں۔

2.4 آبپاشی اور زرعی تکنیک (Irrigation and Agricultural Technology)

زراعت کے تعلق سے ہندوستانی زراعت کی کچھ اہم خصوصیات ہیں۔ مغل عہد میں ہندوستانی کسان مٹی کی نوعیت اور فصلوں کی ضرورت کے لحاظ سے کھیتی کے لیے مختلف قسم کے آلات اور طریقہ کار استعمال کرتے تھے۔ اسی طرح مختلف علاقوں میں آبپاشی کے لیے مختلف ذرائع رائج تھے۔

2.4.1 کاشتکاری کے ذرائع اور طریقہ کار (Means and Methods of Cultivation)

اس عہد میں ہل اور بیل کا زراعتی معاملات میں اہم کردار تھا۔ ہل اور بیلوں کے جوڑے کو استعمال کر کے کھیتی باڑی کی جاتی تھی۔ لوہے کی پھالی لکڑی کے ہل کے ساتھ جوڑ کر مکمل ہل بنایا جاتا تھا۔ یوروپ میں استعمال ہونے والے طریقہ کار کے بر عکس ہندوستان میں نہ تو

گھوڑا اور نہ ہی بیلوں کے ذریعے کھینچے جانے والے پہیوں والے ہل اور نہ ہی مڑا ہوا لکڑی کا تختہ (Mouldboard) استعمال ہوتا تھا۔ علاقائی تغیرات کے ساتھ ساتھ ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں ہلکے ہل جسے بآسانی کسان اپنے کاندھوں پر اٹھا سکتا تھا سے لے کر سخت مٹی کو توڑنے کے لیے وزنی لکڑی کا استعمال ہوتا تھا۔ نرم مٹی کے لیے لوہے کے ہل یا ہل کی پھالی کا استعمال کیا جاتا تھا۔ حالانکہ کسانوں کے لیے لوہے والا ہل زیادہ مہنگا پڑتا تھا۔ کچھ ہمعصر یوروپی سیاحوں نے حیرت انگیز انداز میں ہندوستانی ہل کی خاصیت کا ذکر کیا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق ہندوستانی ہل صرف مٹی کی اوپری پرت کو پلٹتے تھے اور یہ کہ یہاں گہری کھدائی نہیں کی جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کا طریقہ کار، ہندوستانی ماحولیات کے مطابق تھا کیونکہ صرف مٹی کا اوپری حصہ ہی زرخیز ہوتا تھا اور زیادہ گہری کھدائی کی وجہ سے مٹی کی نمی ختم بھی ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ کھیت میں مٹی کی گانٹھوں اور ڈھیروں کو توڑنے کے لیے آلات کی مدد لی جاتی تھی۔ شمالی ہندوستان کے کچھ حصوں میں بھاری لکڑی کے تختوں، جنہیں پٹیلا یا پٹلہ کہا جاتا تھا، کو بیلوں کے ذریعے کھینچا جاتا تھا۔ عام طور سے بیجوں کو ہاتھ سے بکھیر کر بویا جاتا تھا۔ حالانکہ سولہویں صدی میں باربوسا نے دھان کی بوائی کے لیے بیج بونے والے ایک آلے کا ذکر کیا ہے، جس کا استعمال ساحلی علاقوں میں کیا جاتا تھا۔

زمین کی زرخیزی بڑھانے یا برقرار رکھنے کے لیے مختلف مصنوعی طریقے عمل میں لائے جاتے تھے۔ کھاد حاصل کرنے کے لیے جنوبی ہندوستان میں بڑے پیمانے پر بھیڑوں اور بکریوں کا ریوڑ استعمال کیا جاتا تھا۔ عام طور سے ان مویشیوں کے ریوڑ کو کھیتوں میں چند راتیں باندھا جاتا تھا تاکہ ان کا فضلہ اور ملبہ جمع ہو سکے، جسے بہترین کھاد سمجھا جاتا تھا۔ ایسا بھی مانا جاتا تھا کہ اگر ایک ایک ہزار مویشیوں کا ریوڑ ایک کنی زمین (132 یکڑ) میں پانچ یا چھ راتیں باندھ دیا جائے تو یہ عمل اس زمین کو چھ سے سات سالوں تک زرخیز رکھنے کے لیے کافی ہے۔ یہ طریقہ عام طور پر شمالی ہندوستان میں رائج تھا۔ حالانکہ ساحلی علاقوں میں مچھلی کی کھاد بھی استعمال ہوتی تھی۔ مزید برآں کھیت کی زرخیزی بڑھانے اور زمین پر پورے سال کھیتی کرنے کے لیے فصلوں کی گردش کا طریقہ بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ اس میں ایک سال یا ایک موسم میں گندم یا دھان جیسی اناج کی فصل اگانے کے بعد اگلے موسم میں دالیں (چنا، مسور، مونگ وغیرہ) کاشت کی جاتی تھیں۔ یہ طریقہ مٹی کی پیداوری صلاحیت کو برقرار رکھنے کے لیے بھی اچھا سمجھا جاتا تھا۔ ہندوستانی کسانوں نے پیڑھیوں سے اچھی کھیتی کے لیے فصلوں کی گردش کے بارے میں جانا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ بہتر پیداوار کے لیے کس خاص فصل کو دوسری فصل سے بدلنا ہے۔

فصل کاٹنے کے لیے نیم دائرہ نما آلہ جسے درانتی کہا جاتا تھا، کا استعمال عام تھا۔ بھوسا الگ کرنے کے لیے کٹی ہوئی فصلوں کو زمین پر پھیلا دیا جاتا تھا۔ اس عہد کے ہمعصر ماخذ میں بھوسا الگ کرنے کے لیے دو طریقوں کے حوالے ملتے ہیں۔ پہلے طریقے میں فصل کو لاٹھیوں سے پیٹا جاتا تھا، تاکہ اناج الگ ہو جائے جب کہ دوسرے طریقے میں پھیلی ہوئی فصل پر جانوروں کو چلایا جاتا تھا جس میں جانوروں کے وزن اور نقل و حرکت سے اناج الگ ہو جاتا تھا۔ دوبارہ اناج کو ٹوکریوں میں رکھ کر آہستہ آہستہ پھٹکا جاتا تھا۔ اس عمل میں ہوا کی وجہ سے بھوسا اڑ جاتا تھا اور خالص اناج زمین پر گر جاتا تھا۔

2.4.2 آبپاشی کے ذرائع (Sources of Irrigation)

ہندوستانی زراعت آبپاشی کے لیے زیادہ تر بارش پر منحصر تھی۔ کچھ خاص فصلیں تو ایسی تھیں جن کی بوائی کے انتخاب کی بڑی وجہ کسی خاص علاقے میں بارش کے پانی کی دستیابی تھی، یعنی جس علاقہ میں بارش کا پانی زیادہ ہوتا تھا، انہیں علاقوں میں کچھ خاص فصلیں اگائی جاتی تھیں۔ بارش کے پانی جیسے قدرتی ذریعے کے علاوہ، مصنوعی آبپاشی کے لیے کئی آلات استعمال کیے جاتے تھے۔ حالانکہ کنوؤں سے آبپاشی کا طریقہ پورے ملک میں عام تھا۔ اس زمانے کی دستیاب ٹیکنالوجی کے اعتبار سے کنوؤں سے پانی اٹھانے کے لیے مختلف طریقے عمل میں لائے جاتے تھے۔ شمالی ہندوستان کے میدانی علاقوں میں معیاری (اینٹ یا پتھر کے) پکے اور غیر معیاری (کچے) دونوں طرح کے کنویں کھودے جاتے تھے۔ کچے کنویں پائیدار نہیں ہوتے تھے اور ہر سال کچھ کھدائی کرنے کی ضرورت پڑ جاتی تھی۔ جب کہ پکے کنویں پائیدار اور پانی اٹھانے کے بہتر آلات کو نصب کرنے کے لیے زیادہ مناسب تھے۔ پکے کنوؤں میں دیواریں یا چبوترے بنائے جاتے تھے۔ کنویں کی تعمیر کے لیے اینٹ اور پتھر دونوں استعمال کیے جاتے تھے۔ ان کنوؤں کے اندر سے عام طور سے پکی مٹی (ٹیراکوٹا) کے چھلّے لگائے جاتے تھے جسے انگوٹھی نما کنوؤں کے نام سے جانا جاتا تھا۔ کنوؤں سے پانی اٹھانے کے لیے کئی آلات استعمال کیے جاتے تھے۔ پانی اٹھانے کے مندرجہ ذیل پانچ طریقہ کار عام تھے۔

1. بغیر کسی مشینی مدد کے ہاتھ سے رسّی اور بالٹی کے ذریعے پانی کھینچنے کا طریقہ سب سے آسان تھا۔ لیکن اپنی محدود صلاحیت کی وجہ سے یہ آلہ بڑے کھیتوں کی سنچائی کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔
2. دوسرے طریقے میں کنوؤں کے اوپر گھِرنی لگا کر رسی اور بالٹی سے پانی اوپر کھینچا جاتا تھا۔ اس طریقہ کار میں گھِرنی کی مدد سے کم محنت کے ساتھ بڑی مقدار میں کنویں سے پانی نکالا جاتا تھا۔ مذکورہ بالا دونوں طریقہ کار اور آلات گھریلو استعمال میں پانی فراہمی یا چھوٹے کھیتوں کی سنچائی کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔
3. تیسرے طریقہ کار میں رسی، گھرنی اور بیلوں کے جوڑے کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اس طریقے میں جانوروں کی طاقت کے استعمال سے بڑے کھیتوں کی سنچائی میں مدد ملتی تھی۔
4. بیرمی اصول پر مبنی آلہ کا طریقہ:۔ یہ آلہ بیرمی اصول پر مبنی تھا جسے شادوف (Shaduf) کی طرز پر بنایا جاتا تھا۔ اس طریقہ کار میں ایک لمبی لکڑی یا شہتیر کو درمیان سے ٹکا کر ایک طرف بالٹی اور دوسری طرف وزنی پتھر باندھ دیا جاتا تھا۔ بالٹی کو رسی کے ذریعے کنویں یا تالاب میں ڈالا جاتا اور پھر وزن کے دباؤ سے اوپر کھینچا جاتا تھا۔ یہ آلہ انسان کی مدد سے چلتا تھا اور محدود پیمانے پر پانی کھیتوں تک پہنچانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا، لہٰذا زیادہ تر چھوٹے کسانوں کے لیے موزوں تھا۔
5. پہیے پر مبنی آلہ یا فارسی پہیہ (Persian Wheel) طرز کا طریقہ: پانچواں طریقہ پہیے پر مبنی تھا جسے چرخی یا فارسی پہیہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی ابتدائی صورت یہ تھی کہ برتنوں کی قطار پہیے کے کناروں سے باندھ دی جاتی اور جانوروں کی مدد سے اسے گھمایا جاتا تھا۔ برتن ایک ایک کر کے کنویں میں ڈوبتے اور پانی اوپر لا کر بہا دیتے۔ بعد میں اس طریقے میں بہتری لائی گئی اور برتنوں کی لڑی، تین پہیوں اور

گیئر سسٹم کے ساتھ جانوروں کی طاقت کو ملا کر ایک ایسا آلہ تیار کیا گیا جو بڑی مقدار میں پانی نکالنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ یہ بڑے کھیتوں اور گہرے کنوؤں سے پانی کھینچنے کے لیے کارآمد ثابت ہوا، لیکن اس کی پیچیدگی اور اخراجات زیادہ ہونے کے باعث عام کسان اسے استعمال نہیں کر پاتے تھے، لہٰذا اس کی رسائی محدود طبقے تک رہی۔

مندرجہ بالا تمام طریقہ کار اور آلات کے علاوہ ہندوستان کے تمام حصوں میں جھیل، تالاب اور پانی کے ذخائر بھی سنچائی کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔ خاص طور سے جنوبی ہندوستان میں ، آبپاشی کے لیے استعمال ہونے والا سب سے زیادہ مروجہ طریقہ آبی ذخائر یا تالابوں کی تیاری تھا۔ یہاں ندیوں پر باندھ (Dam) بنائے گئے۔ ایسے آبی ذخائر کی تعمیر انفرادی طور سے کافی مشکل تھی۔ ایسی سہولیات کی فراہمی کی ذمہ داری خاص طور پر مقامی سربراہ، اور مندروں کی انتظامیہ کی تھی۔ اس ضمن میں ایک وسیع و عریض، مڈگ جھیل اس وقت کے فن تعمیر کی اہم مثال ہے۔ **مڈگ جھیل** (Madaga Lake)، جسے **مادگدا کیرے** (Madagadakere) بھی کہا جاتا ہے، وجے نگر سلطنت کے دور میں بنائی گئی۔ یہ موجودہ کرناٹک، میں واقع ہے۔ اس کا مقصد بارش کے پانی کا ذخیرہ کرنا تھا تاکہ خشک موسم میں دارالحکومت اور آس پاس کے زرعی علاقوں کو پانی فراہم کیا جا سکے۔ یہ منصوبہ سلطنت کی خوش حالی کے لیے انتہائی اہم تھا۔ اس جھیل کو بنانے کے لیے ایک سیدھا ڈیم بنانے کے بجائے، انجینئروں نے قدرتی جغرافیہ کا فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے دو یا دو سے زیادہ پہاڑیوں کے درمیان موجود خلا یا وادی کو بند کرنے کے لیے مٹی اور پتھروں کے تین بڑے بند (Embankments) تعمیر کیے۔ یہ طریقہ کم محنت میں زیادہ بڑا آبی ذخیرہ بنانے میں مددگار ثابت ہوا۔ اس تکنیک سے وہ ایک بہت بڑے علاقے کو گھیر کر ایک مصنوعی جھیل بنانے میں کامیاب ہوئے۔ جب یہ جھیل پانی سے مکمل طور پر بھر جاتی تھی، تو اس کا پھیلاؤ بہت وسیع ہو جاتا تھا، جس کی لمبائی 10 سے 15 میل تک پہنچ جاتی تھی۔ یہ اس کے بہت بڑے حجم اور پانی ذخیرہ کرنے کی بے پناہ صلاحیت کو ظاہر کرتا ہے۔ ڈیم یا بند میں پانی کے اخراج کو کنٹرول کرنے کے لیے **سلائس گیٹ** (Sluice Gates) بنائے گئے تھے۔ یہ گیٹ عام لکڑی یا لوہے کے نہیں تھے، بلکہ تراشے ہوئے پتھروں کی بڑی اور وزنی سلوں (Slabs) سے بنائے گئے تھے۔ ان پتھروں کو اس مہارت سے تراشا اور نصب کیا گیا تھا کہ وہ پانی کے بہاؤ کو قابو کرنے اور نہروں میں چھوڑنے کا کام مؤثر طریقے سے کر سکیں۔ یہ اس دور کی پتھر تراشی اور انجینئرنگ کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔

راجستھان ہندوستان کا ایک ایسا علاقہ ہے جہاں پانی کو جمع کرنے کے لیے بڑے ذخائر موجود ہیں ۔ مغل مورخ ابوالفضل کے مطابق میواڑ کی ڈھیبر جھیل (Dhebar Lake) کا احاطہ تقریباً چھتیس میل ہے۔ اُدَیے ساگر (Udai Sagar Lake) جھیل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا احاطہ بارہ میل ہے۔ اس خطہ میں راج سَمند اور جَے سَمند وغیرہ دوسری اہم جھیلیں تھیں جسے سترہویں صدی میں بنایا گیا تھا۔ اسی طرح کے ذخائر جیسے ادے پور میں فتح ساگر جھیل میں باندھ کی مدد سے بنائے گئے تھے۔ اسی طرح گاؤں کے تقریباً ہر جُھرمٹ میں چھوٹے چھوٹے آبی ذخائر اور جھیلیں تھیں جہاں بارش کا پانی جمع کیا جاتا تھا۔

ہمعصر مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ 1650 کے دہائی میں مغل انتظامیہ نے کھیتوں کی سنچائی کے لیے خاندیش اور برار کے علاقوں میں باندھ بنانے کے لیے کاشتکاروں کو چالیس سے پچاس ہزار روپیہ دینے کی تجویز پیش کی تھی۔ یہ بھی کافی دلچسپ ہے کہ خاندیش میں اس

طرح کے چھوٹے باندھوں کا ایک وسیع جال پھیلا ہوا ہے جو اب بھی استعمال میں ہے، اور وہ تمام اس علاقے کی پانچ بڑی ندیوں جیسے موسم (Mosam)، گرنا (Girna)، پنجھرا (Panjhra) بوری (Bori) اور شیونا (Shivna) یا ان کی معاون ندیوں پر بنے ہوئے تھے۔ شمالی ہندوستان کے میدانی علاقوں میں نہریں سنچائی کا ایک اہم ذریعہ تھیں۔ دور وسطیٰ میں نہروں کی تعمیر کا سلسلہ تغلق خاندان کے دور حکومت سے نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ یہی سلسلہ مغل عہد میں بھی جاری رہا۔ مغل حکمراں شاہجہاں کے دور حکومت میں نہر فیض کی تعمیر ہوئی تھی جس کی لمبائی تقریباً ایک سو پچاس میل تھی یہ جمنا ندی سے پانی کو ایک بڑے علاقے تک لے جاتی تھی۔ ایک اور نہر تقریباً سو میل لمبی تھی جو لاہور کے قریب راوی ندی سے کاٹی گئی تھی۔ اسی طرح پورے سندھ کے ڈیلٹائی علاقے میں متعدد نہروں کے باقیات ملتے ہیں۔ مؤرخ عرفان حبیب کا خیال ہے کہ مغل نہروں کی سب سے بڑی کمی یہ تھی کہ وہ زیادہ تر ندیوں کے ارد گرد کے میدانوں سے پرے نہیں بہتی تھیں۔ اس لیے ان نہروں سے جو پانی ملتا تھا وہ ان سے اٹھانے تک محدود تھا۔ ان علاقوں میں نہروں کے جال کا سلسلہ جاری رہا۔ جب کہ جنوبی ہندوستان میں نہروں کی تعمیر کا کوئی حوالہ نہیں ملتا ہے، کیوں کہ ان کا رواج صرف شمالی ہندوستان تک ہی محدود تھا۔

2.5 زرعی بحران (Agrarian Crisis)

مغل سلطنت معیشت کی بنیاد زراعت پر قائم تھی۔ سلطنت کا وسیع و عریض انتظامی اور فوجی ڈھانچہ کسانوں سے حاصل ہونے والی آمدنی پر چلتا تھا۔ لیکن سترہویں صدی کے آخر اور اٹھارہویں صدی کے آغاز میں یہ زرعی ڈھانچہ شدید دباؤ کا شکار ہو گیا۔ اسی دباؤ کو تاریخ نویسی میں 'زرعی بحران' کہا جاتا ہے، جو مغل سلطنت کے زوال کے اسباب میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔ زرعی بحران کا مطلب صرف کسانوں کی مشکلات نہیں تھا بلکہ یہ ایک ایسے فساد کی نشاندہی کرتا ہے جس نے ریاستی معیشت، سماج اور سیاست تینوں کو متاثر کیا۔ مغل حکومت زمین کی پیداوار کا ایک بڑا حصہ بطور محصول کسانوں سے وصول کرتی تھی، جو عموماً پیداوار کے نصف تک پہنچ جاتا تھا۔ یہ محصول جاگیرداروں (منصب داروں) کے ذریعے وصول کیا جاتا تھا جنہیں عارضی طور پر جاگیریں دی جاتی تھیں۔ جاگیریں، مستقل نہ ہونے کے باعث جاگیردار طویل المدتی منصوبہ بندی یا زمین کی زرخیزی بڑھانے میں دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ ان کا مقصد صرف مختصر عرصے میں زیادہ سے زیادہ دولت اکٹھی کرنا ہوتا تھا۔ اس رویے نے کسانوں کو تنگ اور بدحال کر دیا۔ کسان بھاری ٹیکسوں اور استحصال سے تنگ آکر زمینیں چھوڑ کر بھاگنے لگے یا بغاوت پر اُتر آئے۔ جاٹوں، ستنامیوں اور سکھوں کی بغاوتیں اسی پس منظر میں وجود میں آئیں۔ یوں زرعی بحران نے سلطنت کی معیشت کی بنیادیں ہلا دیں۔

علی گڑھ اسکول کا مؤقف: زرعی بحران کی سب سے جامع تشریح علی گڑھ اسکول کے مورخین نے خاص طور پر عرفان حبیب اور ستیش چندر نے کی ہے۔ عرفان حبیب کے مطابق یہ بحران مغل انتظامیہ کی اپنی ساخت میں پوشیدہ تھا۔ جاگیردار، چونکہ جاگیروں کے مستقل مالک نہیں تھے، اس لیے وہ زمین یا کسانوں کی حالت بہتر بنانے میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے تھے بلکہ زیادہ سے زیادہ نچوڑنے کی پالیسی اپناتے تھے۔ اس طرزِ عمل نے حکمران طبقے اور کسانوں کے درمیان ایک واضح طبقاتی کشمکش کو جنم دیا۔ یہی کشمکش کسانوں کی زمین سے فرار اور مسلح بغاوتوں کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ ستیش چندر نے اس تصور کو مزید وسعت دیتے ہوئے کہا کہ جاگیروں کی تقسیم بڑھتی جا رہی تھی جب کہ زمین محدود

تھی۔ نتیجتاً جاگیرداروں کی تعداد زیادہ ہو گئی مگر جاگیریں کم پڑ گئیں۔ اس صورتحال نے استحصال کو مزید تیز کر دیا اور بحران کو گہرا کر دیا۔ یوں علی گڑھ اسکول نے زرعی بحران کو ایک ''ساختیاتی بحران'' (Structural Crisis) قرار دیا جس کا نتیجہ سلطنت کے زوال کی صورت میں نکلنا لازمی تھا۔

نظر ثانی پسند مؤرخین کا نقطۂ نظر: بیسویں صدی کے آخر میں کئی مؤرخین نے علی گڑھ اسکول کے مؤقف کو چنوتی دی۔ مظفر عالم، سی اے بیلی اور جے ایف رچرڈز جیسے مؤرخین نے کہا کہ اٹھارہویں صدی کو مکمل تباہی کا دور قرار دینا درست نہیں۔ ان کے مطابق، یہ دور محض معاشی بحران کا نہیں بلکہ سیاسی تنظیمِ نو کا بھی تھا۔ جب دہلی میں مرکزی اقتدار کمزور ہوا تو اودھ، بنگال اور حیدرآباد جیسی نئی ریاستیں ابھریں جنہوں نے مقامی معیشت کو سہارا دیا۔ ان ریاستوں نے ٹیکس وصولی کے نسبتاً بہتر طریقے اپنائے اور زراعت کو ترقی دی۔ ان مؤرخین کے مطابق کسانوں کی بغاوتیں دراصل مقامی سرداروں اور زمینداروں کی طرف سے اپنی آزادی اور اقتدار قائم کرنے کی کوششیں تھیں، نہ کہ مکمل عوامی ردِعمل۔ جے ایف رچرڈز نے دکن کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ جاگیروں کی کمی اصل مسئلہ نہیں تھی، بلکہ وسائل کے درست انتظام میں ناکامی اصل وجہ تھی۔ اس نظریے کے مطابق مغل سلطنت کا زوال، دراصل طاقت کے مرکز (دہلی) سے (اقتدار کی) صوبوں کی طرف منتقلی کا عمل تھا، نہ کہ ایک ہمہ گیر معاشی زوال۔

مغل سلطنت میں زرعی بحران کا مطلب یہ تھا کہ حکمران طبقہ کسانوں پر حد سے زیادہ بوجھ ڈال رہا تھا، جس سے معیشت اور سماج دونوں متاثر ہوئے۔ علی گڑھ اسکول نے اسے بنیادی اور ساختی بحران قرار دیا جبکہ نظر ثانی پسندوں نے اسے زیادہ تر سیاسی اور علاقائی تبدیلی کے طور پر دیکھا۔ درحقیقت دونوں نقطہ ہائے نظر اپنے اندر اہم نکات رکھتے ہیں۔ ایک طرف یہ حقیقت ہے کہ کسانوں پر بڑھتا ہوا بوجھ اور جاگیرداروں کا استحصالی رویہ معیشت کو کمزور کر رہا تھا، دوسری طرف یہ بھی درست ہے کہ ہندوستان کے کئی خطے اس دوران معیشت کو سہارا دے رہے تھے اور نئی ریاستوں نے طاقت کے توازن کو بدل دیا تھا۔ درحقیقت مغل سلطنت کا زوال ایک پیچیدہ عمل تھا جس میں کئی عوامل شامل تھے، مگر زرعی بحران نے اس میں اہم کردار ادا کیا۔ کسانوں کی بغاوتیں، جاگیرداروں کی لالچ اور زمین کی زرخیزی میں کمی نے سلطنت کی بنیادیں کمزور کیں۔ ساتھ ہی، مرکز کی کمزوری اور صوبائی ریاستوں کے ابھرنے نے سیاسی نقشہ بدل ڈالا۔ اس طرح زرعی بحران کو صرف معاشی یا صرف سیاسی زاویے سے دیکھنا کافی نہیں بلکہ اسے ایک ہمہ جہت مسئلہ سمجھنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی مؤرخین اس موضوع پر بحث کرتے ہیں اور مغل سلطنت کے زوال کو ایک کثیر جہتی عمل کے طور پر دیکھتے ہیں۔

2.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی میں یہ بتایا گیا کہ مغل سلطنت کی بنیاد براہِ راست زراعت اور اس سے حاصل ہونے والے محصولات پر قائم تھی۔ بابر سے لے کر اورنگ زیب تک کے دور میں سلطنت کی مالی خوشحالی کا سب سے بڑا ذریعہ زرعی محصول تھا، جو بسا اوقات پیداوار کے نصف کے قریب پہنچ جاتا تھا۔ مالگزاری کے تعین اور تشخیص کے لیے متعدد طریقے استعمال میں لائے جاتے تھے جن میں غلہ بخشی، ہست و بود، کنکوت، ضبط، نسق اور اجارہ جیسے طریقے شامل تھے۔ ان میں سے ضبط کو سب سے زیادہ مستحکم اور کامیاب سمجھا گیا، جس نے سلطنت کے لیے باقاعدہ

مالی ڈھانچہ فراہم کیا۔ اکبر اور اس کے وزیر مالیات راجہ ٹوڈر مل نے بھی مالگزاری کے نظام کو مؤثر اور منظم بنانے کے لیے کئی اصلاحات کیں۔ انہوں نے دہسالہ بندوبست اور ضبط نظام جیسے طریقوں کو اپنایا اور اسے بڑے پیمانے پر پوری سلطنت میں نافذ کیا۔ ان اصلاحات کے نتیجے میں سلطنت کو معاشی استحکام حاصل ہوا۔ ہندوستان کے موسمی مزاج اور زرخیز زمین کی مناسبت سے زرعی پیداوار میں بھی تنوع اور وسعت نمایاں تھی۔ غذائی فصلوں میں گیہوں، چاول، جو اور باجرہ بنیادی حیثیت رکھتے تھے جبکہ کپاس، نیل، گنا اور افیون جیسی نقدی فصلوں نے سلطنت کی تجارت اور صنعت کو سہارا دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ پھل، سبزیاں اور مصالحہ جات جیسے آم، انار، کیلا، ہلدی اور کالی مرچ نہ صرف گھریلو استعمال بلکہ برآمدات کے لیے بھی اہم تھے۔ اس تنوع نے ہندوستان کو دنیا کے بڑے زرعی مراکز میں نمایاں مقام دیا۔ آبی وسائل زیادہ تر کنوؤں، تالابوں اور نہروں پر مبنی تھے اور اس میں بہتری لانے کے لیے مسلسل کوششیں کی جاتی تھیں۔ اگرچہ مغل دور میں زرعی تکنیک جدید سطح پر نہ پہنچی، تاہم مقامی کسانوں نے کھاد، فصلوں کی گردش اور آبپاشی کے مختلف طریقوں سے زمین کی زرخیزی کو برقرار رکھا۔

سترہویں صدی کے آخر اور اٹھارہویں صدی کے آغاز تک یہ مضبوط زرعی ڈھانچہ دباؤ کا شکار ہونے لگا۔ بڑھتی ہوئی محصولی شرح، جاگیرداروں کا استحصالی رویہ، اور مسلسل جنگوں نے کسانوں کو کمر توڑ بوجھ تلے دبا دیا۔ جاگیردار چونکہ جاگیروں کے مستقل مالک نہ تھے، اس لیے انہوں نے مختصر مدت میں زیادہ سے زیادہ نچوڑنے کی پالیسی اپنائی، جس سے کسان زمینیں چھوڑنے یا بغاوت پر مجبور ہوئے۔ جاٹوں، ستنامیوں اور سکھوں کی بغاوتیں اسی پس منظر کا نتیجہ تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ قحط، سیلاب اور ٹڈیوں کی یلغار نے زرعی بحران کو اور زیادہ سنگین بنا دیا۔ تاریخی نقطہ نظر سے یہ بحث اہم ہے کہ زرعی بحران کو کس طرح سمجھا جائے۔ علی گڑھ اسکول کے مورخین، خاص طور پر عرفان حبیب اور ستیش چندر نے اسے "ساختیاتی بحران" قرار دیا، یعنی یہ بحران مغل انتظامیہ کے اندرونی تضادات اور جاگیرداری نظام کی خامیوں کا لازمی نتیجہ تھا۔ ان کے مطابق کسانوں پر بڑھتا ہوا بوجھ اور جاگیرداروں کا لالچ، سلطنت کی معیشت کو کھوکھلا کر رہا تھا۔ دوسری طرف نظر ثانی پسند مورخین جیسے مظفر عالم اور جے ایف رچرڈز نے اس دور کو مکمل تباہی کے بجائے سیاسی تنظیم نو کا زمانہ قرار دیا۔ ان کے مطابق صوبائی ریاستوں (اودھ، بنگال، حیدرآباد وغیرہ) کے ابھرنے سے مقامی معیشت کو سہارا ملا اور کسانوں کی بغاوتیں محض طبقاتی نہیں بلکہ سیاسی تبدیلی کا حصہ تھیں۔ اس طرح یہ اکائی واضح کرتی ہے کہ مغل سلطنت کی طاقت اور زوال دونوں زراعت سے جڑے ہوئے تھے۔ زراعت نے سلطنت کو معاشی بنیاد فراہم کی، لیکن یہی شعبہ جب دباؤ اور بحران کا شکار ہوا تو اس کے اثرات سلطنت کے سیاسی اور سماجی ڈھانچے تک پہنچے، اور بالآخر مغل اقتدار کے زوال میں ایک بنیادی کردار ادا کیا۔

2.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

2.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. مغل سلطنت کی سب سے زیادہ آمدنی کس شعبے سے حاصل ہوتی تھی؟

(a) تجارت　(b) زراعت

(c) صنعت (d) محصول تجارت

2. زرعی محصول کے تعین کے مشہور طریقے کون سے تھے؟

(a) غلہ بخشی، ہست و بود، ضبط (b) اجارہ، بندوبستِ زمین، صنعت

(c) جاگیرداری، منصبداری، فوجداری (d) صرف ضبط

3. طریقہ 'کنکوت' کو اور کس نام سے جانا جاتا تھا؟

(a) دانہ بندی (b) غلہ بندی

(c) بٹائی (d) نسق

4. ضبطی نظام کس کے دور میں باضابطہ نافذ ہوا؟

(a) بابر (b) شیر شاہ سوری

(c) اکبر (d) اورنگ زیب

5. آئینِ اکبری کے مطابق سلطنت کی آمدنی کا کتنا فیصد زرعی محصولات سے حاصل ہوتا تھا؟

(a) 50-60 فیصد (b) 60-70 فیصد

(c) 70-80 فیصد (d) 80-90 فیصد

6. سترہویں صدی میں سب سے زیادہ اُگائی جانے والی نقد فصل کون سی تھی؟

(a) کپاس (b) گنا

(c) نیل (d) افیون

7. جنوبی ہندوستان میں چاول کی کاشت کے دو اہم موسم کون سے تھے؟

(a) خریف اور ربیع (b) کدپاہ کار اور سامب پشنم

(c) بہاری اور پنجابی (d) دھان اور گیہوں

8. عرفان حبیب کے مطابق مغلیہ دور میں زرعی بحران کی بنیادی وجہ کیا تھی؟

(a) قدرتی آفات (b) جاگیرداروں کا استحصالی رویہ

(c) زرعی ٹیکنالوجی کی کمی (d) تجارت میں زوال

9. سترہویں صدی میں جاٹوں اور ستنامیوں کی بغاوت کس کے خلاف تھی؟

(a) کسانوں کے خلاف (b) جاگیرداروں اور مغل ریاست کے خلاف

(c) غیر ملکی تاجروں کے خلاف (d) مقامی زمینداروں کے خلاف

10. زرعی بحران کے بارے میں علی گڑھ اسکول کا مؤقف کیا تھا؟

(a) یہ سیاسی بحران تھا
(b) یہ ساختیاتی بحران تھا
(c) یہ فوجی بحران تھا
(d) یہ تجارتی بحران تھا

جوابات	1	2	3	4	5	6	7	8	9	10
	b	a	a	a	a	b	b	b	d	a

2.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. مغل دور میں مالگزاری کی تشخیص کے "بطی" نظام کی بنیادی خصوصیات کیا تھیں؟
2. "غلہ بخشی" اور "کنکوت" کے طریقوں میں کیا بنیادی فرق تھا؟ مختصراً وضاحت کریں۔
3. سترہویں صدی میں مغل ہندوستان میں اگائی جانے والی چار اہم نقدی فصلوں کے نام اور ان کی اہمیت بیان کریں۔
4. مغل دور حکومت میں آبپاشی کے لیے استعمال ہونے والے کم از کم تین ذرائع کون سے تھے؟
5. عرفان حبیب کے مطابق مغل سلطنت میں زرعی بحران کی سب سے بڑی وجہ کیا تھی۔

2.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. مغل ہندوستان میں زرعی پیداوار کا تفصیلی جائزہ پیش کریں۔ اس میں غذائی فصلوں، نقدی فصلوں، اور پھلوں اور سبزیوں کی پیداوار پر روشنی ڈالیں۔
2. مغل سلطنت میں مالگزاری کی تشخیص اور وصولی کے مختلف طریقوں (غلہ بخشی، کنکوت، ضبط، اور اجارہ) کا تنقیدی جائزہ لیں اور بتائیں کہ ان میں سے کون سا طریقہ سلطنت کے لیے سب سے زیادہ مؤثر ثابت ہوا۔
3. مغل سلطنت کے زرعی بحران کے اسباب اور نتائج پر تفصیلی بحث کریں۔ اس ضمن میں علی گڑھ اسکول اور نظر ثانی پسند مورخین کے نقطہ نظر کا موازنہ بھی پیش کریں۔

اکائی 3: مغل دور میں صنعت اور فنکاری، ملکی اور غیر ملکی تجارت، مالیاتی نظام

(Industry and Artistry in Mughal Era, Inland and Foreign Trade, Monetary System)

اکائی کے اجزا:

3.0 تمہید(Introduction)

3.1 مقاصد(Objectives)

3.2 زرعی صنعتیں(Agrarian Industries)

3.3 معدنیات کی صنعت(Minerals Industry)

3.4 دھاتوں کی صنعت ودستکاری(Metal Industry and Crafts)

3.5 لکڑی، کاغذ اور چمڑے کی صنعت(The Wood, Paper and Leather Industry)

3.6 متفرق صنعتیں(Miscellaneous Industries)

3.7 مغل دور میں تجارت(Trade in Mughal India)

3.8 مغل دور کا مالیاتی نظام(Monetary System of Mughal India)

3.9 اختتام(Conclusion)

3.10 اکتسابی نتائج(Learning Outcomes)

3.11 نمونہ امتحانی سوالات(Model Examination Questions)

3.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات(Objective Answer Type Questions)

3.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات(Short Answer Type Questions)

3.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات(Long Answer Type Questions)

3.0 تمہید (Introduction)

مغلیہ دور برصغیر کی تاریخ کا وہ سنہرا باب ہے جو نہ صرف سیاسی استحکام اور تہذیبی عروج کے حوالے سے یادگار ہے بلکہ اپنی معاشی خوش حالی، صنعت و حرفت کی ترقی اور تجارتی سرگرمیوں کے باعث بھی ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اس عہد میں زراعت اگرچہ معیشت کی بنیاد

تھی، مگر صرف اسی تک محدود نہیں رہی بلکہ دستکاری اور چھوٹی صنعتوں نے بھی ترقی کے نئے منازل طے کیے۔ اس دور کی صنعتیں اپنی نفاست، معیار اور جدت کے باعث دنیا بھر میں مشہور ہوئیں۔ کپاس اور ریشم کے عمدہ کپڑے، سونے چاندی کے زیورات، دھات کے برتن، قالین کے خوبصورت پارچے نہ صرف برصغیر کے بازاروں کو زینت بخشتے تھے بلکہ بیرونِ ملک بھی ان کی مانگ بڑھتی جارہی تھی۔ یہ ہنر نہ صرف عوامی زندگی کی ضروریات پوری کرتے تھے بلکہ سلطنت کے مالی وسائل میں بھی خاطر خواہ اضافہ کرتے تھے۔ مغل حکمرانوں نے اندرونی اور بیرونی تجارت کے فروغ کے لیے عملی اقدامات کیے جیسے شاہراہوں اور پلوں کی تعمیر، قلعہ بند شہروں اور منظم بازاروں کا قیام، ڈاک کا نظام اور تجارتی راستوں کی حفاظت وغیرہ۔ ان سب نے اندرون ملک تجارت کو نہایت سہل اور محفوظ بنایا۔ اسی طرح دریاؤں، بندرگاہوں اور سمندری راستوں کے ذریعے برصغیر کی مصنوعات دنیا کے دور دراز خطوں تک پہنچتی رہیں۔ یورپی تاجروں کے ہندوستان تک سمندری راستے کی دریافت کے بعد ہندوستانی مصنوعات بڑی تیزی سے غیر ملکی بازاروں میں پہنچنے لگیں اور ان کی طلب میں اس قدر اضافہ ہوا کہ یورپی کمپنیاں سونے اور چاندی کے بدلے ہندوستانی مصنوعات جیسے مصالحے اور کپڑے یورپ پہنچاتے تھے۔ انہوں نے ہندوستان میں اپنی فیکٹریاں بھی قائم کیں اور ان کی حفاظت کے لیے فوج بھی رکھی۔ انہیں میں سے ایک برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی تھی جو شروع میں ہندوستان میں تجارت کو پھیلانے کے لیے ہی آئی تھی۔ بہر حال مغل دور میں یورپ، مشرقِ وسطیٰ اور جنوب مشرقی ایشیا کی منڈیاں ہندوستانی کپڑوں، مصالحہ جات اور دستکاریوں کی منتظر رہتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس دور میں ہندوستان عالمی تجارتی نقشے پر ایک نمایاں اور اہم مقام رکھتا تھا۔ اس دور میں معاشی استحکام کے لیے مالیاتی نظام کو بھی منظم کیا گیا۔ سکّہ بندی میں یکسانیت، چاندی کے روپے اور سونے کی مہروں کا رواج، اور ہنڈی جیسی پیسہ بھیجنے کی ترکیب نے دور دراز علاقوں میں لین دین کو آسان بنادیا۔ اس طرح صنعت، تجارت اور مالیاتی ڈھانچے کی ہم آہنگی نے ایک ایسا مستحکم معاشی نظام تشکیل دیا جس کی جھلک کئی صدیوں تک برصغیر کی معیشت میں دکھائی دیتی رہی۔

3.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے درج ذیل مقاصد ہیں:

- مغل ہندوستان میں مختلف اقسام کی صنعتوں اور دستکاریوں کو بیان کرنا۔
- مختلف قسم کی مصنوعات اور دستکاریوں کی تیاری میں مغل کارخانوں کے کردار کو بیان کرنا۔
- مغل دور میں تجارت کے عروج بالخصوص بیرونی تجارت کی ترقی کے بارے میں وضاحت کرنا۔
- مغل دور کے مالیاتی نظام سے واقفیت کرانا۔

3.2 زرعی صنعتیں (Agrarian Industries)

مغل ہندوستان میں زرعی صنعتیں معیشت کی بنیاد اور عوامی زندگی کا اہم جزو تھیں۔ کھیتی باڑی کے ساتھ مختلف زرعی صنعتوں نے ایک ایسا نظام تشکیل دیا جس نے نہ صرف مقامی ضروریات کو پورا کیا بلکہ اندرونی اور بیرونی تجارت کو بھی فروغ دیا۔ کپاس کی کھیتی سے کپڑے

کی صنعت کو استحکام ملا، ریشم اور نیل کی پیداوار نے منڈیوں میں بڑی جگہ پائی، جبکہ گنے سے شکر یا چینی بنانے اور تلہن (تیل دار بیجوں) سے تیل نکالنے جیسی صنعتیں دیہی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی تھیں۔ ان صنعتوں نے نہ صرف زمینداروں اور کسانوں کے لیے آمدنی کے نئے ذرائع پیدا کیے بلکہ دستکاروں اور ہنرمندوں کو بھی روزگار کے نئے مواقع فراہم کیے۔ یوں زرعی صنعتیں محض زمین کی پیداوار تک محدود نہیں رہیں بلکہ ایک وسیع تر معاشی و سماجی ڈھانچے کی تشکیل میں اپنا کردار ادا کرتی رہیں۔ اسی سبب سے عہد وسطیٰ میں حکومت، زراعت پر مبنی صنعت و حرفت کی حوصلہ افزائی کرتی رہی۔ لیکن پیداوار کے اس طرز عمل میں سترہویں صدی اور اس کے بعد ایک تبدیلی خاص طور سے دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ تبدیلی نئی صنعتوں کے قیام اور تجارتی لین دین کے میدان میں بھی ہوئی۔ اسی صدی سے یوروپیوں کے براہ راست ہندوستان کا سمندری راستہ دریافت کرنے کے بعد ہندوستانی مصنوعات کی مانگ بیرون ممالک میں بہت زیادہ بڑھ گئی تھی جس کا اثر خاص طور پر عہدِ وسطی کے ہندوستان کی معاشی اور سماجی زندگی پر رونما ہوا۔

1. کپڑے کی صنعت (The Textile Industry)

مغل ہندوستان میں سب سے بڑی صنعت کپڑے کی تھی۔ اس صنعت کے اہم مراکز سورت، گجرات، چندیری، بُرہان پور، میسور اور صوبہ مدراس کے شمالی علاقے تھے۔ اس کے علاوہ جونپور، بنارس، بہار، اڑیسہ اور بنگال بھی اہم مراکز میں شامل تھے۔ ہم عصر مآخذ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کپڑے کی بُنائی کی صنعت خاص طور پر سوتی اور ریشمی کپڑے کی بنائی، ہندوستان کی اہم اور سب سے بڑی صنعت تھی۔ مشہور معاشی مؤرخ، تپن رائے چودھری (Tapan Rai Chaudhry) کے مطابق، سوتی ملبوسات عملی طور پر پورے ملک میں تیار کیے جاتے تھے کیونکہ ہمالیہ کے ترائی کے علاقوں کو چھوڑ کر تقریباً ہر جگہ کپاس کی کھیتی ہوتی تھی۔ بڑے پیمانے پر اس کی پیداوار سے متاثر ہو کر فرانسیسی جہازراں فرانکوئس پایرارڈ (Francois Pyrard) جس نے 1602 سے 1607 تک مالدیپ میں اپنی سرگرمیوں کی روداد لکھی تھی، نے لکھا تھا کہ "کنیا کماری سے لے کر چین تک تمام مرد اور خواتین سر سے پاؤں تک ہندوستانی لباس پہنتے ہیں۔" سترہویں صدی میں ہندوستان آنے والے ڈَچ تاجر، فرانسسکو پیلسارٹ (Francisco Pelsaert) کا بیان ہے کہ شہباز پور اور سنار گاؤں سے لے کر جگناتھ پور تک کپڑا بنائی کی صنعت ہر کسی کے لیے روزی روٹی کا بنیادی ذریعہ تھی۔ اس کے مطابق تقریباً ہر قصبہ اور شہر بُنکروں سے بھرا ہوا تھا۔ 1620 کی دہائی میں صرف مسولی پٹم میں 7000 بنکروں کی موجودگی کا ذکر ملتا ہے۔ 1640 کی دہائی میں بنکروں کی اتنی ہی تعداد کی موجودگی کا ذکر بنارس میں ملتا ہے۔

سترہویں اور اٹھارویں صدی میں بھی سوتی کپڑے کی صنعت سب سے زیادہ ترقی یافتہ تھی اور بیرون ممالک ہندوستانی سوتی کپڑے کی بہت مانگ تھی۔ ہندوستانی سوتی کپڑے کو 'کَیلکو' (Calico) کہا جاتا تھا۔ گجرات، بنگال، سندھ کے میدانی علاقے اور کورومنڈل سوتی کپڑے کی پیداوار کے اہم مراکز تھے جب کہ اُڑیسہ میں بالاسور، بنگال میں قاسم بازار اور ڈھاکہ اور جنوب ہندوستان میں بُرہان پور وغیرہ دھاگوں کی کتائی کے لیے کافی مشہور تھے۔ فرانسیسی سیاح، فرانکوئس برنیئر (Francois Bernier) کے مطابق بنگال میں کپاس اور ریشم کی پیداوار کی بہتات کی وجہ سے، اسے ہندوستان اور یوروپ کا خزانہ کہا جاتا تھا۔ ایک انگریز افسر ہنری پٹولو (Henry Patullo) کے

مطابق بنگال کی سوتی کپڑوں کی پیداوار کی صلاحیت میں کبھی بھی کمی نہیں آئے گی کیونکہ کپڑے کی پیداوار میں دنیا کا کوئی ملک اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ انگریز افسر کا یہ بیان سوتی کپڑے کی صنعت میں بہترین ٹیکنالوجی کے استعمال کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

سوتی کپڑے (Cotton Textile)

مغل دور کے ہندوستان میں سوتی کپڑوں کی مختلف اقسام اور معیار تھے۔ حمیدہ خاتوں نقوی نے مغلیہ سلطنت کے پانچ بڑے صنعتی مراکز میں تیار کیے جانے والے کپڑوں کی انتالیس اقسام کی فہرست دی ہے۔ حالانکہ یوروپین مآخذ میں سَو سے زیادہ اقسام کے ناموں کا ذکر ملتا ہے۔ یہاں سوتی کپڑوں کی تمام قسموں کی فہرست فراہم کرنا مشکل ہے، کیوں کہ ہر علاقے کی اپنی خصوصیات تھی۔ ابوالفضل کی آئین اکبری اور برطانوی فیکٹری ریکارڈ میں سوتی کپڑوں کی بے شمار قسموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ کورومنڈل کے شمالی علاقے یعنی پولیکیٹ کے شمالی علاقے میں 'سفید گُیانا' نامی کپڑے تیار کئے جاتے تھے، جس کی مانگ بحر احمر اور بحر روم کے مشرقی علاقے میں کافی تھی۔ اسی طرح جنوبی کورومنڈل خاص قسم کے لال، نیلے اور دھاری دار کپڑے کے لیے مشہور تھا۔ اورنگ آباد اور بُرہان پور سفید کپڑوں کی پیداوار کے مشہور مراکز تھے۔ جبکہ چَول کتان (لنَن) کے لیے اور کیمبے لحاف کے لیے مشہور تھا۔ ململ زیادہ تر دکن، سونار گاؤں، ست گاؤں اور ڈھاکہ میں تیار کیا جاتا تھا۔ عالمی طور پر مشہور ڈھاکہ کے مَلمَل کو 'آب رواں'، 'شبنم' اور 'گنگا جل' کہا جاتا تھا۔ جبکہ قائم خانی مَلمَل کی ایک عمدہ قسم تھی جسے بنیادی طور پر مغل حکمران طبقہ اور اشرافیہ استعمال کرتا تھا۔

ایسا کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں بننے والے سوتی کپڑوں میں سب سے مشہور 'چھینٹ' تھا جسے یوروپیں مآخذ میں چِنٹز کہا گیا ہے۔ خاص طور سے مسولیپٹم کی چھینٹ کے کپڑے ہر لحاظ سے انسانی کاریگری اور فنکارانہ مہارت کی اعلیٰ مثال تھی۔ اس کے علاوہ دہلی، لاہور، سرہند اور ناگپٹنم سوتی اور چھینٹ کپڑوں کے لیے مشہور تھے۔ آئین اکبری کے مطابق شمالی ہندوستان میں چھینٹ کی قیمت دو روپیہ فی گز تھی۔ صوبہ دہلی کے مچھیواڑہ، گجرات اور تھٹّا کا 'بافتا' اعلیٰ قسم کا سوتی ملبوس بہت مشہور تھا۔ کچھ مراکز سوتی کپڑوں کے لیے اس قدر مشہور تھے کہ کپڑے کی قسم بھی اس علاقے کے نام سے جانی جاتی تھی۔ مثال کے طور پر دریا آباد کا دریا آبادی، خیر آباد کا خیر آبادی، سَمانا کا سَمیانو، سِلہٹ کا سِلہٹی، دیوگیر کا دیوگیری، کانچی پورم کا کانچیانی، تنجاوُر کا تنجیرا ناموں سے مشہور تھے۔ 'لٹّا' نامی کپڑا زیادہ تر شمالی کورومنڈل اور شمالی ہندوستان میں تیار کیا جاتا تھا۔ پٹنہ میں تیار کردہ ''اَمَر تیز'' قسم کا سوتا کپڑا تین درجات یعنی 'موٹا'، 'ظفر خانی' اور 'جہانگیری' میں دستیاب تھا۔ سہارنپور کا 'خاصہ' اور 'چَوتَر'، بنارس کا 'گنگا جَل'، 'جھونا'، 'مِہر کُل' اور 'مَندِل' بڑے مشہور تھے۔ 'دوپٹّا' نامی کپڑا پگڑی بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ 'ڈورِیا' قمیص بنانے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ جبکہ 'سوسی' پاجامہ بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ 'سِلہَٹی' سوتی کپڑے کی سب سے اچھی قسموں میں سے ایک تھی جبکہ 'چَوتَر' اور 'سِریسَف' بہت مہنگی تھی۔ عام لوگ موٹے قسم کا 'کمین' جبکہ اشراف لوگ عمدہ قسم کے 'مہین' نامی کپڑے کا استعمال کرتے تھے۔

ریشمی کپڑے (Silk Textiles)

ہندوستان میں ریشم کو شہتوت کے کیڑے کے ذریعے تیار کیا جاتا تھا۔ ریشمی کپڑے کی صنعت، بنیادی طور پر گجرات، لاہور اور

آگرہ میں پروان چڑھی اور ان جگہوں کے زوال کے بعد کشمیر اور بنگال کے علاوہ صرف بنارس میں ہی پھلی پھولی۔ چَول ریشم بُنکروں کے لیے مشہور تھا۔ عہد وسطی کے اُڑیسہ میں بھی ریشم کی پیداوار کا ذکر آیا ہے۔ سترہویں صدی میں بنگال، ریشم کا بہت بڑا صنعتی مرکز بن گیا۔ گھوڑا گھاٹ، قاسم بازار اور باکلا، ریشم کے اہم مراکز تھے۔ فرانسیسی تاجر، جین بَیپٹسٹ ٹیورنیئر (Jean Baptiste Tavernier) کے مطابق صرف قاسم بازار سے 24 لاکھ پاؤنڈ کا ریشم برآمد کیا گیا۔ بَرنیَر کا بیان ہے کہ ڈَچ تاجروں نے قاسم بازار میں ریشم کا کارخانہ قائم کیا۔ مالدہ، ریشم اور سوتی کپڑے کی صنعت کا اہم مرکز تھا۔ ٹَیوَرنیَر کے مطابق بنگال سے کچا ریشم احمد آباد اور سورت لایا جاتا تھا، جہاں بہترین معیار کے ریشمی کپڑے تیار کیے جاتے تھے۔ ریشم کی قسموں میں 'جُوج'، 'کوٹلا' اور 'مَشرو' (کپاس اور ریشم کا مرکب) دہلی میں تیار کیا جاتا تھا۔ گجرات میں تیار ہونے والے ریشم کی اقسام میں 'پَٹولے' کی بہت زیادہ مانگ تھی۔ بھاگل پور (بہار)، 'ٹَسَر' نامی ریشم کی پیداوار کے لیے جانا جاتا تھا۔ ٹَیوَرنیَر نے آسام کو 'مونگا' ریشم کی پیداوار کے طور پر ذکر کیا ہے۔ مغل بادشاہ اکبر، کشمیر کے ریشم سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے وہاں ریشم پر ریاستی اجارہ داری قائم کر دی۔ سوتی اور ریشمی کپڑے کی صنعت کے علاوہ قالین کی بنائی کی صنعت بھی ہندوستان میں ترقی پر تھی۔ دہلی، آگرہ، بہار میں داؤد نگر اور اوبرا، لاہور، ملتان، فتح پور سیکری، مرزاپور اور جون پور قالین کی بنائی کے اہم مراکز تھے۔ اس کے علاوہ جنوبی ہندوستان میں وارنگل اور مسولی پٹنم قالین کی بُنائی کے لیے مشہور تھے۔ اکبر نے شاہی کارخانے میں ایرانی قسم کے قالینوں کے بعد ریشمی قالینوں کی صنعت میں خصوصی دلچسپی لی۔ جب کہ شاہجہاں کے دور میں کشمیر اور لاہور قالین بُنائی کے اہم مراکز کے طور پر ابھرے۔

اُونی کپڑے (Wollen Textiles)

مغل دور میں اُون بھی ایک اہم خام مال تھا جس کا استعمال کپڑے بنانے کے لیے کیا جاتا تھا۔ لیکن ہم عصر مآخذ میں اون سے تیار کردہ مصنوعات کے بارے میں زیادہ ذکر نہیں ملتا۔ اگرچہ ابوالفضل نے اُونی کمبل کا ذکر کیا ہے، لیکن تمام دستیاب حوالوں سے صرف شال اور قالین کے بارے میں ہی علم ہوتا ہے۔ اونی صنعت میں سب سے مشہور کشمیر کی شال تھی جو پوری دنیا میں برآمد کی جاتی تھی۔ فرانسیسی سیاح، بَرنیر نے شال کا ذکر کشمیر کی سب سے اہم صنعت کے طور پر کیا ہے۔ حالانکہ کشمیری شال میں استعمال ہونے والا باریک اُون تبّت سے لایا جاتا تھا۔ اگرچہ بادشاہ اکبر نے لاہور میں اون کی صنعت کو فروغ دیا لیکن لاہور میں تیار کردہ شال کشمیری شالوں کے معیار سے مختلف تھی۔ کشمیری شالوں کو تیار کرنے کی کوشش شمالی ہندوستان کے کئی شہروں، جیسے پٹنہ، آگرہ اور لاہور میں کی گئی لیکن کامیابی نہیں ملی۔ اس عہد میں اعلیٰ طبقے کے لیے عمدہ قسم کے اونی کپڑے عام طور سے یوروپی تاجروں کے ذریعے فراہم کیے جاتے تھے جب کہ کمبل تقریباً پورے شمالی ہندوستان میں اُون سے تیار کیے جاتے تھے۔ دوسرے ملبوسات میں کپاس کی دَری، ریشم اور اون کے قالین، خیمے اور لحاف وغیرہ شامل تھے۔ ان تمام اشیا میں قالین کی بُنائی، اونی صنعت کی ایک اہم شاخ تھی۔ فرانس کے مرسیلے (Marseille) شہر میں اونی کپڑے کی صنعت کی ترقی کے بعد ہندوستانی کشمیری شالوں کی مانگ میں کمی آئی۔

.2 **نیل کی صنعت** (Indigo Industry)

زراعت پر مبنی صنعت میں نیل کی صنعت بھی کافی مشہور تھی۔ کپڑوں کی رنگائی میں اس کا استعمال ہوتا تھا۔ اس کی مانگ نہ صرف

ہندوستان میں تھی بلکہ اسے بیرونی ملکوں کو بھی بڑے پیمانے پر برآمد کیا جاتا تھا، کیونکہ یوروپ میں اب تک مصنوعی رنگائی ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ لہٰذا سوتی کپڑوں کی رنگائی کے لیے یوروپ میں نیل کی مانگ بہت بڑھ گئی تھی۔ مغل دور میں نیل سب سے اہم نقدی فصلوں میں سے ایک تھی۔ اس کی کھیتی اَلوَر (میوات)، بَیانا (آگرہ کے قریب ایک مقام)، سَہون (سندھ)، تلنگانہ اور احمد آباد کے سَر کھیج کے علاقوں میں بڑے پیمانے پر کی جاتی تھی۔ حالانکہ موٹے قسم کی نیل پورے ہندوستان میں اُگائی جاتی تھی۔ کورومنڈل کے ساحلی علاقے سے متصل ناگلیوانچ (Nagulavancha) نامی گاؤں، جو موجودہ دور میں تلنگانہ کے کھمام ضلع میں واقع ہے، نیل کی پیداوار کا ایک اہم مرکز تھا۔ سترہویں صدی میں یہ علاقہ گولکنڈہ سلطنت کا حصہ تھا اور یہاں ولندیزیوں (ڈچ) نے اپنی ایک فیکٹری بھی قائم کی تھی۔

کورومنڈل کے جنوبی علاقے میں کمتر معیار کی نیل تیار کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ بیجاپور کے دابھول اور وینگورلا میں بھی تیار کی جاتی تھی۔ سترہویں صدی کے انگریز تاجر، پیٹر مُنڈی (Peter Mundy) نے ذکر کیا ہے کہ راجستھان کے علاقے میڑتا میں بھی نیل کی کھیتی ہوتی تھی۔ جہانگیر کے ہم عصر، پیلسارٹ (Pelsaert) نے بَیانا میں نیل کی کاشت کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، جس میں اس نے نیل نکالنے کے عمل کو بھی بیان کیا ہے۔ پودے سے نیل نکالنے کا عمل کافی آسان تھا۔ سب سے پہلے پودھوں کی ڈنٹھلیاں پانی میں ڈالی جاتی تھیں۔ ڈائی پانی میں گھُل جانے کے بعد پانی کو ایک دوسرے ٹب میں پلٹ دیا جاتا تھا، جہاں ڈائی کے ٹب کے نچلے حصے میں بیٹھنے کا انتظار کیا جاتا تھا۔ اس عمل کے بعد اسے کیک کی شکل میں خشک کیا جاتا تھا۔ نیل نکالنے کا یہ طریقہ زیادہ تر گاؤں میں کسان کیا کرتے تھے۔

3. کپڑوں کی رنگائی اور چھپائی (Dyeing and Printing of Textiles)

مغل ہندوستان میں سوتی کپڑے کی صنعت کی وجہ سے آزادانہ طور پر کپڑوں کی رنگائی اور چھپائی کی صنعت کی بھی خوب ترقی ہوئی۔ رنگائی چھپائی کی کاریگری اور فن کے بارے میں آئینِ اکبری میں بہت کم تفصیلات ملتی ہیں، جب کہ اس فن سے متعلق اٹھارویں صدی کی کتابوں، جیسے منشی ٹیک چند بہار کی کتاب، 'بہارِ عجم' میں تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ اس کے علاوہ آنند رام مخلص کی کتاب 'مرآۃ الاصطلاح' میں رنگائی کے لیے دہلی میں استعمال ہونے والا بندھنا طریقے کا بھی ذکر ملتا ہے۔ رنگائی کے اس طریقہ کار میں کپڑے کے کچھ حصے کو باندھ کر رنگا جاتا تھا۔ اس طریقہ کار کو 'باندھنا' یا 'گلبدن' کہا جاتا تھا۔ مغل دور میں احمد آباد چھپے ہوئے رنگین سوتی کپڑوں کے لیے مشہور تھا۔ دکن میں برہان پور کپڑے پر چھپائی اور مصوری کا ایک اہم مرکز تھا۔ اسی فن کے لیے احمد آباد کے نزدیک محمود آباد اور جنوب کے مسولی پٹنم بھی مشہور تھے۔ شمالی ہندوستان میں پٹنہ، بنارس، لاہور، ملتان، الہ آباد، دریا آباد، خیر آباد بھی چھپے ہوئے رنگین کپڑوں کے اہم مراکز تھے۔ رنگین کپڑوں پر اصلی یا نقلی سونے چاندی کے بیل بوٹوں اور پتیوں کی چھپائی کے لیے لکھنؤ اور فرخ آباد خاص طور سے مشہور تھے۔ اس کے علاوہ تن زیب یا چکن کی کاریگری کے لیے مَلمَل جیسے پتلے کپڑے پر بھی قسم قسم کے بیل بوٹے چھاپے جاتے تھے۔ چھپائی عام طور سے لکڑی کے ٹھپّوں سے کی جاتی تھی۔ منشی ٹیک چند بہار نے اس طریقہ کار کو 'کالِب' کہا ہے۔

4. شکر کی صنعت (Sugar Industry)

آج کی طرح مغل ہندوستان میں بھی گنے کی کھیتی بڑے پیمانے پر کی جاتی تھی، جس سے پورے ملک لیے شکر تیار کی جاتی تھی۔ شکر

شہری صنعت نہ ہو کر بنیادی طور پر دیہی صنعت تھی لیکن اس کا استعمال شہری علاقوں میں خاص طور سے تجارت کے لیے بڑے پیمانے پر کیا جاتا تھا۔ گنّے کی کھیتی شمالی ہندوستان کے تقریباً تمام علاقوں میں بڑے پیمانے پر کی جاتی تھی، اسی لیے آئینِ اکبری میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ ابوالفضل نے گنّے سے تیار شدہ چینی کی تین قسموں کا ذکر کیا ہے۔ گڑ، باریک دانے والی سفید شکر اور موٹی ڈلی جس کو مسری کہا جاتا تھا، جو ملک کے کئی حصوں میں تیار کی جاتی تھی۔ سستی چینی پیدا کرنے میں بنگال کا نمایاں مقام تھا۔ گُڑ ان تمام علاقوں میں تیار کیا جاتا تھا جہاں گنّے کی کھیتی ہوتی تھی اور اس کا استعمال مقامی طور پر کیا جاتا تھا۔ حالانکہ باریک دانے والی سفید شکر اور مسری، بنگال، اُڑیسہ، احمد آباد، لاہور، ملتان اور شمالی ہندوستان کے کچھ علاقوں میں تیار کی جاتی تھی۔ لال یا بھورے رنگ کی شکر کے لیے احمد آباد مشہور تھا، جب کہ قیمتی مسری کی پیداوار لاہور کے آس پاس کے علاقوں میں ہوتی تھی۔ سترہویں صدی میں ہندوستان آنے والے دو سیاح، رِچَرڈ اِسٹیل (Richard Steel) اور جان کراتھَر (John Crowther) کا بیان ہے کہ "آگرہ اور لاہور کے درمیان تمام علاقوں میں بڑے پیمانے پر بھورا (پاؤڈر شکر) تیار کیا جاتا تھا۔" سرکار (مغل دور میں ضلع کے مماثل) حصار فیروزہ میں اعلیٰ معیار کی شکر بنائی جاتی تھی۔ ابوالفضل نے پاؤڈر شکر کی قیمت فی مَن تقریباً 128 دام جب کہ مسری کی قیمت فی مَن 220 دام بتائی ہے۔ شکر کی بڑے پیمانے پر پیداوار کا اندازہ غیر ملکوں کو شکر کی برآمد سے بھی لگایا جاسکتا تھا، مثلاً ہالینڈ، ہندوستان سے شکر درآمد کرنے والا ایک بڑا ملک تھا۔ 1630 میں صرف بنگال سے 300000 سے 350000 پاؤنڈ شکر فارس کو سالانہ برآمد کی گئی تھی۔ سترہویں صدی میں دکن کے بارے میں لکھتے ہوئے، تھیونوٹ (Thévenot) نے کہا تھا کہ ہر کسان جو گنّے کی کھیتی کرتا تھا اس کی اپنی بھٹّی تھی۔ گنّے سے شکر نکالنے کے لیے کولہو کا استعمال کیا جاتا تھا جس میں انسانی یا حیوانی طاقت کا استعمال کیا جاتا تھا۔ جب کہ گُڑ کو کڑھائی یا کھلی بھٹّی میں ابال کر تیار کیا جاتا تھا۔ ابالنے کے عمل کے دوران ہی مختلف قسم اور معیار کا شکر اور گُڑ حاصل کیا جاتا تھا۔

5. تیل کی صنعت (Oil Industry)

تیل نکالنے کی صنعت میں بھی زیادہ تر گاؤں کے لوگ شامل تھے۔ تیل نکالنے کے لیے گنّے کی طرح دستی یا جانوروں سے چلنے والی مشینوں (کولہو) کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اس پیشے سے منسلک ایک خاص ذات تھی جسے تیلی کہا جاتا تھا۔ تیل نکالنے کے بعد بچا کھچا (کھلی) جانوروں کے کھانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ عہدِ وسطیٰ میں تیل نکالنے کی صنعت بھی گُڑ کی صنعت کی طرح تجارتی حیثیت تک پہنچ گئی تھی۔ لاہور میں تیل نکالنے کا پیشہ کو اپنانے والوں کے لیے الگ محلہ تھا۔ تیل کا استعمال چراغ جلانے کے لیے کیا جاتا تھا۔ چراغ جلانے کی اہمیت اس قدر تھی کہ مغل بادشاہ، مسجدوں اور مندروں میں چراغ جلانے کے لیے مدد معاش دیا کرتے تھے۔

3.3 معدنیات کی صنعت (Minerals Industry)

سولہویں اور سترہویں صدی کے ہندوستان میں بہت گہری کان کنی نہیں کی جاتی تھی، لیکن معدنیات کے حصول کے لیے سطحی کان کنی ہوتی تھی۔ مؤرخین کے مطابق ہندوستانی معیشت کے شعبوں میں سے ایک ذیلی شعبہ معدنیات کی صنعت تھی۔ برطانوی معاشی مؤرخ، ڈبلیو۔ ایچ۔ مورلینڈ (W.H. Moreland) نے اس شعبے کے غیر ترقی یافتہ ہونے کی وجہ، کافی حد تک معدنیات کے وسائل کا ناکافی ہونا بتایا

ہے۔ اس کے علاوہ گہری کان کنی کی تکنیکوں سے ناواقفیت بھی معدنیات کی صنعت میں پچھڑے پن کی ایک وجہ رہی ہوگی۔ عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان میں نمک، شورہ، امونیا نمک، گندھک اور سُہاگہ اہم معدنیات تھے۔ سُہاگہ شمالی بہار کے پہاڑی علاقوں سے حاصل کیا جاتا تھا، جب کہ تھانیسر، امونیا نمک کے لیے جانا جاتا تھا۔ حالانکہ گندھک ہر جگہ سے حاصل کیا جاتا تھا اور اس سے وابستہ گھریلو اور دیہی صنعتیں کافی ترقی یافتہ تھیں اور عوام کی ضرورتوں کو بخوبی پورا کرنے کی استطاعت رکھتی تھیں۔

1. **نمک** (Salt)

نمک پیدا کرنے والے دو اہم علاقوں میں صوبہ اجمیر میں سانبھر جھیل اور لاہور میں شمس آباد تھے۔ ان دونوں جگہوں سے ہندوستان کے دیگر تمام حصوں میں نمک کی بڑے پیمانے پر اندرونی تجارت ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ راجستھان کے ڈِڈوانہ اور مارواڑ کے پچپدرا میں کھروال (Kharwal) برادری کے لوگ نمک کی پیداوار کے پیشے سے منسلک تھے۔ برطانوی رپورٹس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہاں پچپدرا جھیل سے دھوپ میں سکھا کر نمک بنایا جاتا تھا۔ مغربی راجستھان میں نمک نکالنے کے لیے دو طریقہ کار استعمال کیے جاتے تھے۔ پہلے طریقے میں گڈھا کھود کر نمک نکالا جاتا تھا جب کہ دوسرے طریقے میں زمین کے ایک حصے پر پانی پھیلا کر نمک حاصل کیا جاتا تھا۔ نمک کی تجارت میں دو برادری بنجارے اور بنیے شامل تھے۔ نمک کو بنجارے مقامی بنیوں کے ذریعے، مارواڑ سے پنجاب اور مختلف علاقوں میں پہنچاتے تھے۔ ابوالفضل نے بھی ان بنجاروں کا ذکر کیا ہے جو نمک کو بہار لاتے تھے۔ بی۔ ایل۔ بھدانی کے مطابق 1660 کی دہائی میں راجستھان میں نمک کارکنوں کی تعداد تقریباً2922یا2956 تھی جو 1891 میں گھٹ کر 828 رہ گئی تھی۔ سالانہ آگرہ سے بنگال تک نمک کی ایک بڑی مقدار (تقریباً10000 ٹن) کی تجارت ہوتی تھی۔ گجرات کے ساحل پر موجود مقبول آباد، سرکار بھروچ، نمک کی پیداوار کے اہم مراکز تھے۔ کھمبھات اور سورت میں تبخیر (Evaporation) کے ذریعے کھارے پانی سے نمک تیار کیا جاتا تھا۔ کشمیر جیسے دور دراز علاقوں میں بھی نمک، یہیں سے جاتا تھا۔ سجان رائے بھنڈاری نے اپنی کتاب خلاصۃ التواریخ میں نمک کی کانوں کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح جنوبی ہندوستان میں بھی نمک تیار کیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر کونکن کا علاقہ بھی نمک کی پیداوار کے لیے جانا جاتا تھا۔ چین، پَنویل، نگوتھن، ریودَندا اور تھانے نمک کی پیداوار کے مشہور مراکز تھے۔ ان علاقوں میں کسان ہی مقامی سطح پر نمک تیار کرتے تھے۔

2. **شورہ** (Saltpetre)

شورہ، معدنیات میں ایک اہم صنعت تھی جس کی یوروپ میں بہت زیادہ مانگ تھی۔ قرون وسطیٰ میں شورے کو بارود اور پانی کو ٹھنڈا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کی زیادہ قیمت ہونے کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پانی ٹھنڈا کرنے کے لیے یہ عام لوگوں کے لیے دستیاب نہیں تھا۔ بہار کے شورے کو بارود کے لیے بہترین سمجھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ بہار میں پٹنہ اور سارن اس کی پیداوار کے اہم مراکز تھے۔ احمد آباد اور آگرہ، اس کی پیداوار کے دوسرے اہم مراکز تھے۔ اسی طرح احمد آباد سرکار میں چالا بابرہ اور نَاپور کے مقامات شورے کی پیداوار کے اہم مراکز تھے۔ مغربی راجستھان میں یہ ریاستی سطح پر استعمال ہونے والی چیز تھی۔ راجستھان کا جالور اس کا ایک اہم مرکز تھا۔ پیلسارٹ نے اس کے نکالنے کے عمل کو تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ زمین میں پائے جانے والے نمک سے شورہ نکالنا بہت ہی آسان

تھا۔ زمین پر اُتھلے ذخائر بنائے جاتے اور نمکین مٹی کو پانی میں ملا دیا جاتا تھا۔ نمک پانی میں مل جانے کے بعد بچا ہوا مواد نیچے بیٹھ جاتا تھا۔ اسی نمکین پانی کو بڑے برتن میں ابالنے کے دوران پانی بھاپ بن کر اُڑ جاتا اور شورہ تیار ہو جاتا۔ شورہ بنانے کے لیے ہندوستانی کاریگر زیادہ تر مٹّی کے برتن کا استعمال کرتے تھے جب کہ یوروپی، تامبے اور لوہے کا برتن استعمال کرتے تھے۔ ٹیورنیئر کا بیان ہے کہ وہ ہالینڈ سے درآمد شدہ برتن میں پانی ابالتے تھے۔ ایک ماٰخذ کے مطابق تو سال 1688 میں تقریباً دولاکھ من کچے شورے کی پیداوار صرف بہار میں ہوئی تھی۔

3.4 دھاتوں کی صنعت و دستکاری (Metal Industry and Crafts)

1. سونا اور چاندی (Gold and Silver)

در حقیقت ہندوستان میں مختلف دھاتیں جیسے سونا، چاندی، ہیرا، جستہ، تانبا، لوہا وغیرہ پائی جاتی تھیں۔ سونے اور چاندی کے زیورات ہندوستان میں کافی مشہور تھے لیکن ان دونوں دھاتیں کی ہندوستان میں پیداوار کم ہونے کی وجہ سے انہیں بیرون ممالک سے درآمد کیا جاتا تھا۔ یوروپی سیاحوں کی طرف سے جنوب میں سونے کی پیداوار پر ان کی خاموشی اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اکبر کے دور میں میسور کی سونے کی کانوں میں کام رک گیا تھا۔ اس عہد میں کماؤں کی پہاڑیوں سے کم مقدار میں سونا حاصل کیا جاتا تھا۔ سترہویں صدی کا ایک انگریز سیاح رالف فچ بیان کرتا ہے کہ پٹنہ میں لوگ، ریت کے ذخائر کھود کر سونا نکالتے تھے۔ گنگا اور اس کے معاون ندیوں کی ریت سے بھی سونا نکالا جاتا تھا جب کہ چاندی، راجپوتانہ کے اُدے پور میں واقع زاور (Zawar) کی کانوں سے حاصل کی جاتی تھی۔ یہاں چاندی، جستے کے ساتھ خام دھات کے طور پر حاصل کی جاتی تھی۔ چاندی کے حصول میں شمالی بَرما میں واقع باڈون (Bawdwin) کی کانوں کو خاص معاشی اہمیت حاصل تھی۔ ابو الفضل نے کماؤں کی پہاڑیوں میں سونے اور چاندی کی کانوں کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ چاندی کی کانوں کے کچھ باقیات سر مور کی پہاڑیوں میں پائے جاتے تھے۔ تاہم، مغل دور میں سونا چاندی زیادہ تر تجارت کے ذریعے ہندوستان آیا۔ اس کا استعمال زیادہ تر زیورات بنانے کے لیے کیا جاتا تھا، جس کی وجہ سے زیورات کی دستکاری میں ترقی ہوئی۔ بَرنیَر کہتا ہے کہ کوئی بھی ہندوستانی زیورات کی دستکاری پر یقین نہیں کرے گا، لیکن ان اشیا کی بہترین کاریگری کسی بھی یوروپی سنار سے زیادہ بہتر تھی۔

2. ہیرے (Diamonds)

معدنیات کے پیداوار کے ضمن میں ہیروں کی پیداوار کا خاص ذکر ملتا ہے۔ عہدِ وسطی کے ہندوستان میں چھوٹا ناگپور ہیروں کے لیے جانا جاتا تھا، جس کی وجہ سے یہاں کے علاقے کوکرا (Kokrah) میں جہانگیر نے 1612 اور 1615 میں دو فوجی مہمات بھیجی تھیں۔ یہاں کے حکمراں، دُرجَن سال سے ہیروں کی شکل میں بہت بڑا مال غنیمت حاصل ہوا تھا۔ ٹَیوَرنیَر نے ضلع لوہرداگا (Lohardaga) کے سُمیل پور میں ہیروں کی کان کُنی کے بارے میں ذکر کیا ہے۔ بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت کی سب سے اہم ہیروں کی کانیں، راولکونڈہ (Ravvalakonda) میں تھیں اور گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت کی سب سے اہم ہیروں کی کانیں، کرشاندی کے کنارے کولور میں تھیں۔ دنیا کا مشہور ہیرا کوہ نور اسی کان سے ملا تھا۔ ان علاقوں میں جہاں ہیرے پائے جاتے تھے، مزدوروں کی ایک بڑی تعداد کام کرتی تھی۔ اسی لیے یہ صنعت اعلی سطحی تنظیم کی علامت تھی۔ سترہویں صدی کے دوران صرف کُلور کی کان میں 30000 سے 60000 مزدور کام

کرتے تھے۔ 1680 میں گولکُنڈا کی ہیروں کی کانوں سے 1 کروڑ 20 لاکھ روپیے کی آمدنی ہوئی تھی۔ ٹیوَرنیَر پیشے سے خود ایک جوہری تھا، اس نے گولکنڈا میں اس صنعت کی تنظیم کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ اس نے کانوں سے ہیرے نکالنے کے متعدد طریقہ کار کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

3. جستہ، تامبا اور لوہا (Zinc, Copper and Iron)

ان تینوں دھاتوں کی پیداواری صلاحیت کے متعلق موصول ہونے والے حوالوں کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ شمالی ہندوستان کی کانوں سے پیدا ہونے والی پیداوار، مقامی ضروریات کو پورا کرتی تھی۔ ریاست کو تانبے کی مسلسل فراہمی کو برقرار رکھنے میں زیادہ دلچسپی تھی کیونکہ یہ سکّے بنانے میں استعمال ہوتا تھا۔ تانبا کماؤں کی پہاڑیوں، راجستھان اور صوبہ لاہور میں واقع، سکھیت مَنڈی سے حاصل کیا جاتا تھا۔ سترہویں صدی میں راجستھان اور وسط ہندوستان میں اراولی پہاڑی کی کانوں سے تانبا حاصل کیا جاتا تھا لیکن مقامی طلب پوری نہ ہونے کی وجہ سے اسے یوروپی ممالک سے درآمد کیا جاتا تھا۔ سوجَت، ٹوڈا بھیم، بیَراٹ، سندھانہ، اُدے پور، کوٹ پُتلی اور ناگور، راجستھان میں موجود اہم تانبے کی کانیں تھیں۔ ان تمام دھاتوں میں سب سے اہم اور وسیع پیمانے پر استعمال ہونے والا لوہا تھا، جو زیادہ تر کاشتکاری کے اوزار اور فوجی ہتھیار بنانے میں استعمال ہوتا تھا۔ لوہا زیادہ تر مقامی سطح پر حاصل کیا جاتا تھا۔ یہ بنگال، کشمیر، گجرات، اجمیر، لاہور، کالنجر اور گوالیر میں تیار کیا جاتا تھا۔ لوہا زیادہ تر پہاڑی علاقوں میں پایا جاتا تھا۔ ہمالیہ (کُماؤں اور شوالِک) کے آس پاس کے پہاڑی سلسلوں میں بھی لوہے کی کانیں تھیں۔ دکن سے لوہا، ایشیا کے مشرقی اور وسطی ممالک کو برآمد کیا جاتا تھا۔ مسولی پٹنم، پیٹاپولی، پولی کٹ وغیرہ لوہے کی برآمد کے اہم مراکز تھے۔ سرکار سورت کے ساحلی چِکھلی میں بھی لوہے کی کانیں تھی۔ لوہے کی مصنوعات میں، ہندوستان کو اپنی انتہائی عمدہ قسم کی تلواروں کے لیے خاص شہرت حاصل تھی۔ کالنجَر، بنارس، لاہور، سیالکوٹ، گولکنڈہ، گجرات میں بھُج، اون اور سروہی تلوار بنانے کے لیے مشہور تھے۔ پاٹن اپنی تلواروں کے لیے بھی جانا جاتا تھا کیونکہ وہاں کے کنوؤں کے پانی کی وجہ سے لوہے کو کافی سختی ملتی تھی۔ کورِج کی مشہور تلواریں، کَچھ کے علاقے سے حاصل کردہ لوہے کو فولاد (Steel) میں تبدیل کرکے بنائی جاتی تھی۔ کماؤں اپنی تلوار اور خنجر کے لیے جانا جاتا تھا۔ اِندلوائی (نظام آباد کے نزدیک) تلواروں، خنجروں اور نیزوں کے بنانے کا ایک اہم مرکز تھا۔ یہاں زیادہ تر کالا گھاٹ پہاڑیوں سے حاصل شدہ خام لوہا استعمال ہوتا تھا۔ احمد آباد اپنی اسلحہ سازی کے لیے مشہور تھا۔ بھروچ، سورت، نَوساری، گندیوی، دَمَن میں جہاز سازی کی صنعت نے ترقی کی، یقیناً یہ ترقی گجرات میں پیدا ہونے والے لوہے کی وجہ سے تھی۔ میواڑ اور سیالکوٹ میں توڑے دار بندوق تیار کی جاتی تھی۔

3.5 لکڑی، کاغذ اور چمڑے کی صنعت (The Wood, Paper and Leather Industry)

1. لکڑی

لکڑی کی صنعت نے بڑے پیمانے پر مختلف قسم کی دستکاری کی بنیاد رکھی۔ اس سے بنائے جانے والے سامان میں پالکی اور بیل گاڑی قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں سامان مختلف انداز سے بنائے جاتے تھے جسے امیر طبقے کے لوگ استعمال کرتے تھے۔ انہیں تراش کر نقش و نگاری کے ذریعے سجایا بھی جاتا تھا۔ لکڑی کا استعمال بڑے پیمانے پر کشتی اور سمندری جہازوں کو بنانے کے لیے کیا جاتا تھا۔ اس کی ضرورت اس لیے

بھی تھی کہ ہندوستان ایک طویل ساحل رکھنے والا ملک ہے جہاں بڑی تعداد میں ندیاں بہتی ہیں۔ لہٰذا مختلف قسم کی کشتیاں بنائی جاتی تھی۔ تفریحی سفر کے لیے چھوٹی کشتیوں سے لے کر سامان کی ڈھلائی کے لیے بڑے سمندری جہاز بنائے جاتے تھے۔ بحر عرب میں واقع ہندوستانی بندر گاہیں جیسے ٹھٹّا، سورت، بیسین، گوا، کرانور اور کوچین کے ساتھ ساتھ خلیج بنگال کی بندر گاہیں جیسے مسولی پٹنم اس کے پڑوس میں نورس پور، ہری ہرپور، ستگاؤں اور چٹاگاؤں جہاز سازی کے اہم مراکز تھیں۔ جب یوروپی تاجروں کی تجارتی سرگرمیاں تیز ہوئیں تو وہ لوگ انہیں جگہوں پر اپنے جہاز کی مرمت کراتے تھے۔ ان لوگوں نے ہندوستانی بحری جہازوں کو مشرقی سمندری علاقوں کے لیے بہتر بنایا۔ اسی لیے وہ لوگ ہندوستان میں تیار کردہ جہاز خریدتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ سترہویں واٹھارویں صدی کے اوائل میں جہاز سازی کی صنعت کو کافی فروغ ملا۔ لکڑی کا دیگر استعمال مثلاً دروازے، کھڑکیاں، گھریلو فرنیچر، صندوق وغیرہ بنانے میں ہوتا تھا۔ کشمیر اور کرناٹک، لکڑی کی دستکاری اور فنکارانہ اشیا کے لیے مشہور تھے جب کہ کمان اور تیر سازی کے لیے ملتان، سرہند اور سورت اہم مراکز تھے۔

2. کاغذ

کاغذ کی دستکاری بھی اس عہد میں اہم صنعت تھی۔ ڈچ سفیر، جان وَان ٹُوِسٹ (Jan van Twist)، 1638 میں ذکر کرتا ہے کہ احمد آباد کو کاغذ تیار کرنے کے واسطے خام مال کے لیے مالابار پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ احمد آباد، دولت آباد، لاہور، سیالکوٹ، پٹنہ اور بہار شریف، کاغذ کی صنعت کے اہم مراکز تھے۔ احمد آباد میں کئی اقسام کے کاغذ تیار کیے جاتے تھے جسے عرب، ترکی اور ایران کو برآمد کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ کشمیر کا کاغذ بھی کافی مشہور تھا۔ شمالی ہندوستان کی کئی جگہوں پر مقامی ضروریات کے لیے کاغذ تیار کیا جاتا تھا جب کہ جنوبی ہندوستان میں کاغذ کی صنعت بہت ہی محدود تھی۔ عہد وسطی کے ہندوستان میں خاص طور سے سیالکوٹ اور سرہند میں مختلف اقسام کے کاغذ بنائے جاتے تھے۔ مانسدھی، کھَرپوری، جہانگیری اور سیالکوٹی نامی کاغذ کی قسمیں اپنے اچھے معیار کے لیے مشہور تھیں۔ اسی طرح کالپی (موجودہ فرخ آباد) کا 'مہاجال' نامی کاغذ اعلی معیار کا تھا۔ اس کے علاوہ بانسی، تُلُوت، شمی سادہ، ریشمی نامی کاغذ بھی استعمال میں تھے۔ اس کا استعمال دولت مند تاجر، مخطوطہ نگار اور بنیادی طور پر سرکاری افسران کیا کرتے تھے۔ ابتدا میں تو مغل فن تصویر سازی میں مصوری کے لیے ایرانی اور اصفہانی کاغذ کا استعمال کیا جاتا تھا، لیکن بعد میں ہندوستان میں تیار کردہ کاغذ کا استعمال کیا جانے لگا۔ ابوالفضل کے مطابق آگرہ اور لاہور کے شاہی کارخانوں میں افسران کے استعمال لیے کاغذ تیار کیا جاتا تھا۔ کاغذ اکثر ہاتھ سے بنایا جاتا تھا جو موٹے قسم کا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ اسے بانس کی چھال، پُرانے چیتھڑے اور پُرانے کاغذ کی ردّی سے بھی بنایا جاتا تھا۔

3. چمڑا

چمڑے سے زین (چمڑے کی بالٹی)، گھوڑے کی لگام، زین، چابُک اور جوتے بنائے جاتے تھے۔ چمڑے سے تیار کردہ سامان، زیادتر دہلی، لاہور، آگرہ اور ٹھٹّا جیسے شہروں میں فروخت کیے جاتے تھے۔ سرہند ترکش اور جوتے کے لیے مشہور تھا۔ سنبھل میں گینڈے کی کھال سے اعلی قسم کی ڈھالیں بنائی جاتی تھیں، جب کہ کیمبے میں کچھوئے کی کھال سے ڈھال بنائی جاتی تھی۔

3.6 متفرق صنعتیں (Miscellaneous Industries)

عہد وسطی کے ہندوستان میں دستکاریوں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ یہاں ان تمام کی تفصیلات ممکن نہیں۔ بہر حال یہ بات یقینی ہے کہ ہر علاقے کی اپنی کچھ مخصوص دستکاری تھی، جس کے لیے وہ شہر یا علاقہ مشہور تھا۔ یہاں صرف چند اہم دستکاریوں کا ذکر کیا جائے گا۔ ان میں سے پتھر کاٹنے، برتن بنانے، شیشے وغیرہ سے سامان تیار کرنے کی دستکاریاں، اہم تھیں۔ ہم عصر مآخذ میں مٹی کے برتن کی دستکاری کے بھی حوالے ملتے ہیں، جسے لوگ کھانا پکانے، پانی اور اناج وغیرہ کو ذخیرہ کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ مٹی کے برتنوں کی مانگ بہت زیادہ تھی۔ ہندوستان کے بڑے گاؤں میں کمہار ہوتے تھے جو روزانہ استعمال میں لانے والے برتن بناتے تھے۔ مٹی کے موٹے برتنوں کے علاوہ اچھے قسم کے برتن بھی بنائے جاتے تھے۔ منوچی نے مٹی کے ایسے ظروف کا ذکر کیا ہے جو شیشے سے زیادہ باریک اور کاغذ سے ہلکے ہوتے تھے۔ مارشل نے بھی ہندوستان میں عمدہ قسم کے ظروف کو دیکھا تھا۔ مٹی سے بنے ٹائلوں (کھپریل) کا استعمال گھر کی چھتوں میں کیا جاتا تھا۔ دہلی، بنارس اور چُنار مٹی کے برتن کے لیے مشہور تھے۔ پٹنہ میں تیار کردہ مٹی کے برتن اتنے اعلی معیار کے ہوتے تھے کہ کہا جاتا ہے کہ اس کی موٹائی کاغذ جیسی پتلی ہوتی تھی۔ ان تمام دستکاریوں کے علاوہ، ہندوستان کے کئی حصوں میں شیشے سے بنائے جانے والے سامان کی صنعت بھی موجود تھی۔ ان تمام مصنوعات کے علاوہ، ہندوستانی کاریگر، دیگر متفرق اشیا جیسے صابن، عطر، ہاتھی دانت، خول اور سینگ سے بنے سامان بھی بناتے تھے۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں مختلف قسم کے عطر اور صابن بنانے کے طریقہ کار کا ذکر کیا ہے۔ اسی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ فتح پور سیکری میں عطر بنانے کا شاہی کارخانہ تھا۔ اس کے علاوہ قنوج اور غازی پور عطر کی صنعت کے لیے مشہور تھے۔ سترہویں صدی میں لکھی گئی ایک کتاب، بیاض خوشبوئی (Bayaz-i Khushbu'i) میں بھی صابن اور عطر بنانے کے مختلف طریقہ کار کا ذکر کیا گیا ہے۔ کئی دستکاریاں جنگل پر منحصر تھیں مثلاً لاکھ، چوڑیاں، کھلونے، دروازے اور سرخ رنگ بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ لاکھ، بنگال، بہار، آسام، اُڑیسہ، مالوہ، گجرات، مالابار وغیرہ کے جنگلات سے حاصل کیا جاتا تھا۔ بنگال کا لاکھ بہترین سمجھا جاتا تھا، حالانکہ لاکھ سے چوڑیاں بنانے کا اہم مرکز سورت تھا۔ اس کا استعمال نقش مہر کے لیے بھی کیا جاتا تھا۔

3.7 مغل دور میں تجارت (Trade in Mughal India)

مغل سلطنت (1526-1857) دنیا کی سب سے خوش حال اور تجارتی طور پر فعال سلطنتوں میں سے ایک تھی۔ تجارت، خواہ داخلی ہو یا خارجی، زرعی اور شہری معیشت کو برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کرتی تھی۔ مغلوں نے ایک منظم انتظامیہ، وسیع تجارتی راستوں کے جال اور مستحکم مالیاتی نظام کے ذریعے تجارت کو فروغ دیا۔ اکبر کے دور میں مالیاتی نظام کو مستحکم کیا گیا، جس سے بڑے پیمانے پر تجارتی اور معاشی لین دین ممکن ہوا۔ مندرجہ ذیل میں مغل ہندوستان کی اندرونی اور بیرونی تجارت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

1. اندرونی تجارت (Inland Trade)

اندرونی تجارت، سلطنت کے وسیع رقبے اور اچھی طرح سے برقرار رکھی گئی سڑکوں اور شاہراہوں کی بدولت فروغ پائی۔ دہلی،

آگرہ، لاہور، سورت، احمد آباد اور مسولی پٹنم جیسے بڑے شہر، کاروباری سرگرمیوں کے مراکز بن گئے۔ مختلف علاقوں میں کپڑے، اناج، مصالحے، دھاتیں، قیمتی سامان اور دستکاری جیسی اشیا کا لین دین ہوتا تھا۔ تجارتی برادری میں تاجر، بینکار، اور خانہ بدوش تاجر شامل تھے، جیسے بنجارے، جو قافلوں کے ذریعے مال کی ترسیل کرتے تھے۔ مغل حکومت نے بازاروں کے نظم و نسق، تاجروں کی حفاظت، اور معقول ٹیکس کے ذریعے تجارتی سرگرمیوں کو فروغ دیا۔ دریائی تجارت بھی اہم تھی، جہاں گنگا، جمنا، اور برہم پترا جیسے دریا، تجارتی آمدورفت کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ ہندوستان کی زرخیز زمین اور متنوع پیداوار کی بدولت مختلف خطوں میں مخصوص اشیا کی بہتات تھی، جو اندرونی تجارت کے فروغ میں مددگار ثابت ہوئی۔ بنگال اپنی عمدہ ململ، ریشم اور شکر کے لیے مشہور تھا، جب کہ بہار اور مالوہ افیون اور چنے کی پیداوار کے مراکز تھے۔ گجرات اپنے اعلیٰ درجے کے کپڑے، رنگ، اور مصالحوں کے لیے جانا جاتا تھا، اور دکن عمدہ کپڑوں اور دھاتوں کی تجارت کا مرکز تھا۔ بڑے تجارتی مراکز جیسے دہلی، لاہور، آگرہ، پٹنہ، احمد آباد، اور بنگال کی بندرگاہیں، داخلی تجارت کے لیے کلیدی مقامات تھیں۔ مغل حکمرانوں نے شاہراہوں کی تعمیر، سرائیں، اور ناپ تول کے منصفانہ نظام کے ذریعے تجارتی سرگرمیوں کو فروغ دیا۔ سڑکیں، خاص طور پر گرانڈ ٹرنک روڈ، تجارتی قافلوں کے لیے اہم راستہ تھا، جو کابل سے شروع ہو کر بنگال تک جاتا تھا۔ داخلی تجارت میں زرعی اجناس، کپڑے، دھاتیں، مصالحے، اور روزمرہ کی اشیا کا لین دین شامل تھا، جس میں تاجر برادری، خاص طور پر بنیا، مارواڑی، اور مسلم تاجر سرگرم تھے۔ منڈیوں اور ہفتہ وار بازاروں میں مقامی تجارت ہوتی تھی، جب کہ بڑے شہروں میں قائم مستقل بازار سلطنت کے مختلف حصوں میں پیدا ہونے والی اشیا کی خرید و فروخت کے مراکز تھے۔ مختلف علاقوں میں مقامی سکے اور زرِ مبادلہ کے طریقے رائج تھے، جو تجارت کو مزید آسان بناتے تھے۔ مغل سلطنت کی معاشی خوش حالی اور مستحکم حکومتی پالیسیوں نے داخلی تجارت کو فروغ دیا، جو دیہی اور شہری معیشت کے درمیان ایک مضبوط ربط قائم کرتی تھی۔

2. بیرونی تجارت (External Trade)

بیرونی تجارت مغل معیشت کا ایک اہم جزو تھی۔ سلطنت نے فارس، سلطنت عثمانیہ، وسطی ایشیا، جنوب مشرقی ایشیا اور یورپ کے ساتھ مضبوط تجارتی تعلقات قائم کیے۔ اہم برآمدات میں کپڑے (خصوصاً ململ اور ریشم)، مصالحے، نیل، بارود اور دستکاریاں شامل تھے۔ جب کہ درآمدات میں وسطی ایشیا سے گھوڑے، اسلحہ، قیمتی اشیا اور یورپی تاجروں کی لائی ہوئی بڑی مقدار میں چاندی شامل تھی۔ سورت، مسولی پٹنم اور ہگلی جیسے بندرگاہی شہر سمندری تجارت کے مراکز تھے۔ پرتگیزی، ڈچ، انگریز اور فرانسیسی تاجروں نے ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں تجارتی مراکز قائم کیے، جس سے تجارت میں نمایاں اضافہ ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے یورپ اور ہندوستان کے درمیان تجارتی حجم بڑھانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

3.8 مغل دور کا مالیاتی نظام (Monetary System of Mughal India)

سکوں کا وزن اور دھات کا تناسب مقرر تھا، تاکہ سلطنت میں کسی بھی طرح کی جعل سازی، دھاندلی یا عدم اعتماد پیدا نہ ہو۔ اس یکسانیت نے سلطنت کے طول و عرض میں مالیاتی نظام کو ایک مضبوط بنیاد فراہم کی۔ اسی مقصد کے تحت مغل سلطنت میں مختلف مقامات پر

ٹکسالیں قائم کی گئی تھیں، جن میں دہلی، آگرہ، لاہور، احمد آباد، ملتان، گجرات اور بنگال کے شہر زیادہ نمایاں تھے۔ ان ٹکسالوں میں خالص دھاتوں سے سکے ڈھالے جاتے تھے، اور ان پر بادشاہ کا نام، القاب یا مذہبی عبارت کندہ ہوتی تھی، جس سے سکے کی اصل اور اس کی شاہی حیثیت واضح ہوتی تھی۔ مغلیہ سکے نہ صرف ہندوستانی بازاروں میں اعتماد کی علامت سمجھے جاتے تھے بلکہ وسطی ایشیا، ایران اور یہاں تک کہ یورپ کے تاجر بھی ان سکوں کو معیار اور ضمانت کے طور پر قبول کرتے تھے۔

مالیاتی نظام میں صرافوں (Money Changers) کا کردار نہایت اہم تھا۔ وہ نہ صرف مختلف علاقوں کے سکوں کی قدر اور معیار کی جانچ کرتے تھے بلکہ زر کی منتقلی، سرمایہ کاری اور لین دین کو بھی ممکن بناتے تھے۔ ان ہی کے ذریعے تاجر اپنے سکوں کو دوسرے علاقوں میں چلنے والے سکوں میں بدل سکتے تھے۔ اس کے علاوہ، ہنر مند اور صنعت کار بھی اپنی مصنوعات کی قیمتوں کا تعین، سکوں کی یکسانیت کے مطابق کرتے تھے جس سے منڈیوں میں قیمتوں کے استحکام میں مدد ملتی تھی۔ مالیاتی نظام میں ایک اور اہم ادارہ ہنڈی (Hundi) تھا، جو آج کے دور کے بل آف ایکسچینج (Bill of Exchange) کی مانند تھا۔ ہنڈی نے لمبے فاصلے کے تجارتی سفر اور لین دین کو نہایت محفوظ اور آسان بنا دیا۔ تاجر دور دراز کے شہروں میں نقدی لے جانے کے خطرے سے بچنے کے لیے ہنڈی استعمال کرتے تھے۔ یہ نظام مقامی اور بین الاقوامی تجارت کے استحکام کا ضامن بنا، کیونکہ اس نے سرمائے کی روانی کو محفوظ بنایا اور تجارتی سرگرمیوں میں خطرات کو کم کیا۔ یورپی تاجروں کی آمد نے مغلیہ مالیاتی نظام کو مزید وسعت بخشی۔ پرتگالی، ڈچ، انگریز اور فرانسیسی تاجروں کے ذریعے نئی دنیا (امریکہ) سے لائی جانے والی چاندی کی بڑی مقدار نے مغل معیشت میں سکوں کی گردش بڑھا دی۔ اس بہاؤ نے روپے کو مزید مستحکم کیا اور سلطنت کے اندر سرمایہ کاری، زراعت اور صنعت کو وسعت ملی۔ اس کے نتیجے میں ہندوستان ایک ایسی نقد معیشت میں ڈھل گیا جہاں زر اور سکے، معاشی سرگرمیوں کا مرکز بن گئے۔ اس نظام نے صرف تجارت کو فروغ نہیں دیا بلکہ سماجی و عوامی سطح پر بھی نمایاں اثرات مرتب کیے۔ زر کی فراوانی نے صنعتوں اور ہنر مندوں کو بڑھاوا دیا، زرعی پیداوار براہِ راست بازار سے جڑ گئی، اور محاصل کی ادائیگی بھی نقد کی صورت میں ہونے لگی۔ اس طرح جاگیرداری معیشت کے باوجود نقدی پر مبنی ایک ایسا ڈھانچہ وجود میں آیا جس نے مغلیہ سلطنت کی طاقت کو برقرار رکھا۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ مغل ہندوستان کا مالیاتی نظام محض سکوں کی ڈھلائی یا تبادلے تک محدود نہ تھا بلکہ یہ ایک ہمہ گیر اور مربوط نظام تھا، جس نے سلطنت کے اندرونی استحکام، زراعت و صنعت کی ترقی، تجارت کے فروغ اور بین الاقوامی سطح پر معاشی وقار میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ نظام اپنے دور کا ایک جدید اور مثالی مالیاتی ڈھانچہ تھا، جو نہ صرف ہندوستان بلکہ اس وقت کی دنیا کے بڑے مالیاتی نظاموں میں نمایاں مقام رکھتا تھا۔

3.9 اختتام (Conclusion)

مغلیہ سلطنت کے معاشی ڈھانچے پر اگر تحقیقی نظر ڈالی جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ اس کی بنیاد زراعت، صنعت و دستکاری، تجارت اور مالیاتی نظام کی ہم آہنگی پر قائم تھی۔ زراعت جہاں اس نظام کا بنیادی ستون تھی، وہیں اس سے وابستہ صنعتیں اور دستکاریاں ایک ایسا جال بناتی تھیں جس نے دیہی اور شہری معیشت کو نہ صرف مربوط کیا بلکہ بیرونی دنیا کے ساتھ بھی گہرے تعلقات استوار کیے۔ کپڑے کی صنعت خصوصاً سوتی اور ریشمی ملبوسات کی تیاری، اس دور کی سب سے بڑی معاشی قوت کے طور پر سامنے آتی ہے۔ ڈھاکہ کی ململ، بنگال کا ریشم،

گجرات کا چھینٹ اور دکن کے مختلف کپڑے عالمی منڈیوں میں ہندوستان کو ایک ممتاز مقام دلاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپی تاجر ہندوستان کو "دنیا کا خزانہ" قرار دیتے تھے۔ اسی طرح نیل، شکر، تیل، لکڑی، کاغذ اور چمڑے کی صنعتوں نے سلطنت کی معاشی سرگرمیوں کو وسعت دی۔ یہ صنعتیں صرف مقامی سطح تک محدود نہ رہیں بلکہ بین الاقوامی تجارت کا حصہ بن گئیں۔ جہاز سازی کی صنعت اور لکڑی کی کاریگری نے نہ صرف داخلی آمدورفت کو سہل بنایا بلکہ بیرونی تجارت کے لیے بھی مضبوط سہارا فراہم کیا۔ گولکنڈہ کے ہیروں، راجستھان کے شورے اور مختلف دھاتوں کی کان کنی نے سلطنت کو ایک وسیع صنعتی تنوع عطا کیا، جس سے نہ صرف روزمرہ کی ضروریات پوری ہوئیں بلکہ فوجی اور دفاعی تقاضے بھی پورے کیے گئے۔ تجارتی نقطہ نظر سے مغل سلطنت ایک 'عالمی منڈی' کے طور پر ابھری۔ داخلی تجارت، شاہراہوں، دریاؤں اور منظم بازاروں کے ذریعے مستحکم ہوئی جب کہ بیرونی تجارت کے لیے سورت، مسولی پٹنم اور ہگلی جیسی بندرگاہیں یورپی، عرب، ایرانی اور وسط ایشیائی تاجروں کے لیے کلیدی مراکز بن گئیں۔ یورپی کمپنیوں خصوصاً برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد نے ہندوستانی تجارت کو بین الاقوامی مالیاتی نظام سے جوڑ دیا۔ سونے اور چاندی کی مسلسل آمد نے نہ صرف نقدی کی گردش بڑھائی بلکہ سلطنت کی معیشت کو مزید توانائی بخشی۔

مالیاتی نظام اس پورے ڈھانچے کی ریڑھ کی ہڈی تھا۔ اکبر کے دور میں سکّہ بندی کی یکسانیت، روپیہ، مہر اور دام کی تقسیم اور ہنڈی کے رواج نے سلطنت کو ایک جدید مالیاتی ڈھانچہ فراہم کیا۔ اس نظام نے نہ صرف تجارتی سرگرمیوں کو منظم کیا بلکہ زراعت کو بھی نقدی معیشت سے جوڑ دیا، جس سے جاگیرداری نظام میں ایک نئی تبدیلی آئی۔ صرافوں اور منڈیوں کے استحکام نے قیمتوں کو قابو میں رکھا اور طویل فاصلے کی تجارت کو محفوظ بنایا۔ اگرچہ اٹھارویں صدی کے آغاز میں سیاسی زوال، داخلی انتشار اور یورپی سامراجی قوتوں کی بڑھتی ہوئی مسابقت نے مغل معیشت کی بالادستی کو چیلنج کیا، لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مغل سلطنت کا معاشی ڈھانچہ اپنے عہد کا ایک جدید نمونہ تھا۔ اس نے برصغیر کو عالمی تجارتی نقشے پر ایک نمایاں مقام عطا کیا اور بعد کی صدیوں میں بھی اس کی وراثت ہندوستانی معیشت پر اثرانداز ہوتی رہی۔ اس تناظر میں کہا جا سکتا ہے کہ مغلیہ عہد کی صنعت، تجارت اور مالیات نہ صرف سلطنت کی داخلی خوش حالی کا ذریعہ تھیں بلکہ انہوں نے عالمی معیشت میں ہندوستان کے کردار کو بھی نئی جہتیں عطا کیں۔

3.10 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ:

- مغل ہندوستان میں مختلف اقسام کی صنعتوں اور دستکاریوں کی معلومات حاصل ہوئی۔
- مختلف قسم کی مصنوعات اور دستکاریوں کی تیاری میں مغل کارخانوں کے کردار کی وضاحت کر سکتے ہیں۔
- مغل دور میں تجارت کے عروج بالخصوص بیرونی تجارت کی ترقی کے بارے میں بیان کر سکتے ہیں۔
- مغل دور کے مالیاتی نظام سے واقفیت حاصل کی۔

3.11 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

3.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. مغل ہندوستان میں سب سے بڑی صنعت کون سی تھی؟

(a) لکڑی کی صنعت (b) کپڑے کی صنعت

(c) کاغذ کی صنعت (d) شکر کی صنعت

2. ڈھاکہ کے مشہور ململ کو کس نام سے پکارا جاتا تھا؟

(a) کمین (b) آب رواں، شبنم، گنگا جل

(c) خاصہ (d) قائم خانی

3. نیل کی سب سے زیادہ پیداوار کہاں ہوتی تھی؟

(a) آسام (b) بیانا(آگرہ کے قریب)

(c) مالدہ (d) کشمیر

4. شورے کا سب سے بڑا مرکز کون سا علاقہ تھا؟

(a) احمد آباد (b) بہار

(c) کشمیر (d) دکن

5. کوہِ نور ہیرا کہاں سے حاصل ہوا؟

(a) کشمیر (b) کولور(گولکنڈہ)

(c) لاہور (d) چندیری

6. مغل دور میں چھوٹے لین دین کے لیے کون سا سکہ استعمال ہوتا تھا؟

(a) مہر (b) روپیہ

(c) دام (d) ہنڈی

7. مغل سلطنت کی مشہور بندرگاہی شہر کون سے تھے؟

(a) دہلی اور آگرہ (b) سورت اور مسولی پٹنم

(c) پٹنہ اور احمد آباد (d) لاہور اور بنارس

8. لکڑی کی صنعت میں سب سے زیادہ شہرت کس کام کی تھی؟

(a) کاغذ سازی (b) جہاز سازی

(c) چمڑے کی تیاری (d) قالین کی بنائی

9. مغل مالیاتی نظام میں 'ہنڈی' کس چیز کے لیے استعمال ہوتی تھی؟

(a) زیورات بنانے کے لیے (b) زمین ناپنے کے لیے

(c) بل آف ایکسچینج (رقوم کی منتقلی) کے لیے (d) کپڑے رنگنے کے لیے

10. مغل دور میں سب سے زیادہ برآمد کی جانے والی چیز کون سی تھی؟

(a) گھوڑے (b) سوتی اور ریشمی کپڑے

(c) تانبہ (d) کاغذ

جوابات	1	2	3	4	5	6	7	8	9	10
	b	b	b	b	b	c	b	b	c	b

3.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. مغل دور میں سوتی کپڑوں کے اہم مراکز کون سے تھے؟
2. نیل کی صنعت کی بیرونی تجارت میں کیا اہمیت تھی؟
3. لکڑی کی صنعت میں جہاز سازی کے مراکز کہاں کہاں واقع تھے؟
4. شورہ (Saltpetre) کس مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا تھا؟
5. مغل مالیاتی نظام میں ہنڈی (Hundi) کا کیا کردار تھا؟

3.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. مغل دور میں زرعی صنعتوں (مثلاً کپڑے، نیل اور شکر کی صنعت) کی ترقی اور ان کے معیشت پر اثرات کا تفصیلی جائزہ پیش کیجیے۔
2. مغل سلطنت کی اندرونی اور بیرونی تجارت کے ڈھانچے، اہم مراکز اور تجارتی اشیاء پر ایک جامع مضمون لکھیے۔
3. مغل مالیاتی نظام کی خصوصیات اور اس کے معاشی و سماجی اثرات پر تفصیل سے روشنی ڈالیے۔

اکائی 4: مغلیہ ہندوستان: شہری زندگی، معاشی بحران اور سرمایہ داری کا کردار

(Mughal India: Urban life, Economic Crisis and the Role of Capitalism)

اکائی کے اجزا:

4.0 تمہید(Introduction)

4.1 مقاصد(Objectives)

4.2 شہری کاری(Urbanization)

4.2.1 مغلیہ دور میں شہری کاری(Urbanization in Mughal Period)

4.3 معیارِ زندگی(Standard of Living)

4.4 مغل دور میں تکنیک(Technique in Mughal Period)

4.5 مغلیہ دور میں سرمایہ کاری(Investment in Mughal Period)

4.6 مغل دور میں سود خوری نظام(Usury System during Mughal Period)

4.7 اورنگ زیب کے بعد معاشی بحران(Economic Crisis after Aurangzeb)

4.8 اکتسابی نتائج(Learning Outcomes)

4.9 نمونہ امتحانی سوالات(Model Examination Questions)

4.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات(Objective Answer Type Questions)

4.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات(Short Answer Type Questions)

4.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات(Long Answer Type Questions)

4.0 تمہید (Introduction)

مغلوں کے دور حکومت میں شہری کاری میں بہت اضافہ ہوا۔ نئے شہر شہنشاہوں نے بسائے اور پرانے شہر ترقی یافتہ ہوئے۔ آگرہ، دہلی، فتح پور سیکری اور لاہور جیسے شہر انتظامیہ، تجارت اور ثقافت کے مراکز بن گئے۔ بابر سے لے کر اکبر اور جہانگیر کے دور میں آگرہ مرکزی دارالحکومت تھا، جبکہ شاہجہاں نے دہلی میں شاہجہان آباد کے نام سے ایک شہر قائم کیا اور اسے مغلوں کے مرکزی دارالحکومت کے طور پر ترقی دی۔ فتح پور سیکری کو اکبر نے کچھ عرصے کے لیے دارالحکومت بنایا، جو مغل فن تعمیر اور ثقافتی دولت کی علامت بنی۔ سورت، لاہور

اور ڈھاکہ جیسے شہر تجارت کے اہم مراکز تھے۔ سورت خاص طور پر مغربی ساحل پر ایک بڑی بندر گاہ تھی، جو یورپ، فارس اور افریقہ کے ساتھ تجارت میں مصروف تھی۔ مغل شہروں میں خوبصورت فن تعمیر اور وسیع بازار، مساجد، محلات اور باغات تھے۔ مغلوں کی شہری منصوبہ بندی میں مشہور چار باغ باغات اور یادگار عمارتیں شامل تھیں، جو فارسی، وسطی ایشیائی اور ہندوستانی فن تعمیر کا حسین امتزاج تھیں۔

مورخین نے مغل دور میں معیار زندگی کے مطالعے کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا طبقہ شاہی خاندانوں، اعلیٰ حکام، مقامی حکمرانوں اور بڑے جاگیر داروں پر مشتمل تھا۔ اس طبقے کی زندگی نہایت پر تعیش اور شان و شوکت سے بھرپور تھی۔ یہ لوگ عالی شان محلات میں رہتے، قیمتی لباس زیب تن کرتے، نایاب زیورات پہنتے اور فنونِ لطیفہ سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ دوسرا طبقہ، شہری متوسط طبقہ، جس میں تاجر، دست کار، ڈاکٹر، اساتذہ اور کاریگر شامل تھے، شہروں میں رہتے تھے اور ان کا معیار زندگی نسبتاً بہتر تھا۔ ان شہروں میں لوگ مختلف قسم کے سامان اور خدمات حاصل کر سکتے تھے۔ تیسرا طبقہ کسانوں اور مزدوروں کا تھا، جن میں سے زیادہ تر دیہی ہندوستانی علاقوں میں رہتے تھے اور زراعت کے کام میں مصروف رہتے۔ کسانوں کا معیارِ زندگی دیگر طبقات کے مقابلے میں نہایت پست تھا، اور وہ روزی روٹی کمانے کے لیے مسلسل جدوجہد کرتے رہتے تھے۔

مغلیہ سلطنت کے دور میں فنی و تکنیکی اعتبار سے کئی اہم ترقیات اور پیش رفت دیکھنے میں آئیں۔ مغلوں نے شاندار عمارتیں تعمیر کیں، جیسے تاج محل، لال قلعہ، اور جامع مسجد، جو فن تعمیر اور انجینئرنگ میں اپنی بہترین مہارت کا ثبوت دیتی ہیں۔ اسی طرح زرعی ٹیکنالوجی میں بھی مغلوں نے آب پاشی کے نظام کی حوصلہ افزائی کی اور زرعی پیداوار کو بہتر بنانے کے لیے فصلوں کی گردش کے نظام اور پانی کے انتظام کو فروغ دیا۔ مغل دور میں فوجی اور صنعتی ٹکنالوجی میں بھی ترقی دیکھنے کو ملتی ہے۔ مغلوں نے فوجی سامان کی تیاری میں مہارت حاصل کی، خاص طور پر توپ خانے اور قلعوں کی تعمیر۔ اسی طرح صنعتی ترقی میں دھات، ٹیکسٹائل اور دیگر صنعت نے مغل سلطنت کے معاشی نظام کو فروغ دیا۔

مغلیہ دور میں سود ایک عام رواج بن چکا تھا، جس کا اثر معاشی زندگی پر گہرا تھا۔ تاجروں، زمینداروں اور دیگر لوگوں نے کاروبار کے لیے قرض لیے، جس پر بہت زیادہ شرح سود وصول کی جاتی تھی۔ یہ سود اتنا زیادہ ہوتا تھا کہ کسانوں اور چھوٹے تاجروں کو شدید معاشی دباؤ کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اورنگ زیب کے دور میں سود کا اثر مزید بڑھ گیا کیونکہ حکومت نے اس مسئلے پر کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا۔ اورنگ زیب کے بعد مغلیہ سلطنت کمزور پڑنے لگی اور اس کی معاشی حالت بھی ابتر ہوگئی۔ اس کا سبب اس وقت کی پالیسیوں اور جنگوں کا اثر تھا۔ اورنگ زیب نے جنوبی ہندوستان میں طویل جنگیں لڑیں جن سے فوجی اخراجات میں بے پناہ اضافہ ہوا اور خزانہ خالی ہوگیا، مگر ان جنگوں سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا۔ اس کے علاوہ، اورنگ زیب نے جزیہ ٹیکس کو دوبارہ متعارف کرایا جس سے ہندو آبادی میں عدم اطمینان پیدا ہوا اور اس کا اثر تجارت اور زراعت پر پڑا۔ سلطنت کی مرکزیت کمزور ہونے کی وجہ سے سلطنت بکھرنے لگی اور اٹھارہویں صدی میں ہندوستان میں سیاسی زوال آگیا۔ کئی علاقائی ریاستوں کے عروج اور یورپی کمپنیوں کی آمد نے ہندوستانی معیشت کو مزید متاثر کیا۔ ان تمام عوامل کے نتیجے میں ہندوستانی معیشت میں کمی واقع ہوئی اور زراعت، تجارت اور صنعتوں پر منفی اثرات مرتب ہوئے۔ سود اور غیر مساوی ٹیکس پالیسی نے

غریب طبقوں پر اضافی معاشی بوجھ ڈال دیا، جس کے سبب ان کا معیارِ زندگی مزید کم ہو گیا۔

4.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ مندرجہ ذیل نکات کو سمجھنے کے قابل ہو جائیں گے:

- مغل دور میں شہری کاری کی ترقی اور اس کے اسباب اور اثرات۔
- مغل دور میں سماجی زندگی کے معیار کے بارے میں اپنی رائے قائم کر سکیں گے۔
- مغل دور میں تکنیکی پیش رفت کے بارے میں جان سکیں گے۔
- مغلیہ دور میں سرمایہ داری سے متعلق بحث کو جاننے میں مدد ملے گی۔
- ہم مغلیہ دور میں سود کے نظام کے بارے میں جانیں گے۔
- اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ دور میں آنے والے معاشی بحران اور اس کی وجوہات کے بارے میں جانیں گے۔

4.2 شہری کاری (Urbanization)

تقابلی نقطہ نظر سے شہری ترقی کا مطالعہ تعلیمی میدان کا ایک نیا شعبہ ہے۔ "شہری تاریخ" ایک آزاد مضمون نہیں ہے، یہ سماجی، معاشی اور سیاسی تاریخ کی طرح ایک الگ خود مختار ذیلی مضمون بھی نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا شعبہ ہے جس میں مورخین سماجیات، معاشیات، سیاسیات اور جغرافیہ کے سماجی علوم سے مدد لیتے ہیں۔ "شہری تاریخ" بنیادی طور پر اربنائزیشن، مخصوص ادوار میں شہری مراکز کی توسیع اور ان اسباب کا مطالعہ ہے جو ان کی ترقی اور زوال کا باعث بنتے ہیں۔ تاریخ میں "شہر" کی دو اہم خصوصیات ہیں: پہلی، ایک محدود جگہ میں آبادی کی کثافت اور دوسری، آبادی کی بنیادی طور پر غیر زرعی نوعیت۔ انسانی تاریخ میں شہروں کی ترقی کو ایک انقلاب کے طور پر دیکھا گیا ہے، جس کے ذریعے تہذیب اور تاریخ کا آغاز ہوا۔ لیکن اگر اس انقلاب کی کوئی زرعی بنیاد نہ ہوتی اور شہر دیہات کی معاشی سرگرمیوں میں معاون نہ بنتے، تو نہ یہ انقلاب رونما ہوتا اور نہ ہی ممکن تھا۔ زراعت پر مبنی معیشت میں، گاؤں اور شہر کے درمیان لازم و ملزوم رشتہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ بہت سی مثالوں میں مغل دور کے شہر دیہاتوں کی توسیع تھے–ان میں ایک ہی سماجی اتحاد اور رجحانات تھے۔

عہد وسطی کے ہندوستان کے معاشی مورخین کی تجرباتی تحقیق کی بنیاد پر شہری کاری کے بارے میں کئی نظریاتی نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ زیادہ تر رہائشیوں کی آبادی اور غیر زرعی پیشوں کی بنیاد پر "شہر" کی تعریف ممکن ہو گئی ہے۔ شہروں کا انحصار دیہات کی پیداواری سرپلس پر ہے اور یہ شہر کے صنعتی اور تجارتی عمل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ معاشرے اور تہذیب کی ترقی میں شہروں کے کردار کو شہروں اور دیہاتوں کے باہمی انحصار کے تناظر میں واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ 1950 کی دہائی میں محمد حبیب نے تیرہویں اور چودھویں صدی میں شمالی ہندوستان میں رونما ہونے والے شہری انقلاب سے متعلق ایک عمومی نظریہ پیش کیا۔ اس نظریے کے مطابق، ترکوں کی آمد سے پہلے، ہندوستان میں اعلیٰ طبقے نے قصبوں اور شہروں پر قبضہ کر رکھا تھا، جب کہ مزدور شہروں کی دیواروں سے باہر غیر محفوظ دیہاتوں اور بستیوں

میں رہتے تھے۔ ترکوں کے آنے کے بعد شہر میں کام کرنے والے مزدوروں کے خلاف کیے جانے والے تمام امتیازات مٹ گئے۔ جب ترکی حکمران شہروں میں داخل ہوئے تو ان کے ساتھ نچلی ذات کے ہندو کارکن بھی داخل ہوئے۔ صنعتی اور انتظامی کاموں کے لیے ان کی خدمات درکار تھیں۔ نئے گورننس سسٹم کے تحت شہر صنعت و تجارت کے خوش حال مراکز بن گئے۔ یہ "انقلاب" محنت کش طبقوں کی آزادی اور "پیداوار کے ناقابل تغیر عناصر" کے باوجود ان کی تعداد میں اضافے کے نتیجے میں ممکن ہوا۔ ترکی کے حکمران طبقے نے اس "انقلاب" کی حمایت کی۔ محمد حبیب کے مطابق ترکی کے سلطانوں کے دور حکومت میں پورے ملک میں جو بڑی تبدیلی آئی، اس کی جھلک دہلی شہر کی تیز رفتار ترقی سے تھی۔ حبیب نے اس رجحان کو "شہری انقلاب" کا نام دیا۔ وہ اس خیال کو تسلیم کرتے ہیں کہ شہروں کی شہری معیشت 13ویں اور 14ویں صدی کے دوران تیار ہوئی۔ "شہروں کی تعداد اور ممکنہ طور پر شہروں کے سائز میں اضافہ ہوا، اور دستکاری کی پیداوار اور تجارت میں بھی مزید اضافہ ہوا۔"

4.2.1 مغلیہ دور میں شہری کاری (Urbanization in Mughal Period)

شہروں اور شہری زندگی کو کسی ملک کی ترقی اور ثقافت کی حالت کا عکاس سمجھا جاتا ہے۔ ابوالفضل کے مطابق جو لوگ دنیاوی کاموں میں لگے ہوئے ہیں وہ شہروں میں جمع ہوں گے اور جس کے بغیر ترقی نہیں ہو سکتی۔ شہری زندگی مسلم تہذیب کی منفرد خصوصیت تھی۔ فرانسیسی مؤرخ فرنینڈس براوڈل (Fernand Braudel) اپنی مشہور کتاب تہذیب اور سرمایہ داری: 15ویں-18ویں صدی (Civilization and Capitalism: 15th-16th Century) میں لکھتے ہیں، "شہر بجلی کے ٹرانسفارمر کی طرح ہوتے ہیں۔ وہ تناؤ کو بڑھاتے ہیں، ضابطے کی تال کو تیز کرتے ہیں اور ہمیشہ انسانی زندگی میں نئی توانائی ڈالتے ہیں۔ شہر توسیع کو جنم دیتے ہیں اور وہ خود توسیع کی پیداوار ہیں۔" شہری آبادی میں اضافے کا جو عمل دہلی سلطنت کے دوران شروع ہوا وہ مغلیہ دور میں بھی جاری رہا، لیکن مغلیہ دور میں شہری کاری کے عمل کی اہمیت سلطنت دور کی شہری کاری سے غیر معمولی طور پر مختلف تھی۔

عہد وسطی کے مختلف مصنفین اور یورپی سیاحوں سے پتہ چلتا ہے کہ کچھ شہری مراکز دوبارہ تیار ہوئے، کچھ پرانے مراکز جیسے لاہور اور دہلی کی توسیع ہوئی اور بہت سے نئے شہری مراکز ابھرے، جن میں الہ آباد، فتح پور سیکری، احمد آباد، بنارس، فرید آباد، حیدرآباد، پٹنہ، خیر آباد (اودھ) اور بیانا (راجستھان) جیسے شہر قابل ذکر ہیں۔ نظام الدین احمد کی تحریر کردہ عین طبقات اکبری اور آئین اکبری جیسے ذرائع سے پتہ چلتا ہے کہ اکبر کی سلطنت میں 120 بڑے شہر اور 3200 قصبے تھے۔ ان میں جنوب کے بڑے اور چھوٹے شہر شامل نہیں تھے جن میں پرانے شہر وجے نگر، گولکنڈہ، بیجاپور، کوچین، کالی کٹ وغیرہ شامل ہیں۔ قصبہ، بلدہ، شہر اور بندر مغل دور میں مختلف قسم کے شہروں، میٹرو اور ساحلی شہروں کی نمائندگی کے لیے استعمال ہوتے رہے ہیں۔ عہد وسطی کے مورخین کی نظر میں چھوٹے شہروں اور بڑے شہروں میں واضح فرق تھا۔ شہر (فارسی) اور بلدہ (عربی) کسی بڑے شہر کو مخاطب کرنے کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ سترہویں صدی میں آگرہ سلطنت کا سب سے بڑا شہر تھا جس کی آبادی کا تخمینہ پانچ لاکھ کے لگ بھگ تھا۔ جب شہنشاہ وہاں مقیم ہوتا تو اس کی آبادی بڑھ کر 600,000 ہو جاتی تھی۔ فرانسسکو پیلسارٹ کے مطابق، آگرہ شہر ایک ایسے گاؤں سے تیار ہوا جو پہلے بیان کے دائرہ اختیار میں آتا تھا، جب تک کہ اکبر نے اسے

1556 میں اپنا دارالحکومت نہ بنالیا تھا۔ یہاں تک کہ جب سترہویں صدی کے وسط میں دارالحکومت آگرہ سے دہلی منتقل ہوا اور شاہی خاندان بھی منتقل ہو کر وہاں چلا گیا، تب بھی آگرہ ایک بڑی آبادی والا شہر بنا رہا۔

دوسرا بڑا شہر دہلی تھا جس کی آبادی اس وقت پیرس کے برابر تھی۔ شاہ جہاں نے دہلی میں ہی ایک نیا شہر شاہ جہان آباد بسایا تھا۔ شاہجہان آباد کے بارے میں برنیئر لکھتے ہیں کہ رہائش کا انداز ہندوستان کے موسمی حالات کے مطابق ہونا چاہیے۔ اس کے لیے ہوادار ہونا بہت ضروری تھا اور ساتھ ہی کھلی چھت کا ہونا بہت ضروری تھا تاکہ لوگ گرمی کے موسم میں کھلے آسمان کے نیچے سو سکیں۔ وہ مزید کہتا ہے کہ بہت کم گھر مکمل طور پر پتھر یا اینٹوں سے بنے ہوتے ہیں اور بہت سے صرف مٹی اور گھاس پھوس سے بنے ہوتے ہیں۔ پھر بھی وہ ہوادار اور خوشگوار ہیں۔ ان میں سے اکثر کے اندر صحن اور باغات ہیں، کیونکہ گھر کے اندر کافی جگہ ہے اور سامان (پلنگ، کرسیاں) بھی اچھی ہیں۔ پھوس والی چھتوں کو لمبے اور خوبصورت کھمبوں پر سہارا دیا گیا ہے اور مٹی کی دیواریں باریک چونے سے پوتی ہوئی ہیں۔ لاہور شہر کو عہد وسطیٰ کے شہروں میں بھی اہم مقام حاصل تھا۔ اکبر نے کچھ وقت کے لیے اسے اپنا صدر مقام بھی بنایا۔ ایک غیر ملکی مسافر کے مطابق ابتدائی مرحلے میں لاہور کا سائز آگرہ سے بڑا تھا۔ پٹنہ کی آبادی تقریباً 200,000 بتائی جاتی ہے۔ دیگر بڑے شہروں میں ڈھاکہ، راج محل، ٹھٹھہ، برہان پور وغیرہ بھی قابل ذکر ہیں۔

ستیش چندر نے شہروں کو ان کی نوعیت اور ساخت کی بنیاد پر چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ سب سے پہلے وہ شہر تھے جن کا بنیادی مقصد انتظامی تھا، جن میں آگرہ، دہلی، لاہور کے ساتھ ساتھ صوبائی دارالحکومتوں کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ بعد میں پونے، فیض آباد، حیدرآباد وغیرہ ایسے مراکز کے طور پر ابھرے۔ دوسری قسم، وہ شہر تھے جن میں تجارت و کاروبار اور سامان کی تیاری کا غلبہ تھا اور جن میں کچھ انتظامی کام بھی انجام دیے جاتے تھے۔ پٹنہ، احمد آباد وغیرہ ایسے شہر میں شمار تھے۔ تیسری قسم میں مقدس مقام، زیارت اور ثقافتی شہر شامل تھے جہاں کچھ تجارتی اور کاریگری کا کام بھی ہوتا تھا لیکن جہاں آنے والے زائرین کی آبادی کافی زیادہ تھی۔ بنارس، متھرا، کانچی، اجمیر وغیرہ اس زمرے میں آتے تھے۔ اجمیر ایک زیارت گاہ کے علاوہ ایک انتظامی مرکز کے طور پر بھی اہم تھا۔ شہروں کی آخری کیٹیگری وہ تھی جو اپنی مخصوص پروڈکٹ، مینوفیکچرنگ، ٹیکنالوجی یا مہارت یا خاص قسم کے مقامی اشیا کی وجہ سے پھل پھول رہے تھے۔ مثال کے طور پر راجستھان میں بیانا نیل کے لیے، گجرات میں پاٹن رنگسازی کے لیے اور خیر آباد سوتی کپڑے کے لیے مشہور تھے۔

شہروں کے علاوہ 16ویں اور 17ویں صدی میں قصبوں نے بھی ترقی کی۔ سلطنت کے دور میں جس گاؤں میں ایک قلعہ ہوتا تھا اسے قصبہ کہا جاتا تھا۔ لیکن مغلیہ دور میں جن دیہاتوں میں بازار تھا وہ قصبے کہلاتے تھے۔ اس طرح مغل دور میں قصبوں کا تصور بدل گیا۔ ضرورت سے زیادہ مالیاتی فوائد اور متحرک تجارت کاری نے شہروں کی ترقی میں اضافہ کیا۔ شہروں میں خام مال اور اشیائے خورد و نوش کی مانگ کے ساتھ ساتھ نقدی میں اضافی محصولات کی وصولی نے تجارت کو مزید فروغ دیا۔ اس کی وجہ سے درمیانے درجے اور چھوٹے شہروں کی شکل میں قصبوں کی ترقی ہوئی۔ شہروں کے درمیان فاصلے کے پیش نظر مواصلاتی نظام نے خاص کردار ادا کیا۔ مختلف علاقوں میں شہروں کے درمیان فاصلے مختلف تھے۔ بہت سی جگہوں پر جانے کے لیے مسافر گھوڑوں اور بیلوں کا استعمال کرتے تھے۔ ہمیں سرائیوں کا ذکر بھی ملتا ہے

جہاں مسافر ٹھہر سکتے تھے۔ زیادہ تر سرائے قصبوں کے اندر واقع تھیں یا وقت کے ساتھ ساتھ قصبوں نے سرائے کی شکل اختیار کر لی۔ ان شہروں کی ترقی کی بہت سی وجوہات تھی۔ فصیل والے شہر کی آبادی بڑھنے کی وجہ سے شہر سے باہر بھی لوگوں کا آباد ہونا، ایک دوسری اہم وجہ تھی، شہر کے باہر کسی مذہبی مقام کا ہونا، جس کی وجہ سے لوگ اس کے آس پاس جمع ہونے لگتے، دہلی میں نظام الدین اولیاء اور چراغ دہلوی کی بستیاں لاہور اور کشمیر گیٹ کے باہر قدم شریف کی بستیاں اسی طرح کی بستیوں میں شمار ہوتی ہیں۔ ہمایوں نے خود دین پناہ شہر کی بنیاد نظام الدین کی درگاہ کے قریب میں ڈالی تھی۔ تیسری اہم وجہ تھی امراء اور منصب داروں کے ذریعے شہر کی دیوار سے باہر مستقل ڈیرے ڈالنا، جن کے نتیجے میں، جے سنگھ پورہ، جسونت سنگھ پورہ وغیرہ جیسی بستیاں قائم ہوئی تھیں۔

ستیش چندر نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ قصبہ، گاؤں اور شہر کے درمیان قریبی باہمی تعلقات تھے۔ ان کا خیال ہے کہ قصبے زرعی پیداوار کی ترقی اور مالیاتی معیشت کی ترقی کا ایک لازمی حصہ تھے۔ ستیش چندر کے مطابق، یہ چھوٹے شہر نہ صرف زرعی پیداواروں کے لیے بازار اور فروخت کے مراکز کے طور پر کام کرتے تھے بلکہ دستکاری کے مراکز کے طور پر بھی ترقی کرتے تھے۔ عام طور پر یہ قصبہ، پرگنہ ہیڈ کوارٹر ہوتے تھے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، نظام الدین نے طبقات اکبری میں اکبر کے دور میں 3200 قصبوں اور 120 شہروں کا ذکر کیا ہے۔ ایم پی سنگھ نے اس بنیاد پر حساب لگایا ہے کہ اگر مغل دور میں ہر پرگنہ ایک قصبہ تھا تو 1647 عیسوی میں 4350 قصبے موجود تھے۔ عام طور پر، قصبے ایک بڑے گاؤں سے ایک بڑے بازار کے مرکز میں تبدیل ہوئے جہاں وقتاً فوقتاً ہفتہ وار بازار یا ہاٹ منعقد ہوتے تھے جن میں دیہی اور شہری مطالبات پورے ہوتے تھے۔

سترہویں صدی میں مختلف علاقوں میں متعین امیر اور جاگیر داروں کی سرپرستی میں بہت سے شہر قائم ہوئے، سترہویں صدی کے وسط میں روہیلہ افغان پورے روہیل کھنڈ کے علاقے میں آباد ہوئے، جس کا پورا سہرا بہادر خان کو جاتا ہے جس نے تقریباً 50 روہیلا ذیلی قبائل کو لا کر اس علاقے میں آباد کیا۔ شاہجہاں پور روہیلہ کا گڑھ بن کر ابھرا۔ رستم خان دکنی نے شہزادہ مراد کے نام پر اس علاقے میں مراد آباد شہر کی بنیاد رکھی، 1713 میں ایک نئے افغان امیر محمد خان بنگش نے فرخ آباد شہر کی بنیاد رکھی۔ اسی طرح کے بہت سے شہر مغل دور کے امیروں اور جاگیر داروں نے قائم کیے تھے جو آج بھی بڑے شہروں کی طرح پھل پھول رہے ہیں۔

مغل دور میں شہروں اور قصبوں کی تعداد، حجم اور دولت میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ ان میں سے بعض کی آبادی یورپ اور انگلینڈ کے عصری شہروں سے زیادہ تھی۔ لیکن ان کی ترقی سے روایتی گاؤں کی زندگی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ کچھ شہروں کو دوبارہ نئے طریقے سے بسایا گیا اور کچھ نئے شہر بنائے گئے۔ کچھ شہر بیوروکریٹس نے بنائے تھے اور کچھ امرا طبقے کے لوگوں نے۔ یہ سب کچھ بادشاہ کی اجازت سے ہوا۔ شہریت کی بہت سی وجوہات تھیں جیسے انتظامی، جغرافیائی، فوجی، معاشی اور مذہبی۔ مغل شہنشاہوں نے ہندوستان کے ایک بڑے حصے پر امن وامان قائم کیا جو کہ شہری کاری سمیت کسی بھی قسم کی دنیاوی ترقی کے لیے ضروری ہے۔ اس دور میں مغل بادشاہوں کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے دست کاری، صنعت اور تجارت کو بہت فروغ ملا۔ دست کاری اور تجارت کی ترقی نے بھی شہری کاری کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

4.3 معیارِ زندگی (Standard of Living)

مغل سلطنت کا معاشی، سماجی اور ثقافتی عروج 17ویں صدی کے نصف آخر میں ہوا۔ مغلیہ دور کی معاشی اور سماجی صورت حال کی خصوصیت یہ تھی کہ جہاں ایک طرف حکمران طبقہ (شاہی خاندان، بڑے سردار، خود مختار راجہ، مقامی سردار اور امیر تاجر) انتہائی شوخی کی زندگی بسر کرتے تھے تو دوسری طرف کسانوں، کاریگروں اور مزدوروں سمیت عام لوگ انتہائی غربت کی زندگی گزارتے تھے۔ جدید مورخین ایک متوسط طبقے کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ متوسط طبقے میں تاجر، کاروباری اور اہلکار شامل تھے اور ان کی حالت عام لوگوں سے بہتر تھی۔ مغل دور میں معیار زندگی کے بارے میں معلومات کا ذریعہ بنیادی طور پر 16ویں اور 17ویں صدیوں میں آنے والے غیر ملکی سیاحوں کے لکھے ہوئے بیانات ہیں۔ عہد وسطیٰ کی فارسی تحریریں بھی مغل دور کے معیار زندگی پر روشنی ڈالتی ہیں لیکن عام لوگوں کی زندگی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہمیں غیر ملکی اکاؤنٹس کا رخ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ہمیں ان یوروپی اکاؤنٹس کا بہت احتیاط سے مطالعہ کرنا چاہیے کیونکہ جہاں سے یہ آئے تھے وہاں کی ثقافت ہندوستان سے بالکل مختلف تھی، اس لیے ہندوستانی معاشرے کو دیکھنے کا ان کا نقطہ نظر بھی مختلف ہو گا۔

1. اعلی یا اشرافیہ طبقات

اعلیٰ طبقے میں شاہی خاندان، اعلیٰ منصب دار، مقامی بادشاہ، سردار اور بڑے زمیندار شامل تھے۔ مغلیہ دور میں حکمران طبقے کو سماجی اور معاشی نقطہ نظر سے خصوصی حقوق حاصل تھے۔ کہا جاتا ہے کہ امراء کے عہدے کے دروازے تمام لوگوں کے لیے کھلے تھے لیکن حقیقت میں اکثر یہ عہدہ صرف اشرافیہ کے خاندانوں کو ہی ملتا تھا۔ مغل دور میں امراء کو اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ تنخواہ ملتی تھی۔ اپنی ذاتی تنخواہ کے علاوہ، انہیں اپنے فوجیوں کو دی جانے والی تنخواہ پر بھی مراعات حاصل تھی۔ ان میں سے کچھ کاروبار کر کے اپنی آمدنی میں مزید اضافہ کر لیتے تھے۔ کچھ مالدار تاجروں کو سود پر قرض بھی دیتے تھے اور کچھ اپنا سرمایہ باغوں اور بازاروں میں لگاتے تھے۔ میر جملہ جیسے امیر کے پاس بہت سے جہاز تھے جو مغرب اور جنوب مشرق کی طرف آتے جاتے رہتے تھے۔ مورلینڈ کے مطابق سرداروں کا طرز زندگی "خرچ کرنے کا تھا، ذخیرہ اندوزی کا نہیں تھا"۔ ان کی زندگی آرام دہ تھی اور لوگ اکثر اپنی حد سے زیادہ خرچ کرتے تھے۔ وہ شاہی آداب کی نقل کرتے اور اسی طرح کی زندگی گزارنے کی کوشش کرتے۔ وہ تالابوں اور باغات سے گھری ہوئی عظیم الشان اور آرام دہ عمارتوں میں رہتے تھے اور مہنگے کپڑے پہنتے۔ نوکروں کی بڑی تعداد تھی۔ اورنگ زیب کے دور میں ایک منصب دار امیر امانت خان نے برہان پور میں باغات کے ساتھ ایک خوبصورت محل بنوایا جس میں بہت سے تالاب تھے اور کئی نہروں کے ذریعے تالابوں کو پانی پہنچانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ ان کے طرز زندگی کو بیان کرتے ہوئے، برنیئر نے لکھا ہے کہ ان کے گھر بڑے اور خوبصورت ہوتے تھے، جن میں صحن، باغات، درخت، پودے، آبی ذخائر تھے اور وہ کئی طرح سے لیس تھے۔ فرنیچر، پلنگ، آئینہ، کرسیاں اور چوکیاں شامل تھے جن پر خوبصورت پچی کاری تھی۔ فرش پر مہنگے قالین بچھے رہتے تھے۔ ایک اور یورپی سیاح نے بیان کیا ہے کہ امراء لوگوں کی خوبصورت کوٹھیاں تھیں جن میں بہت سے کمرے ہوتے تھے اور جن کی چھتوں پر یہ اشرافیہ فوارے اور ٹھنڈی ہوا کے درمیان بیٹھ کر اپنے دوستوں کا استقبال کیا کرتے تھے۔ ان کا کھانا

بھی بہت قیمتی تھا، وہ سونے چاندی کی پلیٹوں میں بہترین کھانا کھاتے تھے۔ پلیٹوں کی تعداد اکثر سو سے تجاوز کر جاتی تھی۔ باہر سے درآمد کیے گئے پھلوں سمیت ہر قسم کے پھل باقاعدگی سے کھائے جاتے تھے۔

سولہویں صدی کے ایک شاعر برج داس نے ذکر کیا ہے کہ بنگال کے ایک زمیندار حسن کے حرم میں سو عورتیں تھیں۔ اس طرح امیر لوگ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان عالی طبقے کی خواتین کو بھی شاہانہ انداز میں زندگی گزارنے کا شوق تھا۔ وہ طرح طرح کے قیمتی زیورات اور موتی پہنتی تھیں اور مہنگے کپڑوں اور عطروں کی دلدادہ تھی۔ امیر رئیس شام کو خود حرم میں آتے اور آدھی رات تک شراب و موسیقی اور رقص کے ساتھ محفلیں منعقد ہوتیں۔ وہ سال بھر برف کا استعمال کرتے تھے، جو اس زمانے میں ایک نایاب شے سمجھی جاتی تھی۔ جب یہ گروہ پالکی یا گھوڑے پر سوار ہو کر نکلتا تو تیس سے چالیس لوگ پیدل اس کے ساتھ ہوتے۔ ان میں سے کچھ آگے کا راستہ صاف کرتے، کچھ چھتر کو لے جاتے، کچھ حقہ اور تمبا کو اور صراحی لے جاتے، کچھ مکھیاں ہٹانے کے لیے رومال اٹھاتے۔ اس طرح اس اشرافیہ طبقے نے شاہانہ زندگی گزارنے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنی آمدنی سے زیادہ خرچ کرتے تھے، جس کی وجہ سے وہ اکثر مقروض رہتے۔ برنیئر، جو اس وقت ان امیر لوگوں کے قریب ہو گئے تھے، لکھتے ہیں کہ یہ لوگ ہمیشہ قرضوں میں ڈوبے رہتے تھے۔ انہیں بادشاہ کو مہنگے تحائف پیش کرنے اور اپنے ذاتی انتظامات پر خرچ کرنے کے لیے قرضوں کا سہارا لینا پڑتا تھا۔

2. متوسط طبقہ

مؤرخین کے درمیان اس بارے میں کافی بحث ہے کہ عہد وسطی کے ہندوستان میں متوسط طبقہ تھا یا نہیں۔ فرانسیسی سیاح برنیئر کے مطابق ہندوستان میں کوئی درمیانی حیثیت کی درجہ بندی نہیں تھی، یا تو لوگ بہت خوش حال تھے یا بدحالی میں گزارہ کرتے تھے، لیکن اس بیان سے اتفاق ممکن نہیں۔ مڈل کلاس کا مطلب ہے تاجر اور دکاندار۔ ہندوستان میں خوش حال تاجروں اور کاروباریوں کا ایک بڑا طبقہ تھا۔ اس کے علاوہ اس طبقے میں حکیم، ویدیاں اور نچلے درجے کے ماتحت افسر تھے۔ مغل حکومت کی طرف سے قیمتوں، ٹیکسوں، مکانات کی تعداد، لینڈ ریونیو ادا کرنے والوں اور خاندانوں کے نام اور ذاتوں کی مکمل تفصیلات لکھی جاتی تھی۔ منصب اور جاگیر کی مکمل تفصیلات بھی لکھی گئیں۔ اس لیے ان کاموں کو انجام دینے کے لیے دیوان، محرر، عامل اور کارکن جیسے چھوٹے عہدیداروں کی ضرورت تھی۔ اسی طرح پیشہ ور طبقے میں ڈاکٹر، حکیم، استاد، وکیل وغیرہ بھی تھے۔ ان کے علاوہ سنت، اولیاء اور علماء کی ایک بڑی تعداد بھی تھی جنہیں ریاست کی طرف سے وظیفہ، رقم یا زمین (ملک، انعام، مدد معاش وغیرہ) کی گرانٹ دی جاتی تھی۔ وہ گاؤں اور شہروں میں اہم عہدوں پر فائز تھے اور انہیں عام لوگوں سے الگ ایک اعلیٰ طبقے کے طور پر دیکھا جاتا تھا۔

ان تاجروں کو ان کے روایتی حقوق حاصل تھے، اور انہیں اپنی جان مال کی حفاظت کا حق حاصل تھا۔ لیکن انہیں کسی شہر پر حکومت کرنے کا حق نہیں تھا۔ پیشہ ور افراد میں سے، معالجین (طبیب) نہ صرف امیروں کی ضروریات کو پورا کرتے تھے، بلکہ بہت سے دوسرے طبقوں کے صحت کے مسائل کو بھی حل کرتے تھے، جن میں چھوٹے سرکاری ملازمین، چھوٹے منصب دار، شہروں کے دیگر پیشہ ور افراد، اور دولت مند کاریگر شامل تھے۔ بعض حکیموں کا تعلق حکمرانوں اور بڑے امیر لوگوں سے تھا اور ان کے پاس منصب بھی تھے لیکن زیادہ تر اکثر

اپنا کاروبار نجی طور پر چلاتے تھے۔ مثال کے طور پر اطالوی سیاح مانوچی نے لکھا ہے کہ جب دارا شکوہ کے آرٹلری ڈیپارٹمنٹ میں اس کی سروس ختم ہوئی تو اس نے لاہور میں پرائیویٹ فزیشن کے طور پر کام شروع کیا اور جلد ہی اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ دوسرے پیشہ ور افراد جن میں موسیقار، خطاط، فلسفی، اساتذہ، مورخ، ریاضی دان، ماہر فلکیات وغیرہ شامل ہیں، اکثر اس شہری دانشور طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔

ہم متوسط طبقے کے دوسرے لوگوں کے مقابلے ماتحت افسران کے معیار زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل کرتے ہیں۔ سورت سنگھ نامی کارکن کا ذکر ہے کہ اس نے لاہور کے علاقے میں شانو شوکت میں 700 روپے میں گھر خریدا اور ایک اور ماتحت افسر خواجہ چند نے ایک درگاہ کے قریب 3000 روپے میں کنواں بنایا۔ اس کے علاوہ آئی اے خان کے مطابق کچھ امینوں اور فوجداروں نے زمینیں خرید کر چھوٹی چھوٹی بستیاں قائم کیں جن میں باغات، سرائے اور حمام بنائے گئے جس سے بہت زیادہ آمدنی ہوتی۔ صوبہ بنگال کا ذکر کرتے ہوئے، انیل چٹرجی نے کہا ہے کہ بہت سے دیوان، بخشی اور قانون گو جو مقامی بادشاہوں کی خدمت میں کام کرتے تھے، دولت مند زمیندار بن گئے۔ ستیش چندر کا خیال ہے کہ ان کی خوش حالی یقینی طور پر ان کی تنخواہوں سے نہیں آئی، بلکہ غلط ذرائع، غبن وغیرہ کے ذریعے پیسہ کمانے سے آئی تھی۔ چونکہ ان میں سے بہت سے کھتری اور بنیا ذاتوں سے تعلق رکھتے تھے یا جین تھے، اس لیے انہوں نے کام کرنے کے علاوہ کھیتی باڑی، سود، تجارتی مالوں میں سٹے بازی، پھلوں کے باغات کا ٹھیکہ دینے اور محصول وصول کرنے، شہروں میں کرائے کی جائیدادوں کا انتظام وغیرہ کے ذریعے بھی بہت پیسہ کمایا۔ ان طبقات کے پاس اتنی دولت تھی کہ وہ آسانی سے شہروں میں اچھے گھر خرید سکتے تھے۔ اورنگ زیب کے دور میں جہان آباد کے امین اور فوجدار عبدالصمد خان نے اپنے بیٹے کے نام پر ایک قصبہ بسایا۔ اس کی جائیداد میں پھلوں کے باغات، ایک سرائے اور ایک ترک حمام شامل تھے۔ ریونیو کے اہلکاروں کی عام طور پر کوئی شہرت نہیں تھی اور انہیں بدعنوانی سے جمع کی گئی رقم کی وصولی کے لیے کبھی کبھی قید یا بصورت دیگر طریقے سے ذلیل کیا جاتا تھا۔

3. نچلا طبقہ

نچلے طبقے کے لوگ جن میں کسان، مزدور، چھوٹے دکاندار، ہنر مند مزدور، چپراسی، نوکر، غلام وغیرہ شامل تھے، کی حالت اچھی نہیں تھی۔ وہ مشکل سے زندگی گزار رہے تھے۔ اس حوالے سے غیر ملکی اور ہندوستانی مورخین نے جو ثبوت پیش کیے ہیں وہ بالکل واضح ہیں۔ آبادی کی اکثریت دیہاتوں میں رہتی تھی۔ ہندوستانی گاؤں، جیسا کہ ہم جانتے ہیں، سماجی اور معاشی دونوں لحاظ سے بہت زیادہ طبقاتی تقسیم کا شکار تھا، اور زمین کی تقسیم میں کافی عدم مساوات تھی، حالانکہ وہاں کافی قابل کاشت زمین بنجر پڑی تھی، جسے اگر سرمایہ، محنت اور تنظیم میسر ہو تو آباد کیا جا سکتا تھا۔ کسانوں کی آمدنی کا درست اندازہ لگانا مشکل ہے کیونکہ ان کے لین دین میں کرنسی کا استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ موٹے طور پر دیکھا جائے تو دیہی معاشرے میں تین طبقے تھے: پہلا طبقہ خود کاشت کرنے والوں کا تھا۔ یہ لوگ اپنی کاشت کی زمین کے مالک ہونے کا دعویٰ کرتے تھے، دوسرے طبقے کو پاہی کہا جاتا تھا جو دوسرے گاؤں میں کھیتی باڑی کرنے آتے تھے اور وہاں اپنی جھونپڑیاں بنا لیتے تھے۔ ان کے پاس اپنے ہل اور بیل نہیں تھے اور وہ خود کاشت کرنے والے کسانوں اور زمینداروں کے کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ تیسرا طبقہ مجاریاں

یعنی حصہ داروں کا تھا جو خود کاشت کرنے والے کسانوں اور زمینداروں سے کرائے پر زمین لیتے تھے۔ بے زمین کسانوں کا ایک طبقہ بھی تھا جو موچی، کمہار اور دھوبی جیسے نوکر تھے۔ موچی، کمہار اور دھوبی کو ان کی خدمات کے عوض فصل کی کٹائی کے وقت پیداوار کا ایک مقررہ حصہ دیا جاتا تھا۔ فصلوں کی کٹائی اور بوائی کے دوران انہیں بطور مزدور بھی استعمال کیا جاتا تھا۔

یہ سوچنا غلط ہوگا کہ گاؤں کے تمام کسانوں یا کاریگروں کا معیار زندگی ایک جیسی تھی۔ اسی طرح ایک گاؤں دوسرے گاؤں سے ملتا جلتا نہیں تھا۔ کچھ بڑے دیہات اناج جمع کرنے کے لیے استعمال ہوتے تھے یا ان میں بازار ہوتا تھا۔ نسبتاً امیر طبقے سے تعلق رکھنے والے زیادہ تر کسان، جن میں اناج بیچنے والے یا ساہوکار اور مہاجن شامل تھے، ایسے ہی دیہاتوں میں رہتے ہوں گے، جو آخر کار شہروں کی شکل اختیار کر گئے۔ یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ محصولات کی ادائیگی کے بعد کسانوں کے مختلف طبقوں کو پیداوار کا کیا حصہ دیا گیا۔ مغل دور میں طے شدہ عمومی قواعد کی بنیاد پر وہ پیداوار کا ایک تہائی یا آدھا حصہ زمینی محصول کے طور پر ادا کرتے تھے۔ ریاست کے حصے کا تعین کئی عوامل کی بنیاد پر کیا جاتا تھا، جن میں زمین کی قسم، رسم ورواج اور علاقے کے زمیندار کے ساتھ ریاست کے تعلقات کی نوعیت شامل تھی۔ مثال کے طور پر، راجستھان کے کچھ حصوں میں، تین اعلیٰ ذاتوں کے لوگ، برہمن، راجپوت یا کھشتریا اور ویشیا یعنی مہاجن ذات، رعایتی نرخوں پر زمینی محصول ادا کرتے تھے۔ گاؤں میں مقرر چوہدری اور مقدم سے رعایتی نرخوں پر زمینی محصول بھی وصول کیا جاتا تھا۔

اگر ہم اس نچلے طبقے کے طرز زندگی کی بات کریں تو بابر بابرنامہ میں لکھتا ہے کہ ہندوستان میں کسان اور نچلے طبقے کے لوگ برہنہ رہتے تھے۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ وہ اپنے جسم کے اعضاء کو ڈھانپنے کے لیے مردوں کے پہننے والے لنگوٹے اور خواتین کی پہنی ہوئی ساڑھی کی وضاحت کرتے ہیں۔ اکبر کے زمانے کے مصنف ابوالفضل اپنی مشہور تصنیف آئین اکبری میں بنگال کے عام لوگوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ زیادہ تر برہنہ ہوتے تھے اور جسم کے درمیانی حصے کو ڈھانپنے کے لیے صرف لنگی پہنتے تھے۔ ڈیلوٹ نے لکھا کہ "مزدوروں کے پاس اتنے کپڑے نہیں تھے کہ وہ سردی میں خود کو بچا سکیں۔" عورتیں سوتی کپڑے کا ایک ٹکڑا اپنی کمر کے گرد لپیٹ کر اپنے سر کو سرے سے ڈھانپتی تھیں جسے ساڑھی کہا جاتا تھا۔ خواتین سینے کے حصے کے لیے انگیا یا جیکٹ پہنتی تھیں۔ وہ جوتے خریدنے سے قاصر تھے۔ غیر ملکی سیاحوں کے مطابق ان کے حالات زندگی قابل رحم تھے۔ گھر میں ان کے پاس صرف لحاف یا چادریں اور کچن کے لیے مٹی کے برتن تھے۔ کسانوں کی حالت اتنی خراب تھی کہ آگرہ میں ڈچ فیکٹری کے سربراہ نے لکھا تھا کہ ان کے لیے سوکھی روٹی تک ملنا مشکل ہے۔ مورلینڈ مغل دور میں نچلے طبقے کے لوگوں کی مشکلات کے بارے میں مبالغہ آمیز تفصیلات پیش کرتا ہے۔ اس وقت اجرت کی اوسط شرح شاید 2 روپے سے کم نہیں تھی۔ مانوچی نے کہا ہے کہ اگر ہندوستان کا عام آدمی 4 روپے ماہانہ کماتا ہے تو وہ خود کو اعلیٰ سمجھنا شروع کر دیتا اور کام کرنے سے بھی انکار کر دیتا۔ ایک غیر ملکی مسافر نے لکھا ہے کہ ایک عام بندہ اوسطاً تین روپے ماہانہ تنخواہ لیتا ہے۔ بلاشبہ اجرت کی یہ رقم کم ہے لیکن اس وقت اشیائے ضروریہ کی قیمتیں بھی بہت کم تھیں۔ اکبر کے زمانے میں، 1.5 روپے کمانے والا شخص 150 سیر گندم خرید سکتا تھا جس سے پانچ افراد کے خاندان کا پیٹ بھرا جا سکتا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ انہیں خوراک کی کمی کا سامنا نہیں کرنا پڑا کیونکہ ان کی ضروریات کم تھیں اور روزمرہ استعمال کی اشیا سستی۔ The Great Mughal کے مصنف ونسنٹ اسمتھ نے بھی اعتراف کیا ہے کہ اکبر اور جہانگیر کے دور میں بے

زمین مزدوروں کے پاس کھانے کے لیے آج کے مقابلے میں زیادہ خوراک دستیاب تھی۔ آج کی طرح، تمام خواتین، امیر اور غریب، بہت سے زیورات پہنتی تھیں۔ فارسی اور علاقائی دونوں طرح کے ادیبوں نے زیورات پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ پٹنہ کے بارے میں لکھتے ہوئے رالف فیچ کہتے ہیں کہ یہاں کی خواتین چاندی اور تانبے کے زیورات سے اس قدر لدی ہوئی ہیں کہ یہ عجیب سا لگتا ہے۔ وہ پیر کی انگلیوں میں چاندی اور تانبے کی انگوٹھیوں پہنتی تھی جس کی وجہ سے جوتے نہیں پہنتی تھی۔

معاصر اکاؤنٹس بتاتے ہیں کہ ہندوستان کے عام لوگوں کی خوراک میں چاول، اناج اور دالیں شامل تھیں۔ چونکہ بنگال، اڑیسہ، سندھ اور جنوبی ہندوستان کے کچھ حصوں میں چاول اہم فصل تھی، اس لیے یہ لوگوں کی اہم خوراک تھی۔ مغربی ہندوستان کے راجستھان اور گجرات میں جوار اور باجرے جیسے موٹے اناج کا استعمال کیا جاتا تھا۔ عرفان حبیب کا خیال ہے کہ عام طور پر، کسان اپنے خاندان کے لیے اپنی پیداوار میں سے صرف سب سے کم معیار کے اناج ہی رکھ سکتا تھا۔ آگرہ اور دہلی کے گندم پیدا کرنے والے علاقے میں عام لوگوں کی خوراک میں واضح طور پر گندم شامل نہیں تھی۔ مالوا کے بارے میں لکھتے ہوئے ٹیری کا کہنا ہے کہ عام لوگ گندم نہیں کھاتے تھے، بلکہ وہ زمینی موٹے اناج سے بنے گول، چوڑے اور موٹے کیک (چپاتی) کھاتے تھے، جو غذائیت سے بھرپور اور لذیذ ہوتے تھے۔ دہلی اور آگرہ کے علاقے کے بارے میں ذکر ہے کہ ان کی روزمرہ کی نیرس غذا میں سبز دال اور چاولوں کی ملاوٹ والی کھچڑی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا تھا، جسے وہ شام کو تھوڑا ساگھی کے ساتھ کھاتے اور دن میں تھوڑی سی بھنی ہوئی دال یا دیگر اناج چبا کر اپنی زندگی گزارا کرتے تھے۔

4.4 مغل دور میں تکنیک (Technique in Mughal Period)

مغل دور میں ٹیکنالوجی کے بہت سے پہلوؤں میں ترقی ہوئی، جس نے اس وقت کی سماجی، ثقافتی، اور معاشی زندگی کو متاثر کیا، ساتھ ہی دنیا بھر میں برصغیر پاک وہند کی شناخت کو بھی بہتر بنایا۔ مغل بادشاہوں کے دور حکومت میں بہت سے نئے تکنیکی طریقوں اور اختراعات کا ظہور ہوا جس کی وجہ سے نہ صرف فن تعمیر اور جنگ میں بلکہ زراعت، پانی کے انتظام، فلکیات اور طب میں بھی ترقی ہوئی۔

1. **مغل دور کی سب سے مشہور تکنیکی کامیابیوں میں سے ایک فن تعمیر ہے**

مغل شہنشاہوں نے خوبصورت اور کشادہ عمارتیں تعمیر کیں جو جدید تعمیراتی تکنیک کی مثال ہیں۔

تاج محل: مغل فن تعمیر کا سب سے مشہور شاہکار تاج محل ہے۔ یہ سفید سنگ مرمر سے بنی ایک عظیم الشان عمارت ہے جس میں فن تعمیر کی اعلیٰ ترین تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ سنگ مرمر کی کاریگری اور نفیس ڈیزائن نے اسے ایک تاریخی ورثہ بنادیا۔

فتح پور سیکری: شہنشاہ اکبر کے تعمیر کردہ اس شہر میں نئی تعمیراتی تکنیک استعمال کی گئی۔ یہاں کی عمارتوں میں ہندوستانی اور اسلامی فن تعمیر کا شاندار امتزاج دیکھا جاسکتا ہے۔

لال قلعہ: جو دہلی میں واقع ہے، مغل فن تعمیر کا بھی ایک بہترین نمونہ ہے، جس میں پتھر کی مضبوط دیواریں، دروازے اور گنبد استعمال کیے گئے ہیں۔ ان عمارتوں میں سنگ مرمر، سرخ بلوا پتھر اور لکڑی جیسے مواد کا استعمال بہت زیادہ تھا۔ مزید برآں، فن تعمیر میں صوفی عناصر، اور

میناروں، گنبدوں، محرابوں اور جالیوں کا نمایاں استعمال شامل ہے۔

2. مغل بادشاہوں نے اپنی سلطنت کے دفاع اور توسیع کے لیے جدید عسکری تکنیک کا استعمال کیا

بندوقیں اور توپیں: مغل دور میں توپوں کا بڑے پیمانے پر استعمال ہوتا تھا۔ ان توپوں سے بڑے پیمانے پر جنگیں لڑی گئیں۔ پانی پت کی جنگ اور بیر بل کی توپ جیسے واقعات اس کا ثبوت ہیں۔ یہ توپیں لوہے کی بنی ہوئی تھیں اور ان میں بھاری گولے بھرے گئے تھے، جن کا دشمن کی فوج پر بہت اثر تھا۔ اکبر کے دور میں تیار کی گئی بہت سی سائنسی ایجادات میں ایجاد کی روح جھلکتی ہے، جس میں کئی بندوقوں کے بیرل کو بیک وقت صاف کرنے کا طریقہ بھی شامل ہے۔ ہتھیار، تلواریں، نیزے، ڈھالیں اور دیگر جدید ہتھیار مغل فوج میں استعمال ہوتے تھے۔ ان ہتھیاروں کے کنارے اور ڈیزائن کو انتہائی موثر بنایا گیا تھا۔

گھوڑوں کی فوج: مغل بادشاہوں نے گھڑ سواروں کو ایک اہم کردار دیا۔ گھوڑے کے سپاہی میدان جنگ میں انتہائی موثر تھے جو جنگ کی رفتار کو بدل سکتے تھے۔

3. مغل دور میں پانی کے انتظام اور زراعت میں بہتری نے پیداوار بڑھانے میں مدد کی

نہروں اور آبی ذخائر کی تعمیر: شہنشاہ اکبر نے بہت سی نہریں اور آبی ذخائر تعمیر کیے، جیسے کہ نہروں کا جال جو آبپاشی کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ زرعی آبپاشی کے نظام جیسے تلونڈی اور سنگانیری نہریں مغل دور حکومت میں تعمیر کی گئیں، جس سے زمین کو سیراب کرنے میں مدد ملی۔ اس سے پیداوار میں اضافہ ہوا اور کسان بہتر فصلیں حاصل کر سکیں۔

باغبانی: مغل بادشاہوں نے باغبانی میں بھی بے پناہ اختراعات کیں۔ مثال کے طور پر تاج محل کے باغات چار باغ طرز کے تھے، باغات کو چار برابر حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا، جو پانی کے انتظام، ڈیزائن اور خوبصورتی کی شاندار مثالیں ہیں۔

4. مغل دور میں سائنس اور فلکیات میں بھی اہم پیش رفت دیکھنے کو ملی

جدید فلکیات: شہنشاہ اکبر نے فتح پور سیکری میں جنتر منتر تعمیر کرایا، جو فلکیات کے لیے جدید ترین آلہ تھا۔ یہاں سورج گرہن، چاند گرہن اور ستاروں کے راستے کو درست طریقے سے ماپنے کی تکنیک تیار کی گئی۔

میڈیکل سائنس: مغلیہ دور میں بھی میڈیکل سائنس میں کچھ بہتری آئی تھی۔ ڈاکٹروں نے آیوروید اور یونانی طبی طریقوں کو ملایا۔ اس دور کے طبی متن میں ہڈی، خون اور ادویات کے بارے میں اہم معلومات موجود ہیں۔

5. مغلیہ دور میں تجارت میں بھی ترقی ہوئی اور اس کے لیے، بہت سی ٹیکنالوجیز تیار کی گئیں

جہاز رانی اور سمندری راستے: مغل بادشاہوں نے سمندری راستوں سے تجارت کو فروغ دیا۔ تاجر گجرات اور بنگال کے سمندری راستوں سے تجارتی بحری جہازوں کے ذریعے ہندوستان سے مختلف ممالک میں سامان بھیجتے تھے۔

منظم تجارتی نظام: مغل دور میں تاجروں کو منظم انداز میں کام کرنے کی ترغیب دی جاتی تھی۔ تجارتی راستوں کے لیے حفاظتی اقدامات کیے گئے اور اس سے بین الاقوامی تجارت میں اضافہ ہوا۔ ہندوستان میں پرتگالیوں کی آمد سے جہاز سازی میں مزید تیزی آئی۔ مثال کے طور پر،

کالی کٹ کے زمورن نے پرتگالیوں سے توپوں سے لیس جہاز بنانے کے لیے میلان، اٹلی سے دو کاریگروں کی خدمات حاصل کیں۔ جہاز سازی کے میدان میں یہ بات مشہور ہے کہ 1612 عیسوی کے اوائل میں دابل کے بحری جہاز عیسائی جہازوں کی طرح بنائے جا رہے تھے۔ کے این چودھری کا کہنا ہے کہ سترہویں صدی کے آخر تک یورپی تاجروں کو مغرب (سورت) اور بحر ہند میں بنائے گئے جہازوں میں کوئی تکنیکی فرق نظر نہیں آیا۔ بلکہ، ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے مقامی جہازوں کو ترجیح دی ہے، کیونکہ ان جہازوں میں فنش اور عمومی کاریگری کا اعلیٰ معیار تھا۔

4.5 مغلیہ دور میں سرمایہ کاری (Investment in Mughal Period)

جہاں تک مغل دور میں سرمایہ داری کا سوال ہے تو مغل ہندوستان کی معیشت تجارت، دست کاری اور زراعت پر مبنی تھی۔ بین الاقوامی تجارت تجارتی شہروں میں ہوتی تھی، اور زمین کی آمدنی زراعت سے حاصل کی جاتی تھی۔ کاٹن ٹیکسٹائل، دھاتی کام، اور دیگر دست کاری کی صنعتیں کاریگری میں نمایاں تھیں، جو سرمایہ دارانہ عناصر کی عکاسی کرتی ہیں، حالانکہ جدید سرمایہ داری سے مختلف تھیں۔ مغل ہندوستان میں سرمایہ داری جدید مغربی سرمایہ داری کی طرح نہیں تھی، لیکن اس میں کچھ عناصر تھے جو تجارتی اور معاشی سرگرمیوں کے میدان میں سرمایہ دارانہ خصوصیات کی عکاسی کرتے تھے۔ مغلیہ سلطنت (16ویں سے 19ویں صدی) کی معیشت بنیادی طور پر زراعت، تجارت اور دست کاری پر مبنی تھی۔ اگرچہ یہ سرمایہ داری کی مغربی تعریف سے میل نہیں کھاتا تھا، لیکن پھر بھی اس کے اندر کچھ خصوصیات موجود تھیں جو سرمایہ دارانہ معیشت کے ساتھ مطابقت رکھتی تھیں۔ مغل ہندوستان میں سرمایہ داری کے چند اہم عناصر مندرجہ ذیل ہیں:

1. تجارت

مغلیہ سلطنت میں اندرونی اور بیرونی تجارت کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ ہندوستان میں کپڑا، مصالحہ جات، چاندی، سونا اور جواہرات کی تجارت ہوتی تھی۔ بڑے تجارتی شہر جیسے سورت، ہوگلی اور دیگر ساحلی علاقے غیر ملکی تجارت کے مراکز تھے۔ یورپ، وسطی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا کے ساتھ تجارت ہوتی تھی۔ ہندوستان کی ٹیکسٹائل کی صنعت، خاص طور پر سوتی کپڑے، مغل دور میں یورپی ممالک میں بہت مقبول تھی اور ہندوستان کی معیشت کا ایک اہم حصہ تھی۔

2. زراعت اور زمینی محصول

مغلیہ سلطنت کی معیشت کا زیادہ تر حصہ زراعت پر مبنی تھا۔ یہ کسانوں سے لینڈ ٹیکس (ریونیو) کی وصولی کا ایک منظم طریقہ تھا، جو مغل انتظامیہ کا ایک اہم حصہ تھا۔ اکبر کے قائم کردہ "ضبطی" نظام کے تحت زمینی محصول کی مناسب اور باقاعدہ وصولی کی گئی۔ اس سے معیشت میں استحکام آیا اور ایک منظم منڈی تیار ہوئی۔

3. کاریگری اور مینوفیکچرنگ

مغلیہ دور میں کاریگری خصوصاً ٹیکسٹائل کی صنعت، ہینڈلوم، دھاتی کام، کاغذ، اور دیگر دستکاریوں میں بہت ترقی ہوئی۔ ان کاریگروں نے بڑے پیمانے پر سامان تیار کیا، جو اندرونی اور بیرونی منڈیوں میں فروخت ہوتا تھا۔ ریشم، اون، کپاس، اور چاندی جیسے مختلف مواد تیار کیے گئے اور ان مصنوعات نے مقامی تجارت اور بین الاقوامی تجارت دونوں میں نمایاں رول ادا کیا۔

4. سرمایہ کاری اور سرمایہ جمع

تجارت اور دستکاری میں سرمایہ کاری کی گئی اور دولت مند تاجروں اور صنعت کاروں نے سرمایہ جمع کیا۔ ان تاجروں اور صنعت کاروں کے "سیدوں" اور "شاہی درباروں" کے ساتھ کاروباری تعلقات تھے، جس سے ایک قسم کا سرمایہ دارانہ ڈھانچہ پیدا ہوا۔

اس طرح، مغل ہندوستان میں تجارت، کاریگری اور زمینی محصول کے نظام تھے جو سرمایہ دارانہ معیشت کی کچھ خصوصیات کو ظاہر کرتے تھے، حالانکہ یہ جدید مغربی سرمایہ داری سے مختلف تھا۔ عرفان حبیب نے مغلیہ دور میں سرمایہ داری کی طرف بڑھنے کے عمل کو منفی روشنی میں پیش کیا۔ ان کے مطابق مغلیہ سلطنت زراعت پر مبنی معیشت تھی، جس میں شاہی ڈھانچے کے تحت تجارت اور دست کاری کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ حبیب کا خیال تھا کہ مغل سلطنت میں سرمایہ داری کے نمایاں طور پر ترقی کرنے کا امکان نہیں تھا، کیونکہ یہ ایک روایتی معیشت تھی جس میں پیداوار اور تجارت کا زیادہ تر حصہ ریاست کے زیر کنٹرول تھا۔ تاہم، حبیب نے تسلیم کیا کہ ٹیکسٹائل کی صنعت اور فلکیات جیسے شعبوں میں کچھ سرمایہ دارانہ عناصر ابھرے ہیں، لیکن اسے مکمل طور پر سرمایہ دارانہ معیشت کے طور پر بیان نہیں کیا جا سکتا۔ رامشرن شرمانے مغل دور میں زراعت اور زمینی نظام کی طرف توجہ مبذول کروائی اور اسے سرمایہ داری کی کچھ ابتدائی شکلوں سے جوڑ دیا۔ ان کا خیال تھا کہ مغل دور میں زرعی پیداوار اور تجارت کے درمیان گہرا تعلق تھا۔ انہوں نے تسلیم کیا کہ سامراجی ٹیکس نظام اور کاروباری ڈھانچے نے سرمائے کو جمع کرنے اور مارکیٹ کی توسیع میں کسی حد تک مدد کی، لیکن اس وقت حکومت کا مقصد مکمل طور پر سرمایہ دارانہ نقطہ نظر سے وابستہ نہیں تھا۔

4.6 مغل دور میں سود خوری نظام (Usury System during Mughal Period)

سود پر مبنی قرض یا سود مغلیہ دور میں ایک اہم معاشی اور سماجی عمل تھا، جو تجارت، زراعت اور انتظامیہ کے مختلف پہلوؤں سے منسلک تھا۔ سود، جسے قرضوں پر سود وصول کرنے کے طور پر سمجھا جا سکتا ہے، مغلیہ سلطنت کے دوران وسیع پیمانے پر رائج تھا۔ اگرچہ یہ رواج معاشرے میں کئی سطحوں پر دیکھا گیا، لیکن اس پر قابو پانے اور روکنے کی کوششیں کی گئیں۔ مغلیہ دور حکومت میں سود خاص طور پر تاجر طبقے، کسان طبقے اور ریاستی لین دین میں رائج تھا۔ کسانوں اور چھوٹے تاجروں کے لیے اکثر سود پر قرض لینا ضروری ہو جاتا تھا، کیونکہ بعض اوقات ان کے پاس اپنے کام کے لیے سرمائے کی کمی ہوتی تھی۔ اس دوران قرضوں پر سود کی شرح عام طور پر بہت زیادہ تھی اور اس کی وجہ سے قرض لینے والوں کو قرض کی ادائیگی میں مشکل پیش آتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس عرصے کے دوران اصل رقم پر تقریباً پانچ سے گیارہ فیصد کی بلند شرح پر سود ادا کرنا پڑتا تھا۔

عہد وسطیٰ کی معیشت زرعی تھی۔ آمدنی کا بنیادی ذریعہ زراعت تھا اور یہی وہ بنیادی وجہ تھی جس نے ہندوستانی کسانوں کو قرض لینے پر مجبور کیا کیونکہ ریاست کا دعویٰ کل پیداوار کے 1/3 سے 1/2 کے درمیان تھا۔ اس بلند شرح کی ادائیگی کے لیے کسان ایک مشکل چکر میں پھنس جاتا تھا۔ وہ ریاست کے ٹیکس کی ادائیگی کے لیے ساہوکاروں سے قرض لیتا تھا۔ چونکہ بعض اوقات فصل تیار ہونے سے پہلے ہی لگان کی ادائیگی کا مطالبہ کیا جاتا تھا، جس کے نتیجے میں کسان کو ساہوکار سے قرض لینا پڑتا تھا۔ اس کی شرح سود بہت زیادہ تھی جو کسان پر بہت

بڑا بوجھ بن گئی۔ یہ قرضے صرف دو سے تین ماہ کے لیے دیے جاتے تھے اور واپس نہ کرنے کی صورت میں سود کی رقم بھی اصل رقم میں شامل کر دی جاتی تھی۔ اب پوری رقم پر سود لاگو ہو جاتا تھا۔ اس قسم کے عام سود کے علاوہ دیہات میں دوسری قسمیں بھی رائج تھیں جو غالباً تجارت وغیرہ کے لیے دی جاتی تھیں۔ بعض اوقات قرض نقدی میں دیا جاتا تھا لیکن اس کی ادائیگی کسی شے کی قسم میں کرنی پڑتی تھی۔ ساہوکار اناج وغیرہ کو کم تول کر اپنا منافع مزید بڑھاتا تھا۔ اسی طرح عام کاریگر اپنی روزی روٹی کے لیے قرضوں پر انحصار کرتے تھے، جیسا کہ عرفان حبیب کہتے ہیں، وہ قرضوں کے لیے تاجروں پر انحصار کرتے تھے۔ وہ تاجر بھی ان کے مال کے خریدار تھے۔ اس صورت حال کی وجہ سے 18ویں صدی میں بنگال اور گجرات میں قرضوں کی فراہمی کا ایک نیا نظام وجود میں آیا جسے "دادنی" کہا جاتا تھا۔ اس نظام کے تحت، تاجر کاریگروں کو نقد قرض دیتے تھے، جو زیادہ تر بنکر تھے۔ اس کے بدلے میں کاریگر کپڑا بنا کر اس کی خواہش کے مطابق اور مقررہ وقت پر سوداگر کو دے دیتا تھا۔

مغل انتظامی طبقہ زیادہ تر ان لوگوں پر مشتمل تھا جو حکومت سے تنخواہ حاصل کرتے تھے۔ اس تنخواہ کے عوض انہیں زمینیں یا جاگیریں فراہم کی جاتی تھیں۔ چونکہ زمین آمدنی کا بنیادی ذریعہ تھی، مغل انتظامی طبقے کو انتہائی خوش حال ہونا چاہیے تھا لیکن ان کے اخراجات بھی ان کی آمدنی کے مطابق تھے۔ چونکہ ریاست ان کو زمین کا محصول ادا کرنے کی ذمہ داری دی تھی اور چونکہ زمین کا لگان کسانوں سے فصل کی کٹائی کے وقت ہی وصول کیا جا سکتا تھا، اس لیے انہیں ساہوکاروں کی مدد لینی پڑتی تھی جو قرض کے بدلے ٹیکس وصولی میں حصے کے حقدار بن جاتے تھے۔ اس کے علاوہ مغلوں کو اعلیٰ طبقے کی حد سے زیادہ قرض لینے کی عادت بھی تھی اور قرض دینے والوں کو قرض دینے کی خدمت کے عوض بھاری انعامات دیا کرتے تھے۔ امراء کے لوگوں کو بہت زیادہ شرحوں پر قرضے دیے جاتے تھے۔ امراء کے لیے ساہوکاروں کی طرف سے وصول کیے جانے والے اونچے نرخوں کو دیکھ کر، اکبر ریاست کی جانب سے امیروں کو قرض فراہم کرنے پر مجبور ہوا، جنہیں مساعدت کہا جاتا تھا۔

سود کے رواج کی ریاستی سرپرستی کی تصدیق اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ عدم ادائیگی سے متعلق کارروائیاں اور سماعتیں قاضیوں نے نہیں بلکہ ریاستی حکام نے کیں، کیونکہ قاضی سود کے رواج کے خلاف تھے۔ مذہبی نقطہ نظر سے بھی قرض لینا اور سود لینا اسلام میں حرام ہے۔ اس طرح عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں سود کے خلاف دو طرح کے نقطہ نظر نظر آتے ہیں، ایک اسلام کا منظور شدہ نقطہ نظر تھا جس میں سود خوری شریعت کے خلاف تھی۔ دوسرے قول نے بے بسی کی حالت میں سود کو قبول کیا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سود اس وقت کے معاشرے کی ایک عام خصوصیت تھی جس کا رویہ بنیادی طور پر زراعت اور تجارت وغیرہ کے شعبوں میں تھا۔ ایک طرح سے یہ بیوروکریسی کے ہموار کام کے لیے بھی ضروری تھا۔

مغل دور میں سود ایک متنازعہ اور معاشی طور پر اہم عمل تھا۔ جہاں ایک طرف سود نے معاشرے پر منفی اثرات مرتب کیے وہیں دوسری طرف اس پر قابو پانے کے لیے کچھ کوششیں بھی کی گئیں۔ اگرچہ مذہبی اور قانونی نقطہ نظر سے سود کی حوصلہ شکنی کی گئی تھی، لیکن معاشی اور سماجی ضروریات کی وجہ سے یہ عمل کئی صدیوں تک جاری رہا۔

4.7 اورنگ زیب کے بعد معاشی بحران (Economic Crisis after Aurangzeb)

مغل سلطنت کے آخری بڑے شہنشاہ اورنگ زیب (1658-1707) کے دور کے بعد، سلطنت گہرے معاشی بحران کے دور میں داخل ہوئی، جس کے دیرپا اثرات مرتب ہوئے۔ اورنگ زیب کی موت سے سلطنت میں سیاسی عدم استحکام، فوجی اخراجات میں اضافہ اور صوبائی بغاوتوں کی وجہ سے شدید معاشی بحران پیدا ہو گیا۔ اس معاشی بحران کی وجوہات کو سمجھنے کے لیے ہمیں اورنگ زیب کے دور اور اس کے بعد کے واقعات کو تفصیل سے دیکھنا ہو گا۔ اورنگ زیب نے اپنے دور حکومت میں سلطنت کو وسعت دینے کی کوشش کی جس کی وجہ سے بہت زیادہ فوجی اخراجات ہوئے۔ اس نے کئی سال تک جنوبی ہند میں خاص طور پر مرہٹوں کے خلاف اور دکن میں جنگ کی۔ ان جنگوں سے سرکاری خزانے کو بھاری نقصان پہنچا۔ اورنگ زیب نے جنوب میں گولکنڈہ اور ویساپور جیسی طاقتور ریاستوں کا سامنا کیا اور مرہٹوں کے ساتھ مسلسل جنگیں لڑیں۔ ان جنگوں کے لیے اسے بڑی تعداد میں فوجیوں کو ملازم رکھنا پڑا جس کی وجہ سے فوجی اخراجات میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ نیز، جنگ کے دوران ریاست کو مسلسل محصولات کا نقصان ہوتا رہا کیونکہ بہت سی زرعی زمینیں میدان جنگ میں تبدیل ہو گئی تھیں، اور تجارتی راستے بھی متاثر ہوئے تھے۔ اورنگ زیب کی یہ جنگی پالیسی معاشی نقطہ نظر سے بہت مہنگی ثابت ہوئی اور سلطنت کے خزانے پر اس نے بہت زیادہ دباؤ ڈالا۔ جنوبی ہندوستان میں مراٹھوں کے خلاف اورنگ زیب کی جدوجہد نے نہ صرف سیاسی عدم استحکام پیدا کیا بلکہ معاشی طور پر بھی بہت زیادہ نقصان پہنچایا۔ مراٹھا دھڑوں کے حملوں اور گوریلا جنگوں نے تجارتی راستوں میں خلل ڈالا اور ریاست کو آمدنی میں شدید کمی کا سامنا کرنا پڑا۔ مراٹھا علاقوں میں اورنگ زیب کی حکمرانی کمزور پڑ گئی، جس سے مقامی انتظامیہ اور محصولات کی وصولی بھی متاثر ہوئی۔

مزید برآں، راجپوتوں اور راجپو جیسی دیگر برادریوں کی بغاوتوں نے بھی سلطنت کے اندرونی استحکام کو کمزور کیا اور معاشی بحران کو مزید بڑھا دیا۔ ان بغاوتوں نے سلطنت کے وسائل کو ختم کر دیا، اور تنازعات تجارتی اور زرعی پیداوار میں کمی کا باعث بنے۔ اورنگ زیب نے اپنے دور حکومت میں بہت زیادہ ٹیکس لگائے، خاص کر زکوۃ اور سود پر ٹیکس۔ یہ پالیسی کسانوں اور تاجروں پر بہت زیادہ دباؤ ڈالنے والی تھی۔ ٹیکسوں میں اضافے سے نہ صرف عوام میں عدم اطمینان پیدا ہوا بلکہ اس سے معاشی طور پر بھی مسائل پیدا ہوئے۔ کسانوں کو اپنی پیداوار پر زیادہ ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا، اور تاجروں کو تجارتی سرگرمیوں میں سرمایہ کاری کرنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ٹیکس وصولی کا نظام بھی کمزور ہو چکا تھا۔ ریاستی حکام اور مقامی حکمرانوں کی بدعنوانی نے محصولات کی وصولی کا نظام بھی متاثر کیا، جس سے خزانے کی آمدنی میں کمی واقع ہوئی۔ مغلیہ سلطنت کے ابتدائی دور میں تجارت اور صنعت میں خوش حالی تھی لیکن اورنگ زیب کے دور میں جنگوں اور اندرونی بغاوتوں کی وجہ سے تجارت اور صنعت بری طرح متاثر ہوئی۔ تجارتی راستوں کی حفاظت میں کمی آئی اور اس سے تجارت میں کمی واقع ہوئی۔ مزید برآں، کسانوں اور کاریگروں پر ضرورت سے زیادہ ٹیکسوں کا بوجھ ڈالا گیا، جس کی وجہ سے زراعت اور صنعت دونوں میں کساد بازاری ہوئی۔ سمندری تجارت بھی متاثر ہوئی، کیونکہ اورنگ زیب کے دور میں اندرونی امن کا فقدان تھا، جس کی وجہ سے تجارتی راستے محفوظ نہ رہ سکے۔ اورنگ زیب کے بعد جب مغلیہ سلطنت میں سیاسی عدم استحکام آیا تو انتظامی کمزوری بھی بڑھ گئی۔ ریاست کے مختلف حصوں میں

بد عنوانی اور انتظامی بے ترتیبی نے بحران کو مزید بڑھا دیا۔ اورنگ زیب کے جانشین نہ صرف کمزور تھے بلکہ ان کے پاس طاقت کو کنٹرول کرنے کے لیے مضبوط قیادت بھی نہیں تھی۔ اس سے عوامی عدم اطمینان میں اضافہ ہوا اور انتظامی ڈھانچہ منہدم ہو گیا۔ مزید برآں، مقامی حکمرانوں اور بیوروکریسی کے درمیان بڑھتی ہوئی طاقت کی کشمکش نے شہنشاہ کے احکامات کو نافذ کرنا مشکل بنا دیا۔ اس نااہلی نے ریاست کی معاشی حالت کو مزید کمزور کر دیا۔ مغلیہ سلطنت کے اختتام پر زرعی بحران بھی گہرا ہو گیا۔ کسان پہلے ہی زیادہ ٹیکسوں اور قرضوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے اور اس کے ساتھ قدرتی آفات جیسے کہ قحط اور سیلاب بھی آئے۔ ان آفات کی وجہ سے زرعی پیداوار میں کمی آئی اور خوراک کی فراہمی کا بحران پیدا ہوا۔ اس سے معاشرے کے نچلے طبقے پر اضافی دباؤ پڑا اور ان کے حالات زندگی مزید مشکل ہو گئے۔ اورنگ زیب کے بعد مغلیہ سلطنت میں معاشی بحران کے گہرے اثرات مرتب ہونے والے تھے۔ یہ بحران جنگوں، بغاوتوں، بد عنوانی، انتظامی عدم استحکام اور قدرتی آفات کا نتیجہ تھا۔ سلطنت کے خزانے میں کمی آئی، تجارت اور صنعت زوال پذیر ہوئی، اور کسانوں اور تاجروں کے حالات ابتر ہوتے گئے۔ ان تمام عوامل نے سلطنت کے زوال میں اہم کردار ادا کیا اور اس کے بعد کے دور میں سلطنت بتدریج کمزور ہوتی گئی۔

4.8 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

- مغلیہ سلطنت میں قصبے اور شہر تجارتی اور ثقافتی سرگرمیوں کے اہم مراکز تھے۔
- دہلی، آگرہ، لاہور اور فیض آباد جیسے بڑے شہروں نے تجارت، فنون اور ثقافت کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔
- امیر طبقے کا معیارِ زندگی بلند تھا جبکہ عام عوام پر ٹیکسوں اور مالی بوجھ نے مشکلات پیدا کیں۔
- صنعت و حرفت، فنِ تعمیر، زراعت اور آبپاشی کے نظام میں ترقی سے خوش حالی بڑھی۔
- سرمایہ داری اور مالیاتی نظام میں وسعت آئی لیکن سود اور بھاری ٹیکسوں نے غریب طبقے کو نقصان پہنچایا۔
- اورنگ زیب کے بعد سیاسی عدم استحکام اور معاشی بد انتظامی نے سلطنت کو کمزور کر دیا۔
- نتیجتاً معاشی بحران اور سماجی ناہمواری نے مغلیہ سلطنت کے زوال کی بنیاد رکھی۔

4.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

4.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. دادنی نظام کیا تھا؟

(a) پیشگی ادائیگی (b) محصول نظام
(c) آب پاشی کا نظام (d) تجارتی ٹیکس

2. طبقات اکبری میں مغل دور کے کتنے قصبوں کا ذکر ملتا ہے؟

(a) 1200 (b) 3200
(c) 1600 (d) 2000

3. آئین اکبری کے مصنف کا نام بتائیں۔

(a) نظام الدین احمد (b) ابوالفضل

(c) عبدالقادر بدایونی (d) عباس خاں شیروانی

4. پاہی کاشت سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

(a) وہ کسان جو خود کے کھیت میں کھیتی کرتا ہے (b) وہ کسان جو دوسرے کے کھیت میں کھیتی کرتا ہے

(c) زمیندار (d) جاگیردار

5. مغل دور میں خود کاشت سے کیا مراد تھی؟

(a) وہ کسان جو خود کے کھیت میں کھیتی کرتا ہے (b) وہ کسان جو دوسرے کے کھیت میں کھیتی کرتا ہے

(c) پانی پلانے والا (d) شاہی دربار میں پانی کا نظام دیکھنے والا افسر

6. مغل دور میں آنے والے کسی دو سیاحوں کا نام بتائیں۔

7. کیا مغل دور میں سود کا نظام تھا؟

(a) ہاں (b) نہیں

(c) کچھ کہا نہیں جاسکتا (d) صرف اول دور میں تھا

8. شاہ جہان آباد شہر کہاں بسایا گیا تھا؟

(a) دہلی (b) آگرہ

(c) اجمیر (d) فتح پور سیکری

9. The Great Mughal کے مصنف کا نام بتائیں۔

(a) ونسنٹ اسمتھ (b) عرفان حبیب

(c) محمد حبیب (d) رام پرساد ترپاٹھی

10. مغل دور میں قائم کوئی دو قصبات کا نام لکھیں۔

جوابات	1	2	3	4	5	6	7	8	9	10
	a	b	b	b	a		a	a	a	

4.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. مغلیہ دور میں سود کے نظام کا تجزیہ کریں۔

2. اورنگزیب کے بعد معاشی بحران کی وجوہات کیا تھیں؟ روشنی ڈالیں۔

3. مغل دور میں متوسط طبقے کے معیار زندگی کا جائزہ لیں۔

4. مغل دور میں کسان طبقے کی زندگی کا ایک جائزہ پیش کریں۔

5. کیا مغلیہ دور میں سرمایہ داری کی کوئی خاصیت تھی؟ وضاحت فرمائیں۔

4.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. مغل دور میں شہری کاری کی ترقی پر تفصیلی نوٹ لکھیں۔

2. مغلیہ دور میں اشرافیہ کے معیار زندگی کی وضاحت کریں۔

3. اورنگ زیب کی موت کے بعد مغلیہ سلطنت کے معاشی بحران پر تفصیل سے بحث کریں۔

بلاک II: برطانوی ہندوستان

اکائی 5: ایسٹ انڈیا کمپنی، نو آبادیات کی طرف منتقلی، ہندوستان میں برطانوی معاشی کنٹرول کی نوعیت کا تنقیدی جائزہ

(East India Company, Transition to Colonialism, Critical Review of the Nature of British Economic Control in India)

اکائی کے اجزا:

5.0 تمہید (Introduction)

5.1 مقاصد (Objectives)

5.2 ہندوستان میں یوروپی کمپنیوں کی آمد (Arrival of European Companies in India)

5.2.1 یوروپی کمپنیوں کی آمد کے اسباب (Reasons for the Arrival of European Companies)

5.2.2 ہندوستان میں آنے والی کمپنیاں

5.3 ایسٹ انڈیا کمپنی (East India Company)

5.3.1 برطانیہ حکومت کا علاقائی طاقتوں کے ساتھ جدوجہد

5.4 کمپنی کا نو آبادیات کی طرف منتقلی (The Company's Transition to Colonialism)

5.5 ہندوستان میں برطانوی معاشی کنٹرول کی نوعیت کا تنقیدی جائزہ

5.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

5.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

5.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

5.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

5.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

5.0 تمہید (Introduction)

ہندوستان میں یورپی کمپنیوں کی آمد 16ویں صدی میں ہوئی، جب پرتگالی، ڈچ، انگریز اور فرانسیسی تاجروں نے ہندوستان کے ساحلوں پر اپنی تجارتی فیکٹریاں قائم کیں۔ انگریزوں نے 1600 میں ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی جو بعد میں ہندوستان پر سیاسی اور معاشی کنٹرول قائم کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ ایسٹ انڈیا کا بنیادی مقصد تجارت تھا، خاص طور پر ہندوستان اور چین کے ساتھ۔ تاہم، وقت کے ساتھ، کمپنی نے ہندوستان میں اپنی سیاسی اور فوجی طاقت میں اضافہ کرنا شروع کیا۔ ہندوستان میں کمپنی کا معاشی کنٹرول 18ویں صدی کے وسط تک مضبوط ہوگیا، خاص طور پر پلاسی کی جنگ (1757) کے بعد جب کمپنی نے بنگال میں اپنی پوزیشن مضبوط کی۔ اس عمل نے رفتہ رفتہ ہندوستان کے لیے برطانوی کالونی بننے کی راہ ہموار کی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں اپنا معاشی کنٹرول مضبوط کرنے کے لیے کئی اقدامات کیے تھے۔ کمپنی نے ہندوستانی وسائل کا بہت زیادہ استحصال کیا اور تجارت پر مکمل کنٹرول حاصل کرلیا۔ اس نے ہندوستان سے مصالحہ جات، ٹیکسٹائل اور دیگر خام مال برآمد کیا جبکہ ہندوستانی مارکیٹ میں برطانیہ میں بنی مصنوعات فروخت کیں۔ مزید برآں، ہندوستانی کسانوں کو بھاری ٹیکسوں اور استحصال کا نشانہ بنایا گیا، جس سے ان کی معاشی حالت خراب ہوگئی۔ کمپنی نے ہندوستانی صنعتوں کو بھی تباہ کردیا، خاص طور پر ٹیکسٹائل کی صنعت، جس سے ہندوستان میں بے روزگاری اور غربت بڑھ گئی۔ اس طرح برطانوی معاشی کنٹرول نے ہندوستان کو معاشی طور پر کمزور کردیا۔ اگر ہم برطانوی معاشی کنٹرول کو دیکھیں تو یہ استحصال اور عدم مساوات پر مبنی تھا۔ ہندوستانی وسائل کو برطانیہ کے فائدے کے لیے استعمال کیا گیا، جب کہ ہندوستانیوں کے حالات زندگی خراب ہوتے رہے۔ ہندوستان میں سیاسی آزادی کی کمی اور مقامی صنعتوں کی تباہی نے ہندوستان کو معاشی طور پر کمزور کردیا۔ برطانوی تجارتی پالیسی نے ہندوستانی معاشرے کو گہرے معاشی بحران میں ڈالا، جس سے ہندوستان کی ترقی کئی صدیوں تک رک گئی۔ بالآخر ایسٹ انڈیا کمپنی اور بعد میں برطانوی راج کے تسلط نے ہندوستان میں نہ صرف سیاسی تبدیلیاں لائیں بلکہ ہندوستانی معیشت پر دیرپا اور منفی اثرات بھی چھوڑے، جن کے اثرات آزادی تک محسوس کیے گئے۔

5.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد، طلبا مندرجہ ذیل کی معلومات حاصل کر اپنی ایک نئی سمجھ پیدا کرسکیں گے:

- ہندوستان میں یورپی کمپنیوں کی آمد اور اس کے اسباب،
- ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام، ہندوستان میں آمد، توسیع اور علاقائی طاقتوں کے ساتھ تنازعات
- ایسٹ انڈیا کمپنی کا تجارتی طاقت سے استعمار کی طرف منتقلی، مورخین کا نقطہ نظر اور استعمار کے مختلف مراحل
- ہندوستانی معیشت پر برطانوی کنٹرول اور اس کے اثرات

5.2 ہندوستان میں یوروپی کمپنیوں کی آمد (Arrival of European Companies in India)

ہندوستان قدیم زمانے سے ہی اپنے ثقافتی ورثے اور معاشی خوش حالی کے لیے دنیا بھر میں مشہور رہا ہے۔ ہندوستان کی روحانی اور

ثقافتی ترقی نے یورپ اور ایشیا کے بہت سے اسکالرز اور سیاحوں کو متاثر کیا تھا، کچھ برطانوی مورخین نے یورپیوں کی آمد کا مقصد ہندوستانیوں کو "مہذب" اور "یہاں ایک اعلیٰ تہذیب کی ترقی کرنا" کے طور پر بیان کیا ہے، لیکن زیادہ تر یورپی تاجروں کی آمد کا مقصد دولت کا حصول، تجارتی خوش حالی، اور عیسائیت کا پھیلاؤ تھا، جو وقت کے ساتھ ساتھ سیاسی غلبہ، استعمار اور سامراج میں تبدیل ہو گیا۔

یورپ کے ساتھ ہندوستان کے تجارتی تعلقات یونانیوں اور رومن سلطنت کے زمانے سے ہیں۔ غیر ملکی بنیادی طور پر دو راستوں سے ہندوستان میں داخل ہو سکتے تھے: پہلا شمال مغربی سرحد عبور کر کے مشہور روایتی زمینی راستے سے اور دوسرا سمندری راستے سے۔ زمینی راستہ بلقان علاقوں سے ترکی، فارس، عراق سے ہوتے ہوئے افغانستان پہنچتا تھا، پھر خیبر، کرم، بولان اور گومل وغیرہ کے راستوں سے ہوتا ہوا ہندوستان پہنچتا۔ دوسری طرف یہ آبی گزرگاہ بحیرہ روم یا بحیرہ اسود کے ذریعے بحیرہ احمر، خلیج فارس اور بحیرہ عرب کے راستے ہندوستان پہنچتی۔ یہ تجارتی راستے 14ویں صدی تک بلا مقابلہ چلتے رہے لیکن جیسے جیسے 15ویں صدی میں عربوں کا پھیلاؤ اور اثر و رسوخ بڑھتا گیا یہ راستے غیر محفوظ ہونے لگے۔1453ء میں سلطنت عثمانیہ نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا اور آہستہ آہستہ پورے جنوب مغربی ایشیا اور جنوب مشرقی یورپ پر قبضہ کر لیا۔ جس کی وجہ سے ایشیا کے ساتھ یورپ کے یہ تجارتی راستے بند ہو گئے۔ اس کی وجہ سے یورپی ممالک کو ہندوستان اور مشرقی ایشیا کے ممالک کے ساتھ تجارت کے لیے آبی راستے تلاش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یورپی کمپنیوں کی ہندوستان میں آمد کی مندرجہ ذیل وجوہات بیان کی جا سکتی ہیں۔

5.2.1 یوروپی کمپنیوں کی آمد کے اسباب (Reasons for the Arrival of European Companies)

یورپی تجارتی مواقع کی تلاش میں ہندوستان آئے، کیونکہ ہندوستان میں مصالحے، ریشم اور دیگر قیمتی اشیا موجود تھیں جن کی یورپ میں بہت مانگ تھی۔ یورپ میں نشاۃ ثانیہ کی وجہ سے نئے جغرافیائی راستے دریافت ہوئے، جس میں اس وقت کی ایجاد کردہ کمپاس نے اہم کردار ادا کیا، اس کوشش میں کولمبس اسپین سے ہندوستان کا سمندری راستہ تلاش کرنے کے لیے نکلا، لیکن وہ 1492ء میں امریکہ پہنچ گیا۔ پرتگال کے بارتھولومیو ڈیاز (Bartolomeu Dias) نے 1487ء میں کیپ آف گڈ ہوپ (جنوبی افریقہ کا آخری سرہ) دریافت کیا جسے اس نے کیپ آف سٹارم (Cape of Storm) کہا۔ بعد ازاں اس راستے کی مدد سے واسکوڈی گاما نے 1498 میں ہندوستان جانے والا سمندری راستہ دریافت کیا جس سے یورپ اور ہندوستان کے درمیان تجارت آسان ہو گئی۔ اس سے پہلے ہندوستان کے ساتھ تجارت عرب اور ترک تاجروں کے ذریعے ہوتی تھی اور اٹلی یورپ کے آخری ممالک پر تجارتی غلبہ رکھتا تھا لیکن یورپی اس کنٹرول سے آزاد ہو کر براہ راست تجارت کرنا چاہتے تھے۔ بعض یورپی کمپنیاں مذہب کی تبلیغ کی خواہش بھی رکھتی تھیں۔ ہندوستان کی بے پناہ دولت نے یورپیوں کو اس ملک کی طرف راغب کیا جس کا انہیں مارکو پولو اور بعض دیگر ذرائع سے معلوم ہوا تھا۔ یہ کچھ اہم وجوہات تھیں جن کی وجہ سے یورپی کمپنیوں نے ہندوستان کا رخ کیا۔

5.2.2 ہندوستان میں آنے والی کمپنیاں

1. پرتگالی

ہندوستان میں یورپی کمپنیوں کی آمد کی ترتیب میں بالترتیب پرتگالی، پھر ڈچ، انگریز، ڈینش اور فرانسیسی آئے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اگرچہ ڈچوں کے بعد انگریز ہندوستان میں آئے لیکن برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی سے بھی پہلے قائم ہو چکی تھی۔ پرتگالی کمپنی 1498 میں واسکوڈی گاما کے ذریعے ہندوستان پہنچی، جب وہ ایک ہندوستانی تاجر عبدالمجید کی مدد سے سمندری راستے سے ہندوستان کے مغربی ساحل پر کالی کٹ (اب کوزی کوڈ) پہنچا اور تجارت شروع کی۔ کالی کٹ کے حکمران زمورین نے اس کا استقبال کیا۔ جب وہ یہاں سے اپنے ملک واپس گیا تو اس نے جو سامان لیا تھا اس سے 60 گنا منافع کمایا۔ پرتگالیوں نے مسالوں کی تجارت میں اپنا تسلط قائم کیا اور 1510 میں پرتگالی گورنر البوکرک کی طرف سے غداری اور باہمی اختلاف کا فائدہ اٹھاتے ہوئے گوا کو اپنی سلطنت کا مرکز بنایا۔ 16ویں صدی میں، پرتگالیوں نے بحر ہند میں ایک مضبوط تجارتی نیٹ ورک قائم کیا، لیکن 17ویں صدی میں ڈچ، انگریز اور فرانسیسی کمپنیوں کی طرف سے تجارتی دباؤ بڑھنا شروع ہوا۔ نتیجتاً پرتگالیوں کا اثر ورسوخ کم ہونے لگا۔ 1961 میں ہندوستانی فوج نے گوا پر قبضہ کر لیا، جس کے بعد پرتگالی سلطنت مکمل طور پر ختم ہو گئی۔ ہندوستان پر اس کا اثر یہ ہوا کہ پرتگالیوں نے ہندوستان کے لیے یورپی تجارتی راستے کھولنے میں اہم کردار ادا کیا، جب کہ بعد میں انگریزوں نے تجارت پر طاقت اور کنٹرول حاصل کر لیا۔ پرتگالیوں کا اثر ہندوستانی سمندری تجارت اور ثقافتی تبادلے پر بھی پڑا، خاص طور پر گوا اور دیگر ساحلی علاقوں میں۔

2. ڈچ اور فرانسیسی

ڈچ بھی کیپ آف گڈ ہوپ کو عبور کر کے 1595ء میں ہندوستان پہنچے۔ اگرچہ انہوں نے 1602 عیسوی میں ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی، لیکن ان کی ہندوستان کے مقابلے انڈو-چائنا میں زیادہ دلچسپی رہی، جہاں گرم مصالحے اگائے جاتے تھے۔ ہندوستان میں ان کی تجارتی بستیاں سورت، بھروچ، کیمبے، احمد آباد، کوچین، ناگا پٹنم، مچلی پٹنم، چنسورہ (بنگال)، پٹنہ اور آگرہ میں تھیں۔ وہ ہندوستان سے سوتی کپڑا، کچا ریشم، افیون اور نیل برآمد کرتے تھے، لیکن جلد ہی وہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان مقابلے کا شکار ہو گئے، جس کی بڑی وجہ کمپنی کے کام میں ڈچ حکومت کی ضرورت سے زیادہ مداخلت تھی، تجارت کو کم اہمیت دی گئی۔ اس کے علاوہ ولندیزیوں کا رویہ بھی تسلی بخش نہیں تھا۔ اس کے بعد برطانوی کمپنی ہندوستان میں آگئی جس کا آگے تفصیل سے ذکر کیا جائے گا۔ فرانسیسی سب سے آخر میں پہنچے۔ فرانس کے وزیر کیلبرٹ نے لوئس XIV کے دور میں 1664ء میں ایک کمپنی قائم کی جس کا مقصد سیاسی غلبہ قائم کرنا، فرانسیسی حکومت کو مضبوط کرنا اور عیسائیت کا پرچار کرنا تھا۔ ہندوستان میں پہلی فرانسیسی فیکٹری سورت میں 1668ء میں کھولی گئی۔ 1674ء میں فرانسس مارٹن نے پانڈیچیری شہر قائم کیا اور چندر نگر (بنگال) میں ایک کارخانہ قائم کیا، جہاں سے سوتی کپڑے اور ریشم خرید کر برآمد کرنے کے لیے بھیجے جاتے تھے، لیکن یہ کمپنی بھی یورپی مسابقت کی وجہ سے منافع بخش نہ ہو سکی، جب 1742ء میں ڈوپلیکس پانڈیچیری کا گورنر بنا تو فرانسیسی کمپنی مختلف مسائل پر برطانیہ کمپنی سے اُلجھ گئی، جس کا نتیجہ تین کرناٹک جنگوں کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ بالآخر کارناٹک جنگ میں فرانسیسیوں کو شکست ہوئی اور

ہندوستان میں ان کی طاقت ختم ہونے لگی۔ اب یورپ کی صرف ایک طاقت ہندوستان میں رہ گئی ہے جسے ہم ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے جانتے ہیں۔ اس کمپنی نے 1858 تک ہندوستان پر حکومت کی اور 1858 کے بعد ہندوستان برطانوی سامراجیت کا حصہ بن گیا۔

5.3 ایسٹ انڈیا کمپنی (East India Company)

ان یورپی طاقتوں میں، جنہوں نے ہندوستان اور بحر ہند کے علاقے میں آکر نئی تجارتی سرگرمیاں شروع کیں، اُن میں برطانیہ سب سے زیادہ کامیاب اور بااثر ثابت ہوئے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ مشرقی ممالک کی طرف تجارتی مقابلے میں انگریز نسبتاً دیر سے آئے لیکن وہ باقی یورپی طاقتوں کو شکست دے کر سب سے آگے بڑھ گئے، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ برطانیہ ہندوستان سمیت ایشیائی تجارت کی نوعیت کو سمجھنے میں کامیاب رہے اور اس کے لیے انہوں نے فوجی سیاسی طاقت کا سہارا لیا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ انگلستان کی صارفی ثقافت، صنعتی ترقی، طلب و رسد کے توازن اور سازگار سیاسی صورت حال نے سرمایہ کاری کے رجحان کی بہت حوصلہ افزائی کی۔ 16ویں صدی کے نصف آخر تک ایشیائی اشیا یورپ پہنچنا شروع ہو گئیں۔ اس منافع بخش تجارت نے انگریزوں کو مشرق کی طرف آنے کی ترغیب دی۔ 1579ء میں فرانسس ڈریک نامی ایک انگریز ملاح (بحری قزاق) نے لزبن جانے والے پرتگالی جہاز کو لوٹ لیا۔ اس لوٹ مار کے مال میں اسے ہندوستان کی معاشی خوش حالی کا علم ہوا اور کچھ نقشے بھی ملے۔ اس سے اسے کیپ آف گڈ ہوپ کی طرف جانے والے راستے کا علم ہوا۔ انگلینڈ کی ملکہ الزبتھ نے بہت سے نیویگیٹر (جہاز ران) کو اس سمت جانے کی ترغیب دی۔ اسی دوران 1588ء میں ہسپانوی آرماڈا پر انگریزوں کی فتح نے ان کا مزید حوصلہ بڑھایا۔ 1599 عیسوی میں ایک بہادر تاجر ملڈن ہال نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا۔

24 ستمبر 1599 کو 217 انگریز تاجر لارڈ میئر کی سربراہی میں لندن میں جمع ہوئے تاکہ ہندوستان کے ساتھ تجارت کے لیے لندن میں ایک کمپنی قائم کی جائے، جس کے لیے تقریباً 30,000 پاؤنڈ جمع کیے گئے۔ اگلے سال 23 ستمبر 1600ء کو فاؤنڈر ہال میں دوبارہ ایک میٹنگ ہوئی اور رقم بڑھ کر 68,373 پاؤنڈ ہو گئی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا آغاز "گورنر اینڈ کمپنی آف مرچنٹس آف لندن ٹریڈنگ ان ٹو دی ایسٹ انڈیز" (Governor and Company and Merchants of London Trading in to the East Indies) کے نام سے ہوا۔ 31 دسمبر 1600 عیسوی کو ملکہ برطانیہ الزبتھ نے ایک شاہی فرمان (رائل چارٹر) دیا جس میں اس کمپنی کو مشرقی ممالک کے ساتھ 15 سال تک تجارت کرنے کی اجازت دی گئی اور اس دور میں بھی جب تجارتی نظریات کا غلبہ تھا، اسے اپنے کاروبار کے اخراجات پورے کرنے کے لیے ملک سے قیمتی دھاتیں (Bullion) باہر لے جانے کی اجازت دی گئی۔ اس حکم نامے کو چارٹر ایکٹ کہا گیا۔ یہ کمپنی لارڈ میئر کی سربراہی میں شروع ہوئی تھی، اسی لیے اسے میئرز کمپنی بھی کہا جاتا تھا۔ الزبتھ اول بھی اس کمپنی کے شیئر ہولڈرز میں سے ایک تھیں۔ کمپنی کو آسانی سے چلانے کے لیے ایک کورٹ آف ڈائریکٹرز یا بورڈ آف ڈائریکٹرز تشکیل دیا گیا جس میں اس کے 26 اراکین شامل تھے۔ ان میں سے ایک بطور ڈائریکٹر اور ایک ڈپٹی ڈائریکٹر اور 24 ممبران کے طور پر کام کرتے تھے۔ تھامس اسمتھ کو اس کمپنی کا پہلا گورنر بنایا گیا۔

کمپنی نے 1613 عیسوی میں سورت میں ایک مستقل فیکٹری قائم کر ہندوستان میں اپنے کاروبار کا باقاعدہ آغاز کیا۔ اس سے پہلے بھی

ولیم ہاکنز جو ترکی اور فارسی زبانوں پر عبور رکھتا تھا،1608ء میں ہیکٹر نامی بحری جہاز میں انگلستان کے بادشاہ جیمز اول کی طرف سے اکبر کو لکھا گیا خط لے کر سورت کی بندرگاہ پر پہنچا تھا اور 1609ء میں جہانگیر کے دربار میں حاضر ہوا تھا۔ لیکن پرتگالیوں کی وجہ سے اسے کامیابی نہ مل سکی۔ اس کا نامکمل کام 1615 میں ایک اور برطانوی ایلچی تھامس رو نے مکمل کیا جسے جیمز اول نے کمپنی کی جانب سے مغل دربار میں بھیجا تھا۔ 1623 عیسوی تک انگریزوں نے سورت، بھروچ، احمد آباد، مسولی پٹنم، آگرہ اور اجمیر میں اپنے کارخانے قائم کر لیے تھے۔ 1640 عیسوی میں مدراس شہر قائم کرنے کے بعد اس نے اپنے دفاع کے لیے فورٹ سینٹ جارج قلعہ بنایا۔ 1651ء میں برج مین کی قیادت میں ہگلی میں ایک کوٹھی بھی کھولی گئی۔ ہگلی کے بعد قاسم بازار، پٹنہ اور راج محل میں انگریزوں کے کارخانے قائم ہوئے۔ 1668ء میں کمپنی نے چارلس دوم سے 10 پاؤنڈ سالانہ کرائے پر بمبئی بھی حاصل کر لیا، قابل ذکر ہے کہ بمبئی شہر چارلس دوم نے پرتگالی شہزادی کیتھرین سے شادی کے موقع پر جہیز میں حاصل کیا تھا۔ بنگال کے صوبیدار عظیم اُلشان نے بنگال کے تین گاؤں کی زمینداری صرف 1200 روپے کے عوض انگریزوں کو دے دی جو کہ بالترتیب کالی کاتا، سوتاناتی اور گووندپور تھے۔ انگریزوں نے ان تینوں دیہاتوں کو ملا کر کلکتہ شہر قائم کیا اور ایک مضبوط قلعہ بنایا اور اس کا نام فورٹ ولیم رکھا۔ سر چارلس آئر اس کے پہلے صدر بنے۔ اس طرح کمپنی نے 80 سال کے اندر بمبئی، مدراس اور کلکتہ کی تین بڑی بندرگاہوں پر قبضہ جما لیا۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد 1715ء میں کمپنی نے جان سرمن کی سربراہی میں مغل دربار ایک وفد بھیجا جس کا مقصد مغل ہندوستان میں مراعات حاصل کرنا اور کلکتہ کے آس پاس کے 38 گاؤں حاصل کرنا تھا۔ اس وفد میں ایک ڈاکٹر ہیملٹن بھی تھا جو مغل حکمران فرخ سیار کو ایک خوفناک بیماری سے نجات دلانے میں کامیاب رہا۔ شہنشاہ خوش ہوا اور 1717 عیسوی میں پہلے سے موجود سہولت کو تسلیم کیا، کمپنی کے کاروبار کو ٹول اور ٹیکس سے آزاد کر دیا اور کلکتہ کے قریب کچھ گاؤں تحفے میں دے دیے۔ نیز، بمبئی ٹکسال سے جاری ہونے والے برطانوی سکوں کو مغلیہ سلطنت میں پہچان ملی۔ کمپنی کو کاروباری ٹیکس سے استثنیٰ دینے کا حکم نامہ موصول ہوا۔ اس حکم نامے کو کمپنی کا میگنا کارٹا کہا جاتا ہے۔ کمپنی کے اس کارنامے نے بعد میں برطانوی سلطنت کے قیام کی راہ ہموار کی۔

5.3.1 برطانیہ حکومت کا علاقائی طاقتوں کے ساتھ جدوجہد

ایسٹ انڈیا کمپنی کا استحکام اور ہندوستان میں اس کی طاقت کی توسیع زیادہ تر علاقائی طاقتوں کے ساتھ تنازعات کے نتیجے میں ہوئی۔ 1600 میں قائم ہونے والی یہ کمپنی ابتدا میں صرف تجارتی مقاصد کے لیے ہندوستان میں داخل ہوئی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس نے برصغیر پاک و ہند میں سیاسی اثر و رسوخ اور کنٹرول قائم کرنا شروع کر دیا۔ اس کے لیے کمپنی نے بہت سی مقامی طاقتوں سے لڑائی کی، جن میں بنیادی طور پر بنگال، مراٹھا، حیدرآباد اور دیگر علاقائی ریاستیں شامل تھیں۔

سب سے پہلے، کمپنی نے 1757 میں پلاسی کی جنگ میں بنگال کے نواب سراج الدولہ کو شکست دی۔ اس جنگ نے کمپنی کو بنگال میں سیاسی کنٹرول قائم کرنے کا موقع فراہم کیا۔ اس کے بعد 1764 میں بکسر کی لڑائی میں کمپنی نے میر قاسم، شجاع الدولہ (اودھ) اور مغل بادشاہ شاہ عالم کی مشترکہ افواج کو شکست دے کر اپنی پوزیشن مضبوط کی اور الہ آباد کے دو معاہدوں (12 اور 16 اگست 1765) سے بنگال،

بہار اور اڑیسہ کی دیوانی حاصل کی جس سے اس کی طاقت میں مزید اضافہ ہوا۔ ان تنازعات کے دوران، کمپنی نے ہندوستانی ریاستوں کے درمیان لڑائی کا فائدہ اٹھایا اور آہستہ آہستہ اپنی طاقت میں اضافہ کیا۔

بنگال میں اقتدار قائم کرنے کے بعد، کمپنی نے میسور اور مراٹھا شاہی ریاستوں کے ساتھ تنازعات بھی لڑے۔ 1761 میں پانی پت کی جنگ کے بعد، مراٹھوں کی طاقت کا توازن کمزور پڑ گیا اور برطانوی کمپنی نے تین اینگلو-مراٹھا جنگوں میں ان کے بڑے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ میسور کے نوابوں، حیدر علی اور ٹیپو سلطان کو بھی کمپنی کے خلاف جدوجہد کرنی پڑی، لیکن کمپنی نے اپنی فوجی طاقت اور سیاسی دانشمندی کی وجہ سے میسور کی شاہی ریاست کو چار اینگلو میسور جنگوں میں ختم کر دیا۔

اس کے علاوہ، سکھوں اور دیگر قبائلی گروہوں کے ساتھ تنازعات بھی ہوئے، لیکن برطانوی فوج کی برتری اور کمپنی کی طرف سے اختیار کی گئی تقسیم اور فتح کی حکمت عملی نے اسے ہندوستان میں اپنی گرفت برقرار رکھنے میں مدد دی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا استحکام زیادہ تر ہندوستانی ریاستوں کے درمیان ان تنازعات اور اختلافات کی وجہ سے تھا، جس نے کمپنی کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنے کے مواقع فراہم کیے تھے۔ برطانوی حکومت کی طرف سے وسائل کی مسلسل حمایت اور فراہمی نے کمپنی کو اضافی فوجی اور انتظامی اختیارات دیے، اس طرح اس کا کنٹرول اور استحکام قائم ہوا۔ رفتہ رفتہ یہ تنازعہ برطانوی سلطنت کی بنیاد ڈالنے کا باعث بنا، جو بالآخر ہندوستان میں برطانوی راج پر منتج ہوا۔

5.4 کمپنی کا نوآبادیات کی طرف منتقلی (The Company's Transition to Colonialism)

ابتدا میں انگریز ہندوستان میں صرف تاجر کے طور پر آئے تھے۔ ان کا بنیادی مقصد ہندوستانی تجارت میں منافع کمانا تھا۔ اسی مقصد سے کیپٹن ہاکنز کو ہندوستان بھیجا گیا تھا۔ انگریزوں نے وقتاً فوقتاً ملنے والی تجارتی سہولتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی تجارت کو وسعت دی۔ کمپنی بیرون ملک سے تیار مال یا قیمتی دھاتیں ہندوستان لاتی تھی اور بدلے میں سوتی کپڑے، مصالحے، سالٹ پیٹر، انڈیگو اور ہاتھی دانت کی اشیا وغیرہ فروخت کرتی تھی جن کی بیرونی ممالک میں بہت زیادہ مانگ تھی۔ جس کی وجہ سے اسے کافی منافع ہوا۔ پی جے مارشل کا یہ بھی ماننا ہے کہ 1785ء تک (یعنی پٹس انڈیا ایکٹ کی منظوری تک) انگریزوں کے پاس ہندوستان کی سیاسی فتح کے حوالے سے کوئی مربوط پالیسی نہیں تھی۔ انگلستان میں طاقت ایسٹ انڈیا کمپنی کے کورٹ آف ڈائریکٹرز اور برطانوی حکومت کی کمزور ریگولیٹری طاقت کے درمیان تقسیم رہی، اور ان میں سے کوئی بھی 1784 تک ہندوستان کے علاقے کو فتح کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا، حالانکہ اس وقت تک ان کے ہاتھ میں ہندوستان کا ایک بڑا علاقہ آچکا تھا۔ مارشل کے مطابق، "اس طرح ہندوستان میں نوآبادیاتی کی ترقی نہ تو منصوبہ بندی کی گئی تھی اور نہ ہی برطانیہ کی طرف سے ہدایت سے کی گئی تھی۔" یہ ہندوستان میں کام کرنے والے کمپنی کے افسران کی پہل تھی جس نے مستقبل کے لائحہ عمل کا تعین کیا، اس کے باوجود فتح کی مہم یا نوآبادیات کے حق میں لندن سے کوئی پالیسی ہدایات نہیں دی گئیں۔ لیکن مغل اقتدار کے زوال کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سیاسی تقسیم اور عدم استحکام نے کمپنی کی علاقائی توسیع میں اضافہ کیا۔ سی اے بیلی کا استدلال ہے کہ 1780 کی دہائی کے بعد بھی، سامراج کی توسیع بنیادی طور پر تجارتی مفادات کے بجائے کمپنی کی مالی اور فوجی ضروریات کی وجہ سے تھی۔

تاریخ دانوں کا ایک گروپ، جیسے سی ایچ فلپس اور جان کین، کا خیال ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا نو آبادیاتی نظام میں منتقلی زیادہ تر تنازعات کا عمل تھا۔ انہوں نے نشاندہی کی کہ کمپنی آہستہ آہستہ اپنی کاروباری سرگرمیوں سے حکمرانی کی طرف منتقل ہو گئی۔ پلاسی اور بکسر کی لڑائیوں کے نتیجے میں کمپنی نے مقامی حکمرانوں کو شکست دی اور ہندوستان میں اپنا اقتدار قائم کیا۔ اس نظریے کے مطابق، کمپنی کا مقصد تجارتی تھا، لیکن اس کی سیاسی اقتدار میں منتقلی بتدریج ہوئی کیونکہ اسے ہندوستانی ریاستوں کے ساتھ تنازعات کا سامنا کرنا پڑا اور ہندوستانی وسائل کا استحصال شروع ہوا۔ کچھ مورخین، جیسے سنتنو کماری اور سدھیر چندر کا ماننا ہے کہ کمپنی کی نو آبادیات میں منتقلی براہ راست اس کے معاشی مفادات سے منسلک تھی۔ ان کی رائے یہ ہے کہ کمپنی نے ہندوستانی وسائل اور کارکنوں کا استحصال کرنے کے لیے اپنی طاقت کو بڑھانا ضروری سمجھا۔ انہوں نے ہندوستانی صنعتوں کو تباہ کر دیا، جیسے کہ خام مال کی برآمد میں اضافہ کر کے اور ہندوستان کی معیشت پر کنٹرول حاصل کر کے انگلش ساختہ ٹیکسٹائل کی مارکیٹ بنالی۔ کچھ معاصر تاریخ دانوں کا کہنا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہندوستان میں سیاسی اور فوجی کنٹرول قائم کرنے کا مقصد شروع سے ہی نو آبادیاتی تھا۔ ایرک ہوبسبوم اور سیموئل ٹیلر جیسے مورخین کے مطابق، کمپنی کا کام آہستہ آہستہ نو آبادیاتی حکمرانی کو تبدیل کرنا تھا۔ یہ نظریہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ برطانوی سلطنت نے کمپنی کی سربراہی میں ہندوستان میں اپنے مفادات قائم کرنے کے لیے اقدامات کیے جو تجارتی مفادات سے نکل کر سیاسی اور فوجی کنٹرول میں آگئے۔ ہندوستانی مورخین کے ایک اور گروپ کا خیال ہے کہ کمپنی کی نو آبادیات نے ہندوستانی معاشرے اور ثقافت پر گہرا اثر ڈالا۔ راج نارائن نہرو اور وکٹر برنارڈ جیسے مورخین نے دلیل دی کہ کمپنی نے نہ صرف ہندوستان میں سیاسی کنٹرول قائم کیا بلکہ ہندوستانی سماج کو اس کی خود مختاری سے بھی محروم کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ کمپنی نے ہندوستانی عوام کے فطری حقوق کی خلاف ورزی کی اور مقامی ثقافتوں، روایات اور سیاسی نظام کو مجروح کیا۔

مجموعی طور پر، مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی نو آبادیات میں منتقلی ایک پیچیدہ اور کثیر جہتی عمل تھا، جس میں تجارتی، سیاسی اور ثقافتی عوامل شامل تھے۔ کمپنی نے آہستہ آہستہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں اپنی طاقت قائم کی اور اس عمل میں ہندوستانی سماج، معیشت اور سیاست کو اپنی خواہشات کے مطابق جھکا دیا۔ اس منتقلی کے نتیجے میں برصغیر پاک و ہند میں برطانوی سلطنت کی بنیاد پڑی، جو 1857 کی بغاوت کے بعد باقاعدہ طور پر برطانوی راج پر منتج ہوئی۔

استعمار کا مطلب ہے کسی قومیت کا اس کی سرحدوں سے باہر توسیع۔ اس کی نوعیت معاشی ہے۔ اس میں جیتنے والے ملک کی حکمرانی مطلق العنان ہے۔ درحقیقت یہ سامراج کی نسبتاً نئی شکل ہے۔ پلاسی اور بکسر کی لڑائیوں کے بعد انگریزوں نے بنگال کی خوش حالی پر اپنا مکمل تسلط قائم کر لیا۔ نتیجے کے طور پر، ہندوستانی معیشت فاضل اور خود انحصاری کی معیشت سے نو آبادیاتی معیشت میں تبدیل ہو گئی۔ ہندوستان برطانیہ کے لیے محض خام مال پیدا کرنے والی ایک وسیع زمین اور اس کے تیار کردہ مال کے استعمال کے لیے ایک وسیع بازار بن گیا۔ یہ کیسے ممکن ہوا اس کا تفصیلی تجزیہ رجنی پام دت نے اپنی مشہور کتاب "انڈیا ٹوڈے" میں کیا ہے۔ انہوں نے ہندوستان میں برطانوی استعمار کو بنیادی طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا ہے:

1. تجارتی سرمایہ داری (Commercial Capitalism)،

2. صنعتی سرمایہ داری (Industrial Capitalism) اور

3. مالیاتی سرمایہ داری (Finance Capitalism)

1. تجارتی سرمایہ داری (Commercial Capitalism)

تجارتی سرمایہ داری 1757ء سے شروع ہوئی اور 1813ء تک قائم رہی۔ یہ پلاسی میں کمپنی کی فتح کے نتیجے میں بنگال کے ساتھ تجارت اور لوٹ مار کے ایک خاص دور سے شروع ہوا اور 1813 عیسوی تک جاری رہا۔ اس دور میں کمپنی کے تین بنیادی مقاصد تھے: تجارت پر اجارہ داری قائم کرنا اور ممکنہ حریفوں کو ختم کرنا۔ دوسرا، کمپنی کم قیمتوں پر اشیا خرید کر زیادہ قیمتوں پر فروخت کرے اور تیسرا، مندرجہ بالا دونوں مقاصد کے حصول کے لیے ملک پر سیاسی کنٹرول قائم کرے۔ پارسیول سپیر نے استعمار کے اس پہلے مرحلے کو "کھلی اور بے شرم لوٹ مار" قرار دیا۔ اس دور میں برطانوی راج کے نتائج ہندوستان کی دستکاری کی صنعت کے لیے مہلک ثابت ہوئے۔ بنگال پر قبضہ کرنے کے بعد، کمپنی نے کاریگروں کو مجبور کیا کہ وہ صرف کمپنی کے لیے مال تیار کریں۔ اس مال میں کتنی گنجائش ہونی چاہیے، کس مقدار میں اور کس قیمت پر، یہ بھی کمپنی نے طے کیا۔ اس طرح کمپنی کے وجود میں آنے کے پچاس سال کے اندر اندر ہندوستانی دستکاری کی صنعت مکمل طور پر تباہ ہو گئی اور ملک کی معیشت مکمل طور پر زراعت پر مبنی ہو گئی۔

2. مالیاتی سرمایہ داری (Finance Capitalism)

19ویں صدی کے آغاز تک برطانیہ میں صنعتی انقلاب کی وجہ سے سرمائے کا غلبہ قائم ہو گیا۔ اس کی وجہ سے انگلستان میں پیدا ہونے والے نئے صنعت کار طبقے کی ضروریات تاجر طبقے سے مختلف تھیں۔ ان کے لیے کالونیاں ایسی منڈیاں تھیں جہاں وہ اپنی صنعتی مصنوعات بیچ کر منافع کما سکتے تھے اور ان کالونیوں سے سستے داموں میں خام مال اور غذائی اجناس حاصل کر سکتے تھے۔ نوآبادیات کی اہمیت میں اس تبدیلی نے ہندوستان میں برطانوی سامراج کی شکل کو بھی متاثر کیا اور استحصال کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا جسے صنعتی سرمایہ داری کے مرحلے کا نام دیا گیا ہے۔ اس کی شروعات 1813 عیسوی سے کی جا سکتی ہے، جب ہندوستان میں تجارت پر کمپنی کی اجارہ داری ختم ہو گئی تھی۔ یہ دور 1858ء میں اپنے عروج پر پہنچا۔ اس سامراج کی وجہ سے ہندوستانی صنعتیں منظم طریقے سے تباہ ہو گئیں۔ ہندوستانی دستکاری کو پہلے غیر ملکوں سے اور پھر ہندوستانی بازار سے باہر کر دیا گیا۔ یہ پالیسی خاص طور پر ٹیکسٹائل انڈسٹری کے حوالے سے اپنائی گئی۔ اس پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے امتیازی امپورٹ ایکسپورٹ ٹیکس لگائے گئے۔ انگلستان کی صنعتوں میں تیار ہونے والے سوتی کپڑے جب ہندوستان آئے تو 3 سے 5 فیصد تک درآمدی ٹیکس عائد کیا گیا، جب کہ ہندوستان سے نکلنے والے کپڑوں پر 10 فیصد ایکسپورٹ ٹیکس لگایا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی کپڑے مہنگے ہو گئے جس کے نتیجے میں ان کی مانگ کم ہو گئی۔ اسی طرح کی پالیسی دیگر اشیا پر بھی نافذ کی گئی۔ اس مرحلے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستانی خام مال اور غذائی اجناس کی برآمدات میں اضافہ ہوا جس کی وجہ سے ملک میں غذائی اجناس کی قلت اور قیمتوں میں اضافہ ہوا۔ لیکن اس نئے مرحلے میں کمپنی کو کئی ترقیاتی کام کرنے پر بھی مجبور ہونا پڑا۔ مثال کے طور پر، خام مال کو بندرگاہوں تک پہنچانے کے لیے ریلوے کی ترقی، انتظامی کاموں کے لیے تعلیم یافتہ ملازمین کی ضرورت اور کاروباری تنظیموں اور اداروں نے ایک نئے تعلیمی نظام کی تشکیل کی

تحریک دی۔ ان تبدیلیوں نے بعد میں ہندوستانی قوم پرستی کو بہت مضبوط کیا۔

3. مالیاتی سرمایہ داری (Finance Capitalism)

ہندوستان میں 1947-1858 کے درمیان مالیاتی سرمایہ داری کا ایک مرحلہ تھا۔ 1857 کی بغاوت کے بعد برطانوی سرمایہ داروں نے ہندوستان میں بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کی۔ اس کی بہت سی وجوہات تھیں: پہلی، برطانیہ میں صنعتی ترقی اور نو آبادیاتی منڈیوں کے استحصال کے نتیجے میں جمع ہونے والا بے پناہ سرمایہ، دوم، انگلستان میں مارکس اور اینگلز کے سوشلسٹ نظریاتی اثر و رسوخ سے سرمایہ دار خوفزدہ تھے کہ اگر انگلستان میں سوشلسٹ انقلاب کامیاب ہو گیا تو ان کا سارا سرمایہ ضائع ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ہندوستان میں سستے لیبر کی دستیابی۔ یہ سرمایہ کاری بنیادی طور پر ریلوے، باغات (چائے، کافی، انڈیگو وغیرہ)، سڑکوں، آبپاشی، بینکنگ اور حکومت کو قرض دینے میں کی گئی تھی۔ قابل ذکر ہے کہ 1858ء میں حکومت ہند کے قرضوں میں زبردست اضافہ ہوا تھا۔ یہ قرض زیادہ تر برطانوی سرمایہ داروں نے دیا تھا۔ ہندوستان میں ریلوے منافع کی گارنٹی کے نظام کے ذریعے نجی سرمائے کا استعمال کرتے ہوئے تعمیر کی گئی تھی، جس کے مطابق اس سرمایہ کاری پر 5 فیصد منافع کی ضمانت حکومت نے دی تھی۔ ہندوستان میں مالیاتی سرمائے کی برآمد کے نتیجے میں ہندوستان میں صنعتی ترقی نہیں ہوئی اور ہندوستان کی زائد آمدنی منافع کی صورت میں باہر چلی گئی اور ہندوستان غیر ملکی سرمائے کے چنگل میں پھنس گیا۔

5.5 ہندوستان میں برطانوی معاشی کنٹرول کی نوعیت کا تنقیدی جائزہ

انگریزوں سے پہلے ہندوستانی معیشت دیہی تھی اور ملک کی 90 فیصد سے زیادہ آبادی دیہات میں رہتی تھی۔ یہاں زراعت اور دستکاری نمایاں تھی اور مواصلاتی نظام کے پسماندہ ہونے کی وجہ سے دیہاتوں نے ایک الگ اکائی کی شکل اختیار کرلی۔ یہاں کا اصل کاروبار زراعت تھا لیکن صنعت کے شعبے میں بھی ترقی ہوئی۔ شہر انتظامی اکائیوں اور تجارتی مراکز کے طور پر کام کرتے تھے۔ ہندوستان کا تیار کردہ سامان پوری دنیا میں مشہور تھا۔ ہندوستان کے سوتی اور ریشم کے کپڑے دنیا میں بہترین معیار کے سمجھے جاتے تھے۔ یہاں سنگ مرمر کا کام، لکڑی کی تراش خراش کا کام، سونے چاندی کے زیورات اور پتھروں کی تراش خراش کا کام بہت اچھے معیار کا تھا، اس لیے ان کا بیرونی ممالک میں بہت مانگ رہتی، ان برآمدی اشیا میں نیل، افیون، مسالے اور ہاتھی کے دانت وغیرہ بھی شامل تھے۔ پلاسی کی جنگ سے پہلے یورپ کے ساتھ ہندوستان کی تجارت ہندوستان کے لیے منافع بخش تھی۔ لیکن کمپنی کے اقتدار میں آنے کے بعد ہندوستانی معیشت پر منفی اثرات مرتب ہوئے۔ زراعت، تجارت اور صنعت جیسے تمام شعبوں میں خلل نظر آتا ہے۔ بے پناہ دولت اور زمینی محصولات حاصل کرنے کے لیے انگریز حکمرانوں نے ہندوستانی مفادات یا یہاں کے کسانوں کی پرواہ کیے بغیر من مانی پالیسیاں اپنائیں اور کسانوں کا بے شرمی سے استحصال کیا۔ یہاں کی صنعتوں کو تباہ کر کے انگلستان کی صنعتوں میں بننے والے سامان سے بازار بھر گئے۔ زراعت کو تجارتی بنایا گیا۔

ہندوستان پر برطانوی معاشی کنٹرول ایک پیچیدہ اور کثیر جہتی عمل تھا، جس کا بنیادی مقصد برطانوی سامراج کے فائدے کے لیے ہندوستانی وسائل اور محنت کا استحصال کرنا تھا۔ انگریزوں نے ہندوستان کو ایک کالونی کے طور پر استعمال کیا جہاں سے وہ خام مال فراہم کرتے تھے اور تیار مال کے لیے ایک بڑی منڈی فراہم کرتے تھے۔ اس کنٹرول کے نتیجے میں ہندوستانی سماج اور معیشت پر سنگین اثرات مرتب

ہوئے۔ ذیل میں ہم برطانوی معاشی کنٹرول کے مختلف پہلوؤں پر تنقیدی نقطہ نظر سے بحث کریں گے۔

- برطانوی سامراج نے بڑے پیمانے پر ہندوستان سے خام مال کا استحصال کیا، جیسا کہ کپاس، ریشم، چینی، نمک، جڑی بوٹیاں اور معدنیات۔ ان وسائل کو برآمد کرنے کے بعد ان کو برطانیہ میں واقع کارخانوں میں تیار کیا جاتا اور پھر وہی تیار شدہ سامان بھارت میں زیادہ قیمتوں پر فروخت کیا جاتا تھا۔ اس عمل نے ہندوستانی کاریگروں اور کاٹیج صنعتوں کو تباہ کر دیا جو پہلے اپنی پیداوار پر انحصار کرتی تھیں۔ مثال کے طور پر، ہندوستانی ٹیکسٹائل کی صنعت، جو کبھی دنیا میں مشہور تھی، برطانوی دور میں تباہ ہو گئی، کیونکہ برطانیہ نے ہندوستان میں اپنی مصنوعات کو لازمی طور پر فروخت کرنا شروع کر دیا۔
- ہندوستانی کاٹیج انڈسٹریز، جیسے ہینڈلوم کی صنعت، بُنائی، مٹی کے برتن اور دیگر گھریلو صنعتوں کو برطانوی دور حکومت میں بہت زیادہ نقصان پہنچا۔ برطانوی حکومت نے ہندوستانی ٹیکسٹائل پر زیادہ ٹیکس لگا کر اور غیر ملکی ٹیکسٹائل کی سستے داموں فروخت کو فروغ دے کر ہندوستانی صنعتوں کو تباہ کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لاکھوں ہندوستانی کاریگر بے روزگار ہو گئے اور ہندوستان میں صنعتی ترقی کی رفتار سست پڑ گئی۔ برطانوی صنعتی انقلاب کے فوائد کا بنیادی ذریعہ ہندوستان کے وسائل تھے جنہوں نے ہندوستان کی معاشی پوزیشن کو کمزور کیا۔
- انگریزوں نے ہندوستان میں نقدی فصلوں (جیسے کپاس، تمباکو اور نیل) کی کاشت کو فروغ دیا، جس سے اناج کی کاشت کم ہو گئی۔ ہندوستان میں غذائی بحران اور قحط کی صورت حال اس لیے پیدا ہوئی کہ زرخیز زمینوں پر نقد فصلیں کاشت کی جا رہی تھیں، جب کہ لوگوں کی غذائی ضروریات پوری نہیں ہو رہی تھیں۔ نیل بغاوت (60-1859) اس معاشی استحصال کی ایک مثال تھی، جہاں کسانوں کو انڈگو کی کاشت کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا، جو ان کے لیے کم ہی منافع بخش ہوتا تھا، اور کسانوں کے لیے زندگی مشکل بنا دیتا تھا۔
- برطانوی دور حکومت میں ہندوستان میں ٹیکس کا نظام بہت سخت تھا۔ ہندوستانی کسانوں سے بھاری ٹیکس وصول کیا جاتا تھا، جب کہ برطانوی حکومت نے ان ٹیکسوں کا بڑا حصہ اپنی فوجی اور انتظامی سرگرمیوں کے لیے استعمال کیا۔ مزید برآں، ہندوستانیوں سے وصول کیے گئے ٹیکس بنیادی طور پر برطانیہ کو بھیجے گئے، جس سے ہندوستان کے خزانے کو نقصان پہنچا۔ زمینداری نظام اور محصولات کے نظام نے کسانوں کو قرضوں اور استحصال میں پھنسا کر ان کی زندگی کو بہت مشکل بنا دیا۔
- انگریزوں نے ہندوستان میں صنعت کاری کو فروغ نہیں دیا کیونکہ انہیں خدشہ تھا کہ اگر ہندوستان میں صنعتی شعبہ ترقی کرتا ہے تو یہ برطانیہ کی صنعتی طاقت کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔ ہندوستان کو ایک کالونی کے طور پر برقرار رکھنے کے لیے، انگریزوں نے ہندوستان کو خام مال کی فراہمی کا واحد ذریعہ بنایا اور اس کے مزدوروں کو سستی مزدوری کے طور پر استعمال کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں جدید صنعت کاری کا عمل سست تھا اور ہندوستانی معیشت میں غیر مساوی ترقی تھی۔
- انگریزوں کی معاشی پالیسیاں پوری طرح اپنے سامراجی مفادات پر مرکوز تھیں۔ برطانوی حکومت نے تجارت اور صنعت کے کنٹرول پر اپنی طاقت کو مضبوط کیا اور ہندوستانی تاجروں اور صنعت کاروں کو معاشی نقطہ نظر سے کمزور کیا۔ ہندوستانی تاجروں کو غیر ملکی تجارت میں مشغول ہونے کی حوصلہ شکنی کی گئی، جس سے برطانوی تاجروں کو مارکیٹ پر اجارہ داری حاصل ہوئی۔

- برطانوی حکومت کے تحت ہندوستانی انتظامیہ میں بدعنوانی اور بدانتظامی بڑے پیمانے پر پھیلی ہوئی تھی۔ برطانوی حکام نے ہندوستانیوں کے استحصال کے لیے بہت سے طریقے استعمال کیے جس کی وجہ سے ہندوستان کے وسائل اور دولت کا بھرپور استحصال کیا گیا۔ انگریزوں نے ہندوستانی وسائل کا بے تحاشہ استحصال کیا اور ہندوستانی سماج کو معاشی طور پر پسماندہ کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستانیوں کی سماجی اور معاشی حالت دن بدن خراب ہوتی گئی۔
- ہندوستان پر انگریزوں کا معاشی کنٹرول بنیادی طور پر اپنے سامراجی مفادات کی تکمیل کے لیے تھا، جس نے ہندوستانی معاشرے اور معیشت کا استحصال کیا۔ یہ کنٹرول نہ صرف ہندوستانی معیشت کے لیے تباہ کن تھا بلکہ ہندوستانی سماج کے لیے بھی انتہائی نقصان دہ تھا۔ ہندوستانی صنعتوں، زراعت اور تجارت کو تباہ کر دیا گیا، جس سے ہندوستان مستقل طور پر ترقی پذیر اور خود انحصار ملک کے بجائے برطانیہ کے معاشی مفادات کے لیے ایک کالونی بن گیا۔ اس استحصال اور عدم مساوات نے ہندوستانی معاشرے میں عدم اطمینان اور بغاوت کو جنم دیا، جو بالآخر آزادی کی جدوجہد کا باعث بنا۔

5.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

- ایسٹ انڈیا کمپنی 1600 میں قائم ہوئی اور ابتدا میں تجارتی مقاصد کے لیے ہندوستان آئی۔
- آہستہ آہستہ کمپنی نے سیاسی اور فوجی کنٹرول حاصل کرنا شروع کیا۔
- پلاسی کی جنگ (1757) کے بعد کمپنی نے بنگال پر قبضہ کر کے اپنی طاقت کو بڑھایا۔
- کمپنی نے کسانوں سے بھاری ٹیکس وصول کیے اور ہندوستانی کاریگروں کا استحصال کیا۔
- ہندوستان کو خام مال فراہم کرنے والا اور برطانوی مصنوعات کا صارف بنا دیا گیا۔
- اس پالیسی سے ہندوستانی صنعت و تجارت زوال کا شکار ہوئیں اور برطانوی ٹیکسٹائل صنعت کو فائدہ پہنچا۔
- 1857 کی بغاوت کے بعد کمپنی کا اقتدار ختم ہوا لیکن اس کا بنایا ہوا نوآبادیاتی ڈھانچہ برصغیر پر دیرپا اثرات چھوڑ گیا۔

5.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

5.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. فرانسیسی کمپنی کی بنیاد کب رکھی گئی؟

(a) 1600 (b) 1664
(c) 1668 (d) 1605

2. کیپ آف گوڈ ہوپ کی دریافت کس نے کی؟

(a) Vasco da Gama (b) William Hawkins
(c) Batolomeu Dias (d) Abdul Majeed

3. ولیم ہاکنس کس مغل بادشاہ کے دربار میں آیا تھا؟

(a) اکبر (b) ہمایوں

(c) شاہجہاں (d) جہانگیر

4. دستک سے کیا مراد ہے؟

(a) ایک فرانسیسی کمپنی کا نام (b) پرتگالیوں کا تجارتی اجازت نامہ

(c) ایسٹ انڈیا کمپنی کا تجارتی اجازت نامہ (d) ایک قسم کی زمین

5. پلاسی کی جنگ میں بنگال کے کس نواب کی شکست ہوئی تھی؟

(a) علی وردی خان (b) مرشد قلی خان

(c) محمد قاسم (d) سراج الدولہ

6. انڈیا ٹوڈے (India Today) کے مصنف کا نام بتائیں؟

(a) بپن چندر (b) ستیش چندر

(c) رجنی پامے دت (d) سمت سرکار

7. ہندوستان میں واسکوڈی گاما کس ساحلی بندرگاہ پر پہنچا تھا؟

(a) کالیکٹ (b) سورت

(c) کورومنڈل (d) مسولی پٹنم

8. برطانیہ حکومت نے ریلوے میں سرمایہ کاری پر کتنے فیصد کی گارنٹی دی؟

(a) 5 (b) 10

(c) 15 (d) 20

9. بلین کیا تھا؟

(a) قیمتیں دھاتیں (b) بڑی جاگیریں

(c) ایک قسم کی توپ (d) بحری تجارتی جہاز

10. مدراس نگر کی بنیاد کس برطانیہ آفیسر رکھی تھی؟

(a) رابرٹ کلائیو (b) فرانسس ڈے

(c) ولیم ہاکنس (d) ٹامس رو

جوابات	1	2	3	4	5	6	7	8	9	10
	b	c	d	c	d	c	a	a	a	d

5.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. ہندوستان میں یوروپی کمپنی کی آمد کے کیا اسباب تھے؟ مختصر میں وضاحت کریں۔
2. ہندوستان میں نوآبادیات کے تجارتی سرمایہ داری(Commercial Capitalism) مرحلے ایک نوٹ لکھیں۔
3. ایسٹ انڈیا کمپنی کے علاقائی ریاستوں کے ساتھ ٹکراؤ پر ایک تنقید نوٹ تحریر کریں۔
4. ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام پر ایک نوٹ قلم بند کریں۔
5. ہندوستان میں نوآبادیات کے مالیاتی سرمایہ داری(Finance Capitalism) مرحلے پر ایک تنقیدی نوٹ لکھیں۔

5.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ایسٹ ینڈیا کمپنی کے قیام اور ہندوستان میں کمپنی کی توسیع کا جائزہ پیش کریں۔
2. ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی طاقت سے نوآبادیات میں منتقلی کو لے کر مورخین کی کیا رائے ہے، تفصیل سے بتائیں۔
3. برطانیہ حکومت کی معاشی پالیسی کے کیا اثرات ظاہر ہوئے۔ وضاحت کریں۔

اکائی 6: آبادی، معیشت، اور تجارت: برطانوی ہندوستان کا تنقیدی جائزہ

(Population, Macroeconomy, Trade-A Crtical Evaluation of British India)

اکائی کے اجزا:

6.0 تمہید (Introduction)

6.1 مقاصد (Objectives)

6.2 برطانوی دور میں آبادی (Population in British India)

6.3 برطانوی ہندوستان کی معیشت (Economy of British India)

6.4 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

6.5 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

6.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

6.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

6.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

6.0 تمہید (Introduction)

ہندوستان کا نو آبادیاتی دور، خاص کر برطانوی راج کے زمانے میں (1757-1947)، ایک ایسا تبدیل کن دور تھا جس نے ملک کی آبادی، معیشت اور تجارت کی صورت ہی بدل کر رکھ دی۔ برطانوی ہندوستانی معاملات کو سمجھنے کے لیے ایک اہم کیس اسٹڈی (Case Study) ہے، خاص طور پر یہ دیکھنے کے لیے کہ کسی نو آبادیاتی نظام میں آبادی کے اتار چڑھاؤ، معاشی پالیسیوں اور تجارت کا آپس میں کیا تعلق تھا۔ برطانوی نو آبادیاتی حکومت نے ایسی پالیسیاں نافذ کیں جن کے ہندوستان کی آبادی، معیشت اور ماحول پر بہت گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ان میں سے بہت سے اثرات آج بھی ملک کی ترقی کی راہ پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ اس اکائی میں ہم برطانوی نو آبادیاتی حکومت کے ہندوستان کی آبادی، کلّی معیشت (Macroeconomy) اور تجارت پر پڑنے والے اثرات کا تنقیدی جائزہ لیں گے۔

6.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے درج ذیل مقاصد ہیں:

- ہندوستان میں آبادی کے بڑھنے اور اس کے پھیلاؤ پر برطانوی نو آبادیاتی پالیسیوں کے اثرات کا تجزیہ کرنا۔

- برطانوی ہندوستان کی کلّی معاشیاتی ساخت (Macroeconomic Structure) اور اس کے طویل مدتی نتائج کا جائزہ لینا۔
- برطانوی راج کے دوران تجارت کے طریقوں (Patterns) اور اس کے ہندوستان کی معیشت پر اثرات کا مطالعہ کرنا۔

6.2 برطانوی دور میں آبادی (Population in British India)

برطانوی ہندوستان میں آبادی کا مطالعہ 1757 میں پلاسی کی لڑائی سے لے کر 1947 میں آزادی تک کے دور کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ مطالعہ تین بڑے آبادیاتی عوامل: وفیات (Mortality)، شرح پیدائش (Fertility)، اور ہجرت (Migration) کے تناظر میں تشکیل پاتا ہے

1. مردم شماری سے پہلے کا دور (1757-1867)

مردم شماری سے پہلے کے دور میں آبادی کے سائز اور اضافے کے بارے میں معلومات محدود ہیں اور اکثر بالواسطہ اندازوں پر مبنی ہیں۔ پہلی معقول طور پر منظم مردم شماری (1867-72) میں مختلف صوبوں میں کرائی گئیں، جس کی تکمیل 1881 کی پہلی تمام ہندوستان کی مردم شماری میں ہوئی۔ اس سے پہلے کے دور کے لیے، برطانوی افسروں اور علماء جیسے مورلینڈ، ولکوکس، کار-سانڈرز، شیراس، سوروپ اور لال کے اندازے اکثر معلوم آبادی کے اعداد و شمار کے درمیان قیاس اور مسلسل اضافے کے مفروضوں پر انحصار کرتے تھے۔ تاہم، بعد کے محققین جیسے ڈیورنڈ، سین گپتا، بھٹاچاریہ اور گجرال نے اس لکیری اضافے کے مفروضے کو چیلنج کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ 1750 تک برصغیر ہندوستان کی آبادی شاید پہلے ہی تقریباً 20 کروڑ تھی، لیکن قحط، وبائی امراض اور سیاسی عدم استحکام کی وجہ سے زیادہ اموات کے باعث انیسویں صدی کے وسط تک آبادی میں بہت کم یا کوئی اضافہ نہیں ہوا۔

تاریخی آبادی کے اندازوں کا تقابلی خلاصہ جدول 6.1 میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ جدول سن 1600 سے 1901 کے درمیان منتخب سالوں کے اعداد و شمار (ملین میں) دیتی ہے۔ مختلف مصنفین کے اندازوں میں بہت فرق ہے، جو طریقہ کار کے فرق اور مردم شماری سے پہلے کے تخمینوں کی غیر یقینی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ مثال کے طور پر، ولکوکس کے 1929 کے سلسلے کے مطابق سن 1750 میں آبادی 144 ملین تھی، جبکہ ڈیورنڈ کے اعلیٰ تخمینے کے مطابق اسی سال آبادی 214 ملین تھی۔ یہ فرق اس بات کی طرف نشاندہی کرتا ہے کہ منظم ڈیٹا کے جمع کرنے سے پہلے کے آبادیاتی تاریخ کو دوبارہ بنانا کتنا مشکل ہے۔

جدول 6.1: برصغیر ہندوستان میں آبادی کی تعداد کے مختلف تخمینے 1600-1901 (ملین میں)

1901	1871	1850	1800	1750	1650	1600	Author / Year
285	232	195	160	144	80	100	**Moreland (1920)**
–	233	190	157	130	80	100	**Willcox (1929)**
232	206	183	139	102	–	–	**Carr-Saunders (1936)**
285	255	242	214	214	–	–	**Durand – high (1967)**
285	255	247	207	190	–	–	**Bhattacharya (1967)**
285	255	224			–	–	**Gujral (1973)**

Source: Bhattacharya, D. (1967). *Population of India: 1751–1961*. Studies Related to Planning for National Development. Calcutta: Indian Statistical Institute.

مختلف صوبوں جیسے مدراس، بمبئی، پنجاب اور شمال مغربی صوبوں میں ابتدائی مردم شماریوں سے نہ صرف ڈیٹا کی حدود واضح ہوئیں، بلکہ آفات کے آبادی پر اثرات بھی سامنے آئے۔ مثال کے طور پر، مدراس پریزیڈنسی میں، پہلی مردم شماری 1822 (13.5 ملین) اور دوسری مردم شماری 37-1836 (14 ملین) کے درمیان آبادی میں بہت کم اضافہ ہوا۔ اس کی بڑی وجوہات ہیضے کی وبا اور 34-1833 کا قحط تھا، جس میں گنٹور ضلع کی آدھی آبادی ختم ہو گئی تھی۔ کچھ بعد کے اعداد و شمار غیر معقول طور پر زیادہ اضافہ دکھاتے ہیں، جیسے 37-1836 اور 52-1851 کے درمیان 57.8 فیصد کا اضافہ۔ ایسا شاید پہلے کے سالوں میں آبادی کی غلط گنتی کی وجہ سے ہوا۔

موت کی شرح، آبادی میں اضافے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے آغاز میں اموات کی شرح تقریباً 45 فی ہزار تخمینہ کی گئی تھی، جبکہ پیدائش کے وقت متوقع عمر 20 سے 25 سال کے درمیان تھی۔ فوجی آبادی کے اعداد و شمار، اگرچہ پورے معاشرے کی نمائندگی نہیں کرتے، لیکن کچھ مقداراتی بصیرت فراہم کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر، جدول 6.2 میں 1833ء کے دہلی کے ڈیٹا کے مطابق پیدائش کی شرح 31.1 فی ہزار، موت کی شرح 35.4 فی ہزار اور قدرتی اضافے کی منفی شرح (4.3-) درج ہے۔ کل اموات کی آدھی سے زیادہ تعداد 10 سال سے کم عمر بچوں میں تھی، جو انتہائی زیادہ بچوں کی اموات کی عکاسی کرتی ہے۔

جدول 6.2: دہلی کے لیے حیاتیاتی اعداد و شمار (1833)

Total	Females	Males	Indicator
31.1	29.0	33.3	**Birth rate (per 1,000)**
35.4	34.8	36.0	**Death rate (per 1,000)**
-4.3	-5.8	-2.7	**Rate of natural increase**
54.6	52.1	56.9	**% deaths under age 10**

Source: Henderson, H. B. (1836). *Results of an Enquiry Respecting the Law of Mortality for British India*. *Asiatic Researches*, 20, 191. Calcutta.

اموات پر قحط اور وبائی امراض کا بہت گہرا اثر تھا۔ 1765 سے 1858 کے درمیان، برصغیر میں بارہ بڑے قحط اور چار شدید قلتِ غذا کے واقعات پیش آئے۔ 1770 کے بنگال کا قحط، جس کی وجہ مون سون کی ناکامی تھی، بدترین واقعات میں سے ایک تھا۔ اس نے بعض اضلاع کی تقریباً ایک تہائی آبادی ختم کر دی۔ وبائی امراض بھی اتنے ہی تباہ کن تھے۔ ہیضہ، جس کا پہلا بڑا حملہ 19-1817 میں ریکارڈ کیا گیا، بہت سے علاقوں میں مقامی بیماری بن گیا اور زیارتی اور تجارتی راستوں کے ساتھ پھیل گیا۔ ملیریا، جو نہروں کی تعمیر اور سڑکوں کے بنانے سے پیدا ہونے والی آب بندی سے جڑا ہوا تھا، بنگال اور شمال مغربی صوبوں کے نہری علاقوں میں ایک دائمی بیماری بن گیا۔ ہوگلی ضلع کی آبادی 1850 کی دہائی کے آخر اور 1870 کی دہائی کے آخر کے درمیان ملیریا کی وجہ سے آدھی رہ گئی تھی۔ دوسری مہلک بیماریوں میں طاعون، چیچک (بیسویں صدی تک ویکسینیشن کی شرح بہت کم تھی)، بنگال اور آسام میں کالا آزار، اور دائمی اسہال کی بیماریاں شامل تھیں۔

مردم شماری سے پہلے کے ہندوستان میں شرح پیدائش زیادہ تھی، لیکن یہ حیاتیاتی حد تک نہیں پہنچ پائی تھی۔ اس کی وجہ کچھ سماجی پابندیاں تھیں جیسے بیواؤں کی دوسری شادی پر روک (خاص طور پر اونچی ذات کے ہندوؤں میں)، کچھ برادریوں میں بچیوں کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالنے کا رواج، اور حاملہ خواتین کی اموات کی بلند شرح۔ چھوٹی عمر میں شادی ہونا عام بات تھی، جس سے بچے پیدا کرنے کا دورانیہ تو بڑھ

جاتا تھا، لیکن ساتھ ہی بیوہ ہونے اور بعد میں بانجھ ہونے کا خطرہ بھی بڑھ جاتا تھا۔ مختلف علاقوں کے اعداد و شمار کے مطابق 1820 کی دہائی کے شروع میں ویگانگا (وسطی ہندوستان) میں شرح پیدائش 38 سے 41 فی ہزار تھی، جبکہ دہلی میں 1833 میں یہ شرح کم یعنی 31 فی ہزار ریکارڈ کی گئی، جس کی وجہ شاید پیدائش کی کم رپورٹنگ تھی۔

اس طرح برطانوی ہندوستان کی آبادیاتی تاریخ کا مردم شماری سے پہلے کا حصہ ایک ایسے معاشرے کو ظاہر کرتا ہے جو زیادہ اموات اور زیادہ شرح پیدائش کے دائرے میں پھنسا ہوا تھا، جہاں آبادی میں اضافہ بہت کم تھا۔ آبادی کے استحکام کا توازن بلند شرح پیدائش اور اسی طرح کی بلند شرح اموات کے درمیان برقرار تھا، اور یہ دونوں ماحولیاتی، سماجی اور معاشی عوامل سے تشکیل پاتی تھیں۔ مردم شماری سے پہلے کے دور کے اعداد و شمار کو محتاط طریقے سے استعمال کرنا چاہیے، لیکن مجموعی تصویر واضح ہے: انیسویں صدی کے آخر سے پہلے، برصغیر ہندوستان کو قحط، بیماریوں اور عوامی صحت کی خراب حالت سے بار بار آبادیاتی بحرانوں کا سامنا تھا، جہاں زندہ رہنے میں ہونے والی کوئی بھی معمولی بہتری فوری طور پر نئی آفات سے ختم ہو جاتی تھی۔

2. مردم شماری کے دور میں آبادی (1871-1941)

برطانوی راج میں آبادی کے مطالعے کا ایک اہم پہلو صرف لوگوں کی کل تعداد میں اضافہ ہی نہیں، بلکہ ان کی علاقائی تقسیم کو سمجھنا بھی ہے۔ جدول 6.3 میں 1871 سے 1941 تک برصغیر (بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبے کو چھوڑ کر) کا علاقائی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ ہر علاقے کی آبادی مکمل تعداد میں، فیصد کے حساب سے حصہ، اور آبادی میں اضافے کے طویل مدتی رجحان کو دکھاتا ہے۔ یہ ڈیٹا اس لیے بہت ضروری ہے کیونکہ آبادی میں علاقائی فرق کا زمین کے دباؤ، زرعی تعلقات، نقل مکانی اور ہندوستان کے مختلف حصوں کی غیر متوازن ترقی پر براہ راست اثر تھا۔ ان علاقائی نمونوں کو دیکھ کر ہم سمجھ سکتے ہیں کہ کس طرح مشرقی اور شمالی علاقے آبادی کے لحاظ سے غالب رہے، جبکہ مغربی اور وسطی علاقے نسبتاً پیچھے رہے، اور جنوبی علاقے نے آہستہ آہستہ اپنا حصہ بہتر کیا۔

جدول 6.3: برصغیر پاک و ہند کی آبادی (بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبہ کو چھوڑ کر) 1871-1941

مردم شماری کا سال	مشرقی زون	مغربی زون	وسطی زون	شمالی زون	جنوبی زون	کل ہند
1871	72.07 (28.9)	26.94 (10.8)	29.80 (11.9)	77.96 (31.3)	42.67 (17.1)	249.44
1881	76.42 (30.0)	25.96 (10.2)	32.87 (12.9)	80.20 (31.5)	39.06 (15.3)	254.51
1891	79.83 (28.9)	29.33 (10.6)	37.70 (13.6)	85.38 (30.9)	44.45 (16.1)	276.69
1901	85.62 (30.5)	27.38 (9.8)	33.26 (11.8)	86.48 (30.8)	48.12 (17.1)	280.87
1911	91.80 (30.8)	29.07 (9.8)	38.77 (13.0)	86.37 (29.0)	52.20 (17.5)	298.20
1921	93.54 (31.2)	28.83 (9.6)	37.64 (12.6)	85.70 (28.6)	53.92 (18.0)	299.63
1931	102.67 (30.9)	32.71 (9.9)	42.58 (12.8)	94.11 (28.3)	60.22 (18.1)	332.29
1941	121.47 (31.8)	37.39 (9.8)	48.71 (12.7)	110.16 (28.8)	64.83 (16.9)	382.56

نمبرات ملین میں ہیں۔ قوسین میں کل ہند کا فیصد حصہ ہے۔

Source: Heston, A. (2005). *National Income*. In D. Kumar (Ed.), *The Cambridge Economic History of India: Volume 2, c.1757–c.1970* (pp. 376–462). Hyderabad: Orient Longman. (Original work published 1982).

جدول 6.3 سال 1871 سے سال 1941 کے درمیان برصغیر کی آبادی کی علاقائی تقسیم اور طویل مدتی رجحانات کو نمایاں کرتا ہے۔

مشرقی زون (بنگال، بہار، اڑیسہ، آسام) مسلسل سب سے زیادہ آبادی والا علاقہ رہا، جہاں کی آبادی 1871 میں 72 ملین سے بڑھ کر

1941 میں 121 ملین سے زیادہ ہو گئی۔ اس نے برصغیر کی کل آبادی کا تقریباً ایک تہائی حصہ برقرار رکھا۔ مشرق میں آبادی کی یہ زیادہ مقدار زمین پر دباؤ، غربت کے پھیلاؤ، اور اس خطے میں قحط کے بار بار آنے کی وجہ سمجھی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ خطہ آسام میں چائے کے باغات، برما اور یہاں تک کہ بیرون ملک مزدوری کے لیے نقل مکانی کا ایک بڑا مرکز بنا رہا۔ شمالی زون (پنجاب، متحدہ صوبے، دہلی وغیرہ) دوسرا سب سے بڑا علاقہ تھا، جس کی آبادی 1871 میں 78 ملین سے بڑھ کر 1941 میں 110 ملین ہو گئی، جس کا فیصد حصہ 29 سے 31 فیصد کے درمیان قائم رہا۔ مشرق اور شمال کے ان دونوں خطوں میں مل کر ہندوستان کی تقریباً 60 فیصد آبادی رہتی تھی۔

جنوبی زون (مدراس پریزیڈنسی، میسور، حیدرآباد، تراونکور، کوچن) کی آبادی میں واضح اضافہ دیکھنے میں آیا۔ اس کا حصہ 1871 میں 17.1 فیصد سے بڑھ کر 1931 میں تقریباً 18 فیصد ہو گیا، تاہم 1941 میں یہ تھوڑا کم ہو کر 16.9 فیصد رہ گیا۔ اس کی ایک وجہ جنوب میں شرح اموات کا نسبتاً کم ہونا تھا، جس کی وجوہات بہتر آبپاشی، صحت کے حالات میں کسی حد تک بہتری، اور شمال و مشرق کے مقابلے میں قحط سے ہونے والی اموات کی کم شدت تھیں۔ وسطی زون (وسطی صوبے اور برار) کی تعداد نسبتاً چھوٹی رہی۔ اس کی آبادی 1871 میں تقریباً 30 ملین سے بڑھ کر 1941 میں قریب 49 ملین ہو گئی، اور اس کا فیصد حصہ 12 سے 13 فیصد کے درمیان مستحکم رہا۔ مغربی زون (بمبئی پریزیڈنسی، گجرات، سندھ، راجستھان) سب سے کم آبادی والا علاقہ تھا۔ اس کی آبادی 1871 میں 27 ملین سے بڑھ کر 1941 میں صرف 37 ملین ہوئی، جو پورے عرصے میں محض 10 فیصد کے قریب رہی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اگرچہ مغربی ہندوستان اپنے بندرگاہوں، تجارت اور ابتدائی صنعتی کاری (بمبئی، کراچی، احمد آباد) کی وجہ سے معاشی طور پر اہم تھا، لیکن آبادی کے لحاظ سے یہ مشرق اور شمال کے مقابلے میں کم اہمیت رکھتا تھا۔

پورے ہندوستان کے سطح پر، آبادی 1871 میں 249 ملین سے بڑھ کر 1941 میں 383 ملین ہو گئی، جس میں سات دہائیوں میں 54 فیصد کا اضافہ دیکھنے میں آیا۔ انیسویں صدی میں آبادی میں اضافہ نسبتاً سست رہا، جس کی وجہ بار بار آنے والے قحط اور وبائی بیماریاں تھیں۔ لیکن 1921 کے بعد یہ شرح تیز ہو گئی کیونکہ اموات کم ہونے لگیں جبکہ شرح پیدائش اب بھی زیادہ تھی۔ 1921 کی مردم شماری ایک اہم موڑ ثابت ہوئی۔ اس سال آبادی میں اضافہ تقریباً رک سا گیا تھا (صرف 1.4 ملین کا اضافہ)۔ اس کی وجہ 1918-19 کی ہلاکت خیز انفلوئنزا وبا تھی جس نے لاکھوں لوگوں کی جان لے لی۔ تاہم، اس کے بعد کی دہائیوں میں آبادی میں اچانک تیزی سے اضافہ ہوا۔ صرف 1921 سے 1941 کے درمیان 82 ملین سے زیادہ لوگ بڑھ گئے۔ اس طرح، یہ جدول ہندوستان کی آبادی کے مشرق اور شمال میں علاقائی ارتکاز کے ساتھ ساتھ 1921 کے بعد تیز آبادیاتی اضافے کی جانب ہونے والی مجموعی تبدیلی کو بھی واضح کرتا ہے۔ یہی وہ بنیاد تھی جس پر آزاد ہندوستان میں آبادی میں تیزی سے اضافہ ہوا۔

عمر اور جنس کی ساخت اور انحصاری تناسب (Age-Sex Composition and Dependency Ratio)

اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ 19 ویں صدی کے آخر اور 20 ویں صدی کے اوائل میں آبادی کی عمر کی ساخت نمایاں طور پر نوجوان رہی (جدول 6.4)۔ 1881 سے 1941 تک ہر مردم شماری میں تقریباً 39% لوگ 15 سال سے کم عمر کے تھے، 57% سے تھوڑے

زیادہ لوگ کام کرنے کی عمر (59-15 سال) میں تھے، اور صرف تقریباً ساڑھے 4 سے 5 فیصد لوگ 60 سال سے زیادہ عمر کے تھے۔ اس مجموعے کا مطلب ہے کہ کل انحصاری تناسب (100 کام کرنے والے عمر کے افراد پر انحصار کرنے والوں کی تعداد) مسلسل 80-75 کے قریب زیادہ رہا۔ بین الاقوامی معیار کے لحاظ سے یہ ایک اعلیٰ شرح ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کام کرنے والے بالغوں پر کھپت کا بوجھ بہت زیادہ تھا اور معیشت پر بنیادی ضروریات کی اشیا (خوراک، کپڑے) کی پیداوار کی طرف دباؤ تھا، نہ کہ اشیائے سرمایہ کی طرف۔ انحصاری تناسب میں 1941 تک صرف تھوڑی سی کمی واقع ہوئی۔

جدول 6.4: پورے ہندوستان کی عمر کی ساخت (افراد، کل آبادی کا فیصد

سال	0–14	15–59	60+	تناسبِ انحصار	جنسی تناسب
1881	38.9	55.8	5.3	79.2	1040
1911	38.5	56.4	5.2	77.5	1047
1931	38.9	57.4	4.7	76.0	1062
1941	38.5	57.1	4.4	75.1	1069

Source: Heston, A. (2005). *National Income*. In D. Kumar (Ed.), *The Cambridge Economic History of India: Volume 2, c.1757–c.1970* (pp. 376–462). Hyderabad: Orient Longman. (Original work published 1982).

علاقائی عمر کے تناسب پورے ہندوستان کے اوسط سے ملتے جُلتے تو تھے، لیکن یکساں نہیں تھے۔ مشرقی زون میں بچوں کا تناسب تھوڑا زیادہ (40-39 فیصد) تھا اور بوڑھوں کا تناسب 1931 تک کم تھا۔ جنوبی زون میں بوڑھوں کی تعداد قدرے زیادہ تھی، اس لیے بچوں کا تناسب کم ہونے کے باوجود بھی انحصاری تناسب مشرقی زون جتنا ہی تھا۔ یہ معمولی فرق اس لیے اہم ہے کیونکہ یہ براہ راست ہر علاقے میں مزدوری کی دستیابی اور بچت کی صلاحیت کو متاثر کرتے تھے۔ یہ بات 1947 سے پہلے علاقائی ترقی کے مباحثوں کو سمجھنے کے لیے اہم ہے۔ ایک اور قابل ذکر بات عورتوں اور مردوں کے تناسب میں بہتری تھی۔ یہ تناسب 1881 میں ہزار مردوں پر 1040 عورتوں سے بڑھ کر 1941 میں 1069 ہو گیا۔ اس کی ایک ممکنہ وجہ مردوں میں کام کی سخت شرائط، قحط اور جنگیں جیسی وجوہات سے اموات کی شرح کا زیادہ ہونا تھا۔ مجموعی طور پر، یہ ڈیٹا دکھاتا ہے کہ ہندوستان ابھی آبادیاتی تبدیلی کے ابتدائی دور میں تھا جہاں شرح پیدائش اور شرح اموات دونوں زیادہ تھیں۔

اموات کی سطح اور رجحانات (Mortality Levels and Trends)

1871 اور 1951 کے درمیان، ہندوستان میں شرح اموات زیادہ رہی لیکن اس میں کمی کا ایک سست رجحان نظر آیا (جدول 6.5)۔ مجموعی شرح اموات ہر 1000 افراد پر 40 سے 50 کے درمیان گھٹتی بڑھتی رہی۔ یہ 15-1911 کے دوران 48.6 کی بلند ترین سطح پر پہنچ گئی، جس کی بنیادی وجہ انفلوئنزا کی وبا تھی۔ شیر خوار اموات انتہائی زیادہ تھیں۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں ہر 1000 زندہ بچوں کی پیدائش پر 263 سے 295 شیر خوار اپنی پہلی سالگرہ سے پہلے ہی فوت ہو جاتے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ تقریباً ہر 10 میں سے 3 بچے ایک سال کی عمر پورا نہیں کر پاتے تھے۔ 1921 کے بعد، دونوں شرح اموات اور شیر خوار اموات میں مسلسل کمی شروع ہو گئی۔ یہ صحت کی دیکھ بھال، غذائیت اور وبائی امراض پر قابو پانے میں ہونے والی بتدریج بہتری کی عکاسی کرتا ہے۔ 50-1941 تک، شرح اموات گھٹ کر 25.2 اور شیر خوار اموات 199 فی ہزار رہ گئی۔ یہ واضح طور پر صحت کے حالات میں بہتری کو ظاہر کرتا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ

بھی دکھاتا ہے کہ عالمی معیار کے مقابلے میں یہ صورت حال اب بھی تشویشناک تھی۔ مجموعی طور پر، یہ اعداد و شمار اس تبدیلی کو ظاہر کرتے ہیں کہ برطانوی ہندوستان میں مسلسل زیادہ شرح اموات کے دور کے بعد آبادیاتی صحت میں سست رفتاری سے ہونے والی بہتری کا ایک نیا مرحلہ شروع ہوا۔

جدول 6.5: برصغیر پاک وہند میں شرح اموات اور شرح امواتِ اطفال (1871–1951)

Infant Mortality Rate	Death Rate	Year
263	40.7	**1871–81**
278	44.3	**1881–1901**
272	41.4	**1901–11**
295	48.6	**1911–15**
250	42.0	**1921–25**
226	39.6	**1925–30**
228	37.3	**1931–35**
223	31.5	**1935–40**
199	25.2	**1941–50**

Source: Heston, A. (2005). *National Income*. In D. Kumar (Ed.), *The Cambridge Economic History of India: Volume 2, c.1757–c.1970* (pp. 376–462). Hyderabad: Orient Longman. (Original work published 1982).

پیدائش کے وقت متوقع عمر (Life Expectancy at Birth)

اعداد و شمار کے مطابق، برصغیر پاک وہند میں پیدائش کے وقت متوقع عمر میں 1871 سے 1951 کے درمیان اتار چڑھاؤ کے ساتھ مجموعی طور پر اضافے کا رجحان دکھائی دیتا ہے (جدول 6.6)۔ 1871-81 میں متوقع عمر اوسطاً 24.6 سال تھی، جو 1981-91 تک بڑھ کر 25.1 سال ہو گئی۔ تاہم، 1891-1901 اور 1901-11 کے دوران یہ گھٹ کر بالترتیب 23.8 اور 23.0 سال رہ گئی، جس میں قحط، وبائی امراض اور صحت کے خراب حالات کا عکس نظر آتا ہے۔ سب سے کم سطح 1911-21 میں دیکھنے میں آئی، جب یہ گر کر محض 20.2 سال رہ گئی۔ اس کی بڑی وجہ انفلوئنزا کی وبا اور خوراک کے بحران تھے۔ اس کے بعد نمایاں بہتری آئی اور متوقع عمر 1921-31 میں بڑھ کر 26.7 سال اور پھر 1931-41 میں چھلانگ لگا کر 31.7 سال ہو گئی۔ 1941-51 تک یہ 32.1 سال تک پہنچ گئی، جو صحت کے حالات میں بہتری، وباؤں پر بہتر کنٹرول اور بتدریج سماجی و معاشی ترقی کی عکاسی کرتی ہے۔ اس پورے عرصے میں، 1921 تک خواتین کی متوقع عمر عام طور پر مردوں کے مقابلے میں تھوڑی زیادہ رہی، لیکن اس کے بعد مردوں کی متوقع عمر خواتین سے زیادہ ہو گئی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اگرچہ مجموعی طور پر زندہ رہنے کی شرح میں بہتری آئی، لیکن اموات کے نمونوں میں صنفی فرق وقت کے ساتھ بدلتا رہا۔

جدول 6.6: پیدائش کے وقت متوقع عمر

Persons	Females	Males	Year
24.6	25.6	23.7	**1871–81**
25.1	25.5	24.6	**1881–91**
23.8	24.0	23.6	**1891–1901**
23.0	23.3	22.6	**1901–11**
20.2	20.9	19.4	**1911–21**

26.7	26.6	26.9	**1921–31**
31.7	31.4	32.1	**1931–41**
32.1	31.7	32.4	**1941–51**

Source: Heston, A. (2005). *National Income*. In D. Kumar (Ed.), *The Cambridge Economic History of India: Volume 2, c.1757–c.1970* (pp. 376–462). Hyderabad: Orient Longman. (Original work published 1982).

شہری کاری (Urbanization)

ہندوستان میں شہری کاری کی سطح ہمیشہ سے بہت کم رہی ہے اور کم از کم 1921 تک اس کی رفتار میں تیزی کا کوئی رجحان نظر نہیں آیا۔ 1911 کی مردم شماری میں رپورٹ ہونے والی کمی کو چھوڑ کر، 1891 سے 1941 کے دوران ہندوستان میں قصبوں کی تعداد اور شہری آبادی کے تناسب میں مسلسل اضافہ ہوا۔ آبادی میں اضافے اور / یا کچھ شہری خصوصیات (جیسے اسکول، ہسپتال، یا نقل و حمل کے رابطے) کے حصول کے نتیجے میں مقامی علاقوں کو دیہی سے شہری طور پر دوبارہ درجہ بندی کرنا، شہری کاری کے عمل میں ایک ممکنہ معاون عامل (Contributory Factor) ہے۔ شہری کاری کے عمل میں معاون دیگر ممکنہ عوامل میں قدرتی اضافے کی شرح میں دیہی-شہری فرق اور دیہی علاقوں سے ہجرت شامل ہیں۔

6.3 برطانوی ہندوستان کی معیشت (Economy of British India)

ہندوستان پر برطانوی نوآبادیاتی حکومت، جو تقریباً دو صدیوں تک قائم رہی، نے ہندوستانی معیشت پر گہرا اثر ڈالا۔ اس دور میں ساختی تبدیلیوں کی خاصی نشاندہی کی جاسکتی ہے، جن میں روایتی صنعتوں کا خاتمہ، ہندوستان کی ایک زرعی معیشت میں تبدیلی، استحصالی زمینی محصولاتی نظاموں کا نفاذ، ایسی بنیادی ڈھانچے کی تعمیر جو بنیادی طور پر نوآبادیاتی مفادات کے لیے تھی۔ اس اکائی کا یہ حصہ برطانوی ہندوستان کی معیشت کے انہی پہلوؤں کا جائزہ لیتا ہے اور ہندوستانی معاشی ترقی پر ان کے اثرات کو واضح کرتا ہے۔

قومی آمدنی کے تخمینے

ہندوستانی معاشی تاریخ میں قومی آمدنی کا مطالعہ ایک ایسا شعبہ ہے جہاں بہت اختلافات اور مختلف تشریحات موجود ہیں۔ ابتدائی مباحثوں، جیسے ولیم ڈگبی اور لارڈ کرزن کے درمیان بحث، نے برطانوی ہندوستان کی معاشی حالت کے بارے میں یکسر مختلف نقطہ نظر پیش کیے۔ ایک طرف یہ دعویٰ تھا کہ فی کس آمدنی میں کمی آئی ہے، جبکہ دوسری طرف اس میں اضافے کا دعویٰ تھا۔ قومی آمدنی کی سطح اور اس کی شرح نمو کو سمجھنا ہمیں ایک ایسا اہم پیمانہ فراہم کرتا ہے، جو یہ دکھاتا ہے کہ کوئی معیشت اپنی آبادی کی بنیادی مادی ضروریات پوری کرنے کے قابل ہے یا نہیں۔

ہندوستانی قومی آمدنی کا مطالعہ ایک علمی مشق کے طور پر نہیں، بلکہ ایک گہرے سیاسی مقصد کے تحت شروع ہوا۔ ولیم ڈگبی، جو برطانوی حکومت کے سخت ناقد تھے، نے اپنی کتاب کی جلد پر یہ مشہور جملہ چسپاں کیا کہ "خوش حال برطانوی ہندوستان" کی فی کس آمدنی 1850ء میں محض 2 پنس تھی جو 1900ء تک اور بھی کم ہو گئی۔ ان کا مقصد نوآبادیاتی دور میں ہندوستان کی غربت کو واضح کرنا تھا۔ اس کے برعکس، اس وقت کے وائسرائے لارڈ کرزن اور ان کے حامیوں جیسے فریڈ ٹی اٹکنسن نے اپنے خود کے شماریاتی مطالعوں کا استعمال کرتے

ہوئے دعویٰ کیا کہ 1880ء اور 1900ء کے درمیان فی کس آمدنی میں درحقیقت اضافہ ہوا تھا۔ اس نے اس بات کو نمایاں کیا کہ قومی آمدنی کے اعداد و شمار کو اس وقت کے سیاسی بیانیے میں کس طرح ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔

ابتدائی ہندوستانی ماہرین معاشیات کے رہنمائی کاموں نے بعد میں ہونے والی، زیادہ منظم تحقیقات کی بنیاد رکھی۔ دادا بھائی نوروجی ان اولین افراد میں سے تھے جنھوں نے مکمل تخمینہ لگانے کی کوشش کی۔ 1870 کے لگ بھگ، انہوں نے ہندوستان کی فی کس آمدنی تقریباً 20 روپے شمار کی، جو انگلینڈ کی 450 روپے کی آمدنی کے بالکل برعکس تھی۔ اس واضح فرق کو انہوں نے ہندوستان سے دولت کے نکاس یا اخراج (Drain of Wealth) کے ثبوت کے طور پر استعمال کیا۔

فی کس آمدنی کے رجحانات (1860-1947)

قومی آمدنی کے عددی مطالعے ہندوستانی معیشت کی کارکردگی کی ایک باریک بین تصویر پیش کرتے ہیں، جو دو اہم ادوار میں واضح رجحانات کو ظاہر کرتی ہے۔

پہلا دور: 1860-1920

اس عرصے کے دوران، ہندوستانی معیشت میں معمولی مگر اہم نمو دیکھی گئی۔ جب آبادی میں تقریباً 30% کا اضافہ ہوا، تو فی کس آمدنی میں کم از کم 35% کا اضافہ ہوا، جو سالانہ 0.5% سے تھوڑی کم شرح نمو ہے۔ یہ نتیجہ ان مایوس کن تاریخی نقطہ نظر کی تردید کرتا ہے جو انیسویں صدی کے آخر کے دور کو جمود کا دور قرار دیتے ہیں۔ ایک دلچسپ آبادیاتی نوٹ 1918 کی انفلوئنزا وبا ہے، جس کی وجہ سے آبادی میں عارضی کمی آئی اور 1921 کی مردم شماری کے وقت فی کس آمدنی میں عارضی اضافہ ہوا ہو گا۔

دوسرا دور: 1920-1947

یہ دور ماہرین کے درمیان زیادہ متنازعہ ہے۔ اگرچہ پہلے دور کی نمو ختم نظر آتی ہے، لیکن اس بات پر کوئی اتفاق رائے نہیں ہے کہ فی کس آمدنی میں کمی آئی یا وہ جامد رہی۔ ایس جی پٹیل اور اینگس میڈیسن جیسے معیشت دانوں کے تخمینے 5% سے 15% تک کمی کی نشاندہی کرتے ہیں، جبکہ ایس سوا سبرامونیان اور ایم مکھرجی جیسے دوسرے محققین اسے نسبتاً مستحکم پاتے ہیں۔ تاہم، سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ 1920 کے بعد پہلے دور جیسی نمو جاری نہ رہ سکی۔

جدول 6.7: مختلف ماہرین معاشیات کے فی کس آمدنی کے رجحانات کے تخمینوں کا خلاصہ

Per Capita Income Estimate/Trend	Period	Economist(s)
Rs. 20 (demonstrates a significant gap with UK)	1870	**Dadabhai Naoroji**
Claims per capita income rose	1880–1900	**Fred T. Atkinson**
Modest growth (~0.5% p.a.)	1860–1920	**M. Mukherjee**
Stable trend	1920–1947	**S. Sivasubramonian**
Decline of 5–15%	1920–1947	**S.J. Patel & Angus Maddison**

Source: Heston, A. (2005). *National Income*. In D. Kumar (Ed.), *The Cambridge Economic History of India: Volume 2, c.1757–c.1970* (pp. 376–462). Hyderabad: Orient Longman. (Original work published 1982).

شعبہ وار تجزیہ (Sectoral Analysis)

برطانوی راج (1858-1947) نے ہندوستان کی معیشت کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا۔ برطانوی معاشی پالیسی کا بنیادی مقصد ہندوستان کو برطانوی صنعتوں کے لیے خام مال فراہم کرنے والا اور تیار برطانوی مال کا بازار بنانا تھا۔ اس کے نتیجے میں ایک نوآبادیاتی معاشی ڈھانچہ وجود میں آیا جس کی خصوصیات تھیں: **ڈی انڈسٹریلائزیشن** (مقامی صنعتوں کا زوال)، **زراعت کی تجارت کاری** (زراعت کو تجارتی بنانا) اور **نوآبادیاتی مفادات کے لیے بنیادی ڈھانچہ** (ریلوے اور بندرگاہیں بنیادی طور پر برطانوی تجارت کے لیے بنائی گئیں)۔ اس ڈھانچے کو سمجھنا جدید ہندوستان کے معاشی مسائل کا تجزیہ کرنے کی کلید ہے۔

زرعی شعبہ

آزادی کے وقت، ہندوستان کی تقریباً 85% آبادی زراعت پر انحصار کرتی تھی، جو قومی آمدنی میں 55% حصہ ڈالتی تھی۔ تاہم، یہ شعبہ سست روی کا شکار تھا اور اس کی پیداواری صلاحیت نہایت کم تھی۔ جارج بلن کی 1891 سے 1947 تک کی زرعی پیداوار پر کی گئی اہم تحقیق سے ایک تشویشناک انکشاف ہوا: اگرچہ کل زرعی پیداوار میں اضافہ ہوا، لیکن **فی کس غذائی اجناس کی پیداوار میں کمی** واقع ہوئی۔

- برطانوی حکومت نے بنگال میں **زمینداری نظام** (مستقل بندوبست) نافذ کیا، جس کے تحت زمینداروں کو زمین کا مالک بنا دیا گیا۔ انہیں برطانوی حکومت کو ایک مقررہ محصول ادا کرنا ہوتا تھا، لیکن وہ کسانوں سے جتنا چاہیں وصول کر سکتے تھے۔ اس کے نتیجے میں غیر حاضر زمینداروں کا ایک طبقہ پیدا ہوا اور اصل کسان غربت کا شکار ہو گئے۔
- کسانوں کو غذائی اجناس کی بجائے برطانوی فیکٹریوں کے لیے نقدی فصلیں جیسے نیل، کپاس اور پٹ سن اگانے پر مجبور کیا گیا۔ اس کے نتیجے میں کئی قحط پڑے کیونکہ خوراک کی پیداوار ثانوی ہو گئی۔
- نہ تو آبپاشی میں کوئی سرمایہ کاری ہوئی اور نہ ہی جدید ٹیکنالوجی متعارف کرائی گئی۔ زرعی طریقے صدیوں تک پرانے اور غیر موثر رہے۔

جدول 6.8: زرعی کارکردگی (1900-1947)

Implication	Data	Period	Indicator
Near-stagnation, unable to keep pace with population growth.	0.4% per year	1891-1947	Growth Rate
Widespread poverty and malnutrition.	Declined from 200 kg to 150 kg per capita	1901-1941	Food Grain Availability
Result of policy failures, export of food grains during shortages.	Estimated 15-30 million deaths	1876-78, 1896-97, 1943	Major Famines

Source: Kumar, D. (Ed.). (2005). *The Cambridge Economic History of India, Vol. 2*. Hyderabad: Orient Longman.

جدول 6.8 سے پتہ چلتا ہے کہ زرعی شعبے کی کل پیداوار (تمام فصلیں ملا کر) 56 سالہ دور میں سالانہ آدھے فیصد سے بھی کم کی سست رفتاری سے بڑھی۔ اسی عرصے کے دوران، ہندوستان کی آبادی تقریباً 0.8% سے 1.0% سالانہ کی شرح سے بڑھ رہی تھی۔ اس نے ایک "مالتھسی" منظر نامہ پیدا کر دیا، جہاں خوراک کی پیداوار میں اضافہ آبادی کی شرح نمو سے کہیں پیچھے رہ گیا۔ اس کے نتیجے میں فی کس

زرعی پیداوار اور آمدنی میں مسلسل کمی واقع ہوئی۔ فی کس غذائی اجناس کی دستیابی (یعنی ملک میں ہر شخص کے لیے سالانہ دستیاب غذائی اجناس جیسے چاول، گندم کی اوسط مقدار) میں نمایاں کمی واقع ہوئی۔ یہ مقدار 200 کلوگرام سے گر کر 150 کلوگرام رہ گئی، جس کا مطلب ہے کہ چار دہائیوں میں خوراک کی دستیابی میں 25 فیصد کی کمی آئی۔ یہ کمی برطانوی پالیسی جس کے تحت زراعت کو تجارتی بنایا گیا تھا، کا براہ راست نتیجہ تھی۔

غیر زرعی شعبہ

غیر زرعی معیشت کی ساخت میں چھوٹے اور بڑے پیمانے کی صنعتیں، سرکاری ملازمت، نقل و حمل تجارت، اور پیشہ ورانہ خدمات شامل تھے۔ چھوٹے پیمانے کی صنعت (دستکاری) اور بڑے پیمانے کی صنعت (فیکٹری) کی پیداواری صلاحیت میں بہت بڑا فرق تھا۔ 1900-01 میں، بڑے پیمانے کی صنعت میں ہر مزدور کی خالص پیداوار 408 روپے تھی (5,39,000 مزدوروں کے لیے)۔ جبکہ چھوٹے پیمانے کی صنعت میں ہر مزدور کی خالص پیداوار صرف 87.5 روپے تھی (1,33,14,000 مزدوروں کے لیے)۔ ریلوے کے شعبے میں نمایاں ترقی ہوئی اور پیداواری صلاحیت میں کافی اضافہ ہوا۔ ریلوے میں اوسط مزدوری کی پیداواری صلاحیت کا اشاریہ (100 = 1890) 1873 میں 70 سے بڑھ کر 1900 تک 125 ہو گیا تھا۔

جدول 6.9: زرعی کارکردگی (1900-1947)

Growth of Real Output (1900-1947, %)	1946-47 (Rs.)	1900-01 (Rs.)	Sector
20	289	295	Primary sector (Agriculture)
32	1,900	1,196	Manufacturing
29	488	289	Small-scale industry
55	559	330	Professional
80	874	568	Other transport and commerce

Source: Heston, A. (1983). *National Income*. In D. Kumar & M. Desai (Eds.), *The Cambridge Economic History of India, Vol. 2: c.1757–c.1970* (pp. 376–462). Cambridge: Cambridge University Press.

جدول 6.9 سے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ پرائمری سیکٹر (زراعت)، جو معیشت میں سب سے بڑا روزگار دینے والا شعبہ ہے، میں مزدوری کی پیداواریت تقریباً جامد رہی۔ ہر مزدور کی پیدا کردہ قدر 1900-01 میں 295 روپے سے معمولی سی گر کر 1946-47 میں 289 روپے رہ گئی۔ پیداواریت کی یہ کم اور غیر متغیر سطح بیسویں صدی کی پہلی ششماہی کے دوران زرعی شعبے میں کوئی بڑی ساختی تبدیلی یا ٹیکنالوجی کی ترقی نہ ہونے کی واضح علامت ہے۔ زراعت کے برعکس، غیر زرعی شعبوں میں پیداواریت میں نمایاں اضافہ دیکھنے میں آیا، حالانکہ ان میں مزدوروں کا ایک بہت چھوٹا حصہ کام کرتا تھا۔ مینوفیکچرنگ میں ہر مزدور کی پیدا کردہ قدر میں 1,196 روپے سے بڑھ کر 1,900 روپے تک نمایاں چھلانگ دیکھی گئی، جو حقیقی پیداوار میں 32% اضافے کی نمائندگی کرتی ہے۔ پرائمری سیکٹر (289 روپے) اور مینوفیکچرنگ (1,900 روپے) کے درمیان پیداواری صلاحیت کے اس فرق نے مجموعی معاشی ترقی کا زبردست موقع پیش کیا۔ تاہم، یہ ترقی مجموعی سطح پر اس لیے حقیقی شکل میں نہ دکھائی دی کیونکہ کم پیداواری صلاحیت والے زرعی شعبے سے زیادہ پیداواری صلاحیت والے مینوفیکچرنگ / سروسز کے شعبوں میں منتقل ہونے والے کارکنوں کا تناسب بہت کم تھا۔

قیمتوں کی حرکات اور مہنگائی (Price Movements and Inflation)

1860 سے 1947 کا دور ہندوستان کی قیمتوں کے ڈھانچے میں گہرے تبدیلیوں کا گواہ رہا، جو عالمی معیشت میں اس کے بتدریج انضمام کو ظاہر کرتا ہے۔ کل قیمتوں کی سطح کا آغاز 1861 سے 1880 کی دہائی کے اوائل تک استحکام کے ایک دور سے ہوا۔ اس کے بعد 1920 تک ایک مسلسل بڑھتا ہوا رجحان قائم رہا، جسے پہلی عالمی جنگ نے بہت تیز کر دیا۔ 1920 کی دہائی میں قیمتیں جنگ سے پہلے کے دور سے زیادہ سطح پر جم گئیں، لیکن معاشی کساد بازدی (1929-1931) کے دوران یہ سطح شدید گراوٹ کا شکار ہو گئی۔ 1930 کی دہائی میں قیمتیں بیسویں صدی کی ابتدائی سطحوں پر مستحکم ہو گئیں، لیکن دوسری عالمی جنگ کے دوران یہ ایک بار پھر نئی بلندیوں پر پہنچ گئیں۔

جدول 6.10: ہندوستان میں قیمتوں کے رجحانات، (1861-1947) (1873=100)

Non-Agricultural Prices	Agricultural Prices	All Commodities	Year
91	82	93	**1861**
100	100	100	**1873**
85	107	106	**1885**
96	147	143	**1900**
134	210	187	**1914**
266	319	302	**1920**
182	252	254	**1929**
120	142	157	**1931**
112	153	157	**1939**
-	221	334	**1945**
-	252	414	**1947**

Source: McAlpin, M. B. (2008). *Price Movements and Fluctuations in Economic Activity (1860–1947)*. In D. Kumar & M. Desai (Eds.), *The Cambridge Economic History of India, Vol. 2: c.1757–c.1970* (pp. 878–904). Cambridge: Cambridge University Press.

ان قیمت کی تبدیلیوں کی ایک اہم بنیاد ہندوستان کے الگ تھلگ مقامی بازاروں کا باہمی انضمام تھا۔ 1870 کی دہائی سے پہلے، نقل و حمل کی اعلیٰ لاگت کی وجہ سے علاقائی بازار الگ تھلگ رہتے تھے، جس کی وجہ سے مقامی حالات کے مطابق قیمتوں میں شدید اتار چڑھاؤ ہوتا تھا۔ ریلوے نیٹ ورک کے پھیلاؤ نے لاگت میں نمایاں کمی کی، جس سے بڑی مقدار میں اجناس کی باقاعدہ تجارت ممکن ہو سکی۔ اس کے نتیجے میں مختلف علاقوں کی قیمتوں میں واضح ہم آہنگی پیدا ہوئی اور متعدد الگ تھلگ بازار ایک زیادہ متحد قومی بازار میں تبدیل ہو گئے۔ غیر زرعی شعبہ، جس میں زیادہ تر درآمدی تیار مال شامل تھے، کی قیمتیں نسبتاً مستحکم رہیں۔ اس کے مخصوص رجحان، جس میں 1905 تک کوئی اضافہ نظر نہیں آتا، کی وجہ برطانیہ میں تیار مال کی گرتی ہوئی قیمتوں کے مقابلے روپے کی قدر میں کمی کا متوازن اثر تھا۔

ہندوستان کی بیرونی تجارت اور ادائیگیوں کا توازن (1757-1947)

برطانوی نو آبادیاتی حکومت نے ہندوستان کی تجارتی ساخت کو ایک صنعتی برآمد کنندہ سے خام مال کی فراہم کنندہ میں تبدیل کر دیا۔ یہ تبدیلی محض بازار کے قوانین کا نتیجہ نہیں تھی، بلکہ نو آبادیاتی پالیسیوں سے گہرائی سے متاثر تھی۔ اس کے نتیجے میں "دولت کی نکاسی" جاری رہی، جس نے برطانیہ کی سلطنت کے نظام کو مالیات فراہم کی جبکہ ہندوستان کی صنعتی ترقی کو دبا دیا۔ برطانوی راج کے دوران ہندوستان

کی تجارت میں ڈرامائی تبدیلیاں آئیں۔

برآمدات میں تبدیلی: 1813 سے پہلے ہندوستان تیار مال جیسے سوتی کپڑے اور ریشم کا بڑا برآمد کنندہ تھا۔ 1813 کے بعد یہ تیار مال تیزی سے خام مال سے بدل گئے۔ 51-1850 تک افیون (30.1%) اور خام کپاس (19.1%) سب سے اہم برآمدات بن گئے، جبکہ سوتی کپڑے کی برآمدات گھٹ کر صرف 3.7% رہ گئیں۔ 1850 کے بعد غذائی اجناس، پٹ سن، چائے، اور تیل کے بیجوں کی برآمدات بڑھیں۔ بمبئی میں جدید سوتی ٹیکسٹائل انڈسٹری کے عروج کے بعد ہی تیار مال کی برآمدات میں تھوڑی بہتری آئی۔

درآمدات میں تبدیلی: پہلے ہندوستان مہنگے سامان جیسے مصالحے اور شراب درآمد کرتا تھا۔ بعد میں یہ عام استعمال کے تیار سامان میں بدل گئیں، خاص طور پر برطانیہ کا سوتی کپڑا، جو 19ویں صدی کے آخر میں درآمدات کا 40% سے زیادہ ہوتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان کپڑے کا برآمد کنندہ سے درآمد کنندہ بن گیا۔ اس کے علاوہ، دھاتیں، مشینیں، ریلوے کا سامان، اور مٹی کا تیل جیسے سرمایہ کاری کے سامان کی درآمدیں بھی بڑھنے لگیں۔

جدول 6.11: ہندوستان کی بیرونی تجارت کی ترکیب (17575-1947)

دور	اہم برآمدات (قدر/حصہ)	اہم درآمدات (قدر/حصہ)
1757-1813 (تجارتی نوآبادیاتی دور)	ٹیکسٹائل (سوتی کپڑا): کل برآمدات کا 30-40% (مثلاً 1760 کی دہائی میں سالانہ 3-4 ملین روپے) خام ریشم، سالٹ پیٹر، افیون	خزانہ (سونے چاندی کے سکے): شروع میں سب سے اہم درآمد (مثلاً 58-1757 میں 31 لاکھ روپے)۔ یورپی عیش و آرام کی مصنوعات، شرابیں
1814-1850 (منتقلی کا دور)	افیون: کل برآمدی مالیت کا 20-30% (51-1850 میں 59.7 ملین روپے) نیل 10%-27% (51-1850 میں 18.4 ملین روپے)	سوتی کپڑا: سب سے اہم درآمد، کل مالیت کا 30%-40$ سوتی دھاگہ، دھاتیں
1850-1914 (توسیع اور کثیر جہتی تجارت)	خام کپاس: انتہائی اتار چڑھاؤ (9%-35% حصہ)، 1866 میں امریکی خانہ جنگی کے دوران عروج) میں 370.5 ملین روپے اناج: 10%-20% حصہ پٹ سن اور پٹ سن کی مصنوعات: بڑھتا ہوا حصہ، 1900 تک 10% تک پہنچ گیا چائے: ایک اہم برآمد کے طور پر ابھری (1900 تک 5%-10% حصہ) افیون: 1900 کے بعد گرتا ہوا حصہ	سوتی کپڑا: اب بھی غالب، درآمدات کا 30%-47% دھاتیں، مشینیں، ریلوے کا سامان، معدنی تیل۔
1914-1947 (عدم استحکام اور تبدیلی کا دور)	پٹ سن کی مصنوعات: بہت اہم (21-1920 میں 22% حصہ) خام کپاس: 15%-21% حصہ چائے: مستحکم برآمد (5%-10%) سوتی مصنوعات: تیار مال کی برآمدات میں محدود بحالی	سوتی کپڑا: ہندوستانی اور جاپانی مقابلے کی وجہ سے حصہ گر گیا (31-1930 تک 13.5%) مشینری: بڑھتا ہوا حصہ (34-1933 تک 11%) دھاتیں، معدنی تیل

Source: Chaudhuri, K. N. (1983). *Foreign Trade and Balance of Payments (1757–1947)*. In D. Kumar (Ed.), *The Cambridge Economic History of India, Vol. 2: c.1757–c.1970* (pp. 804–877). Cambridge: Cambridge University Press.

برطانوی راج کے دوران ہندوستان کی تجارت کے راستے اور ادائیگیوں کا نظام مکمل طور پر بدل گیا، جو ہندوستان کے ماتحت کردار کو ظاہر کرتا ہے۔ انیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان، برطانیہ اور چین کے درمیان ایک مثلثی تجارتی نظام قائم ہوا جس میں ہندوستان چین کو افیون اور کپاس برآمد کرکے تجارتی سرپلس حاصل کرتا تھا، یہ سرپلس ہندوستان میں استعمال نہ ہوکر برطانیہ کو ادائیگیوں کے لیے استعمال ہوتا تھا، اور برطانیہ اس رقم سے چین کے ساتھ اپنا تجارتی خسارہ پورا کرتا تھا۔ انیسویں صدی کے آخر تک ہندوستان کی تجارت کثیر الجہتی ہوگئی جہاں برطانیہ تیار مال برآمد کرتا رہا، جبکہ ہندوستان کی برآمدات جرمنی، فرانس، جاپان اور امریکہ جیسے نئے صنعتی ممالک تک پھیل گئیں۔ ہندوستان ان ممالک سے حاصل ہونے والے تجارتی سرپلس کو برطانیہ کے ساتھ اپنے تجارتی خسارے اور دیگر مالی واجبات کو پورا کرنے کے لیے استعمال کرتا تھا، اس طرح ہندوستان برطانوی سلطنت کی معیشت کا اہم ستون بن گیا اور نوآبادیاتی دولت کا بہاؤ برطانیہ کی طرف جاری رہا (جدول 6.12)۔

جدول 6.12: ہندوستان کی بیرونی تجارت کی سمت (1757-1947)

دور	تجارت کے اہم شراکت دار	کل تجارتی توازن
1757-1813 (تجارتی نوآبادیاتی دور)	برآمدات: برطانیہ، چین درآمدات: برطانیہ، یورپ	مسلسل زائد: سونے چاندی کی درآمد کے ذریعے تصفیہ
1814-1850 (منتقلی کا دور)	برآمدات: برطانیہ (44%)، چین (35%) درآمدات: برطانیہ (65%-75%)	بڑا تجارتی زائد: چین کے ساتھ تجارتی زائد کو برطانیہ کے ساتھ خدمات کے کھاتے پر خسارے کی مالی معاونت کے لیے استعمال کیا گیا۔
1850-1914 (توسیع اور کثیر جہتی تجارت)	برآمدات: برطانیہ کا حصہ گھٹ کر 30% رہ گیا؛ براعظمی یورپ، امریکہ اور جاپان کے ساتھ تجارت میں اضافہ درآمدات: برطانیہ کی بالادستی (65%-84%)	مسلسل بڑا تجارتی زائد: مثلاً 1870 کے بعد سالانہ 20-30 کروڑ روپے)۔ اسے "ہوم چارجز" اور سرمائے کی واپسی کی ادائیگیوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔
1914-1947 (عدم استحکام اور تبدیلی کا دور)	برآمدات: برطانیہ (22%-35%)، جاپان (10%)، امریکہ (14%) درآمدات : برطانیہ کا حصہ کم ہوا (23%-61%)، امریکہ اور جاپان کا حصہ بڑھا	تجارتی زائد برقرار رہا، لیکن زیادہ تر کساد بازدی (1930 کی دہائی) کے دوران سونے کی مجبوراً برآمدات کے ذریعے

Source: Chaudhuri, K. N. (1983). Foreign trade and balance of payments (1757–1947). In D. Kumar (Ed.), *The Cambridge Economic History of India, Vol. 2: c.1757-c.1970* (pp. 804-877). Cambridge University Press

برطانوی ہندوستان کے ادائیگیوں کے توازن میں ایک اہم تضاد تھا: ملک **مسلسل** تجارتی سرپلس برقرار رکھتا تھا، مگر اس کے باوجود اس کا مجموعی ادائیگیوں کا توازن ہمیشہ خسارے میں رہتا تھا۔ یہ بظاہر تضاد بڑے اور **مسلسل** "غیر مرئی" قرضوں کی وجہ سے تھی - ایسی برآمدات جن کے بدلے میں ہندوستان کو سامان یا سرمایہ درآمد نہیں ہوتا تھا۔ یہ قرضے "ہوم چارجز" (انتظامی اخراجات، برطانوی اہلکاروں کی پنشن اور انگلینڈ میں ادا ہونے والے قرضے پر سود)، نجی ترسیلات (برطانوی کمپنیوں اور اہلکاروں کے وطن بھیجے گئے منافع اور بچت) اور فریٹ، انشورنس اور بینکنگ کمیشن کی ادائیگیوں پر مشتمل تھے، جو بنیادی طور پر برطانوی کمپنیوں کو ادا کیے جاتے تھے۔ سرمائے کا یہ خالص

بہاؤ، جو بر آمدی خسارے سے مالیاتی طور پر چلایا جاتا تھا، ہندوستانی قوم پرست ماہرین معاشیات کے نزدیک "دولت کی نکاسی" تھی۔ یہ ممکنہ سرمائے کی یک طرفہ منتقلی تھی جو اگر ہندوستان میں ہی برقرار رہتی اور اس میں سرمایہ کاری کی جاتی، تو اس کی معاشی ترقی کے لیے مالیاتی ذریعہ بن سکتی تھی، بجائے اس کے کہ اسے نوآبادیاتی طاقت کے فائدے کے لیے نکالا جاتا۔ خلاصہ یہ کہ نوآبادیاتی دور میں ہندوستان کی معاشی ترقی میں بیرونی تجارت کا کردار گہرا دوہرا لیکن حتمی طور پر نقصان دہ ثابت ہوا۔

6.4 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد طلبا درج ذیل باتوں پر دسترس حاصل کر سکیں گے:

- طلبا برطانوی راج کے ہندوستانی معیشت، آبادی اور تجارت پر مرتب ہونے والے ساختی اثرات کا تنقیدی جائزہ لے سکیں گے۔
- طلبا مردم شماری کے اعداد و شمار، قومی آمدنی کے تخمینوں اور تجارتی ریکارڈز کا تجزیہ کر کے تاریخی معاشی رجحانات کو سمجھ سکیں گے۔
- طلبا آبادیاتی تبدیلیوں (جیسے شرح اموات میں کمی) اور معاشی ڈھانچے (جیسے انحصاری تناسب) کے باہمی تعلق کو سمجھ سکیں گے۔

6.5 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

6.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. مردم شماری 1921 کو ہندوستان میں آبادیاتی نقطہ عروج (ڈیموگرافک واٹرشیڈ) کیوں کہا جاتا ہے؟
   (a) اس سال پہلی بار شہری آبادی دیہی آبادی سے زیادہ ہو گئی
   (b) اس سال کے بعد شرح اموات میں کمی اور آبادی میں تیزی سے اضافہ شروع ہوا
   (c) اس سال ہندوستان کی آبادی 50 کروڑ تک پہنچ گئی
   (d) اس سال پہلی بار عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہو گئی

2. دولت کی نکاسی (Drain of Wealth) سے کیا مراد ہے؟
   (a) ہندوستان سے قیمتی دھاتیں چوری ہو کر باہر بھیجی گئیں
   (b) ہندوستان کے تجارتی زائد کو برطانوی مفادات کے لیے استعمال کیا گیا
   (c) ہندوستان کے امیر زمینداروں نے اپنی دولت بیرون ملک منتقل کر دی
   (d) ہندوستان میں برطانوی مصنوعات کی درآمد میں مسلسل اضافہ ہوا

3. جارج بلن کی زرعی پیداوار پر تحقیق (1947-1891) کے مطابق کیا نتیجہ سامنے آیا؟
   (a) کل زرعی پیداوار میں کمی واقع ہوئی
   (b) فی کس غذائی اجناس کی پیداوار میں کمی واقع ہوئی
   (c) ہر فصل کی فی ہیکٹر پیداوار میں اضافہ ہوا
   (d) زرعی شعبے میں کام کرنے والوں کی تعداد کم ہو گئی

4. 1850-51 تک ہندوستان کی سب سے اہم برآمد کون سی تھی؟

(a) سوتی کپڑا (b) چائے

(c) افیون (d) پٹ سن

5. ہوم چارجز (Home Charges) سے کیا مراد تھی؟

(a) ہندوستان میں برطانوی اہلکاروں کے رہنے کے اخراجات

(b) ہندوستان سے برطانیہ بھیجے جانے والے انتظامی اخراجات اور پنشن

(c) ہندوستان میں بنیادی ڈھانچے کی تعمیر کے اخراجات

(d) ہندوستان میں فوجی چھاؤنیوں کے اخراجات

6. 1911-21 کی دہائی میں متوقع عمر (Life Expectancy) میں اچانک کمی کی وجہ کیا تھی؟

(a) پہلی عالمی جنگ (b) انفلوئنزا کی وبا

(c) بنگال کا قحط (d) زلزلے اور سیلاب

7. برطانوی راج کے دوران ہندوستان کی درآمدات میں سب سے اہم شے کون سی تھی؟

(a) مشینری (b) سوتی کپڑا

(c) دھاتیں (d) معدنی تیل

8. زوالِ صنعت (Deindustrialization) کا عمل کیسے ظاہر ہوا؟

(a) شہری علاقوں میں فیکٹریوں کی تعداد میں کمی

(b) روایتی ہندوستانی صنعتوں جیسے ٹیکسٹائل کا خاتمہ

(c) بیرون ملک سے درآمد ہونے والی مشینری کا استعمال بند ہونا

(d) ہندوستان میں کاریگروں کی تعداد میں کمی

9. ہندوستان کا تجارتی توازن (Balance of Trade) عام طور پر کیسا رہا؟

(a) مسلسل خسارہ (b) مسلسل زائد

(c) متوازن (d) غیر یقینی

10. 1921 کے بعد آبادی میں اچانک اضافے کی کیا وجہ تھی؟

(a) شرح پیدائش میں اضافہ (b) شرح اموات میں کمی

(c) ہجرت میں اضافہ (d) علاقائی حدود میں تبدیلی

جوابات	1	2	3	4	5	6	7	8	9	10
	b	b	b	c	b	b	b	b	b	b

6.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. ہندوستان میں 1921 کی مردم شماری کو آبادیاتی نقطہ عروج (ڈیمو گرافک واٹر شیڈ) کیوں قرار دیا جاتا ہے؟
2. دولت کی نکاسی (Drain of Wealth) سے کیا مراد ہے اور اس کے دو اہم اجزا کیا تھے؟
3. جارج بلن کی زرعی تحقیق کے دو اہم نتائج بیان کریں۔
4. برطانوی راج کے دوران ہندوستان کی برآمدات کی ساخت میں کون سی دو بڑی تبدیلیاں آئیں؟
5. ہندوستان میں زرعی شعبے کے جمود کی دو وجوہات بیان کریں؟

6.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ہندوستان میں نو آبادیاتی دور میں آبادیاتی تبدیلیوں کے مراحل اور ان کے اسباب کی وضاحت کریں۔ نیز 1921 کے بعد آبادی میں تیزی سے اضافے کے محرکات بیان کریں۔
2. دولت کی نکاسی (Drain of Wealth) کے نظریے کی وضاحت کریں۔ اس کے ہندوستانی معیشت پر اثرات اور اس کے مختلف ذرائع کی وضاحت کریں۔
3. برطانوی راج کے دوران ہندوستان کی زرعی اور صنعتی پالیسیوں کا تقابلی جائزہ پیش کریں۔ ان پالیسیوں کے ہندوستانی معیشت اور معاشرے پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟

اکائی 7: زراعت، زمینی مالگزاری، صنعت-برطانوی ہند کا تنقیدی جائزہ

(Agriculture, Land Revenue, Industry–A Critical evaluation of British India)

اکائی کے اجزا:

7.0 تمہید (Introduction)

7.1 مقاصد (Objectives)

7.2 زراعت: روایتی ڈھانچے کی تباہی
(Agriculture: Collapse of Traditional Structure)

7.3 زمینی مالگزاری کا نظام: استحصال کا ایک منظم طریقہ
(Land Revenue System: A Systematic Method of Exploitation)

7.4 صنعت: روایتی صنعتوں کا زوال
(The Industry: Decline of Traditional Industries)

7.4.1 زوالِ صنعت اور روایتی صنعتوں کی تباہی
(De-industrialization and Destruction of Local Industries)

7.4.2 ہندوستان میں برطانوی نو آبادیات کے مراحل
(Stages of British Colonialism in India)

7.4.3 جدید صنعتوں کا ارتقا (Evolution of Modern Industries)

7.5 برطانوی حکومت کے معاشی اثرات: ایک بحث
(The Economic Impact of British Rule: A Debate)

7.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

7.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

7.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

7.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

7.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

7.0 تمہید (Introduction)

برصغیر کی تاریخ میں اٹھارہویں سے انیسویں صدی کا دور محض سیاسی غلامی کا زمانہ نہیں تھا بلکہ یہ معاشی، سماجی اور پیداواری ڈھانچوں میں بڑی بڑی تبدیلیوں کی شروعات ثابت ہوا۔ برطانوی قبضے نے ہندوستان کو جس طور سے متاثر کیا، وہ صرف اقتدار کی ادلا بدلی تک محدود نہیں تھا، بلکہ زرعی نظام، زمینی حقوق، مالگزاری پالیسیوں اور صنعتی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دینے والا انقلاب ثابت ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ برطانوی دورِ حکومت کے معاشی اثرات کا مطالعہ محض تاریخی جستجو کے لیے نہیں بلکہ آج کے ہندوستانی معاشی نظام کو سمجھنے کے لیے بھی ضروری ہے۔ یہ اکائی اسی پس منظر میں زراعت، زمینی مالگزاری اور صنعتی شعبوں کا ایک تنقیدی جائزہ پیش کرنے کے لیے ترتیب دی گئی ہے۔ مقصد یہ نہیں کہ محض برطانوی پالیسیوں کی فہرست پیش کر دی جائے بلکہ اصل توجہ اس بات پر دی گئی ہے کہ ان پالیسیوں کے نتائج، مضمرات اور دورپا اثرات کو غیر جانبدارانہ انداز میں سمجھا جائے۔ زراعت برصغیر کی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی تھی اور آبادی کی بھاری اکثریت اسی پر انحصار کرتی تھی۔ کیا برطانوی اقتدار نے واقعی ہندوستان کو جدید زرعی و صنعتی نظام فراہم کیا اور اس سے زرعی پیداوار میں اضافہ ہوا، جیسا کہ نوآبادیاتی مؤرخین دعویٰ کرتے ہیں؟ یا جیسا کہ قوم پرست مؤرخین کا ماننا ہے کہ یہ دور معاشی استحصال، دیہی غربت، دستکاری کی تباہی اور دیسی صنعتوں کی بربادی کا زمانہ تھا جس کے نتیجے میں کسان مزید بے زمین، قرضدار اور مجبور ہو گیا؟ سچائی ان دونوں بیانات کے درمیان کہیں چھپی ہے، اور اسی تک پہنچنا اس اکائی کا مقصد ہے۔ استمراری بندوبست (1793)، رعیت واری بندوبست، اور ٹیکسوں کی نقد ادائیگی کے نظام نے زمین کی ملکیت کے تصور کو ہی بدل ڈالا۔ کسان جو کبھی زمین سے جڑا ہوا ایک آزاد فرد تھا، اچانک سے ریاستی غلام بن گیا۔ ایک فطری زرعی ڈھانچے کو بازارکاری اور منڈی کی اتھل پتھل نے زبردست جھٹکا دیا۔ نقد آمدنی کی مجبوری نے کسان کو اس بالکل نئی دنیا میں دھکیل دیا جہاں فصل منڈی کی قیمتوں پر منحصر تھی اور منڈی پر انگریز سوداگروں اور بنیوں کے طبقاتی گٹھ جوڑ کا قبضہ تھا۔ اس اکائی میں ہم جائزہ لیں گے کہ کیا یہ نظام جدیدیت کا دروازہ تھا یا استحصال کا شکنجہ؟ اسی طرح صنعتی میدان میں بھی برطانوی دور کو اکثر 'جدید صنعتوں کے قیام کا زمانہ' کہا جاتا ہے، کیونکہ اسی دوران ریل، ڈاک اور ٹیلی گراف جیسے ادارے وجود میں آئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ریلوے کس کے لیے بنائی گئی؟ کیا یہ عوام کی سہولت کے لیے تھی یا فقط خام مال کو بندرگاہوں تک پہنچانے اور تیار شدہ برطانوی مصنوعات کو دیہی منڈیوں تک پہنچانے کے لیے؟ ہندوستان کی قدیم دستکاری، مثلاً بنارس کا ریشمی کپڑا، ڈھاکہ کی ململ اور مراٹھا علاقوں کی لوہے کی صنعتیں کس انجام سے دوچار ہوئیں؟ کیا برطانوی صنعتی انقلاب، جس کی بنیاد ہندوستانی کپاس اور مصالحہ جات پر رکھی گئی، ہندوستان کے لیے بھی انقلاب ثابت ہوا یا زوال کا پیغام؟

یہ اکائی تین بنیادی باتوں پر توجہ مرکوز کرے گی جنھوں نے برطانوی ہندوستان کی معیشت کی تشکیل کی: زراعت، جہاں روایتی خود کفالت کو تجارتی زراعت سے تبدیل کر دیا گیا؛ زمینی محصول کا نظام، جو کسانوں سے زیادہ سے زیادہ دولت نچوڑنے کا ایک مؤثر ذریعہ تھا؛ اور صنعت، جہاں ہندوستان کی عالمی شہرت یافتہ دستکاریوں کو منظم طریقے سے تباہ کیا گیا اور جدید صنعت کی ترقی کو برطانوی مفادات کے تابع رکھا گیا۔ ان تینوں شعبوں کا گہرائی سے تجزیہ کرکے ہی ہم برطانوی راج کے حقیقی معاشی ورثے اور اس کے ہندوستان پر پڑنے والے تباہ کن

اثرات کا مکمل ادراک کر سکتے ہیں۔ اس ضمن میں ہم نہ صرف نو آبادیاتی اور قوم پرستانہ نقطہ نظر کے درمیان تقابل کریں گے بلکہ جدید محققین جیسے آندرے گوندر فرینک (Andre Gunder Frank)، ایرک ہابس بام (Eric Hobsbawm)، بپن چندر (Bipan Chandra) اور ڈی۔ آر۔ گاڈگل (D.R. Gadgil) کے ان نظریات کو بھی زیر بحث لائیں گے جنھوں نے برطانوی دور کے معاشی اثرات کو عالمی سرمایہ داری نظام کے تناظر میں دیکھا ہے۔ اس اکائی کا مقصد طلبہ میں سوال اٹھانے کی جرات پیدا کرنا ہے، کیونکہ حقیقی مطالعہ وہی ہے جو محض معلومات یاد نہ کرے بلکہ انہیں سمجھے، پرکھے اور ان پر تنقیدی نظر ڈالے۔

7.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- برطانوی دور میں زراعت، زمینی مالگزاری اور صنعت کے باہمی تعلق کو سمجھ سکیں گے۔
- زراعت کی تجارت کاری اور اس کے سماجی و معاشی اثرات کو جان سکیں گے۔
- استمراری، رعیت واری اور محل واری بندوبست کے نظام کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- برطانوی دور میں روایتی صنعتوں کی تباہی اور جدید صنعتوں کے ارتقا کا مطالعہ کر سکیں گے۔
- "دولت کی نکاسی" اور "زوالِ صنعت" کے نظریات کو جان سکیں گے۔
- قوم پرست اور نو آبادیاتی مورخین کے مختلف نقطۂ نظر کا تجزیہ کر سکیں گے۔

7.2 زراعت: روایتی ڈھانچے کی تباہی (Agriculture: Collapse of Traditional Structure)

برطانوی راج نے ہندوستان کے زرعی شعبے کو یکسر تبدیل کر دیا۔ یہ تبدیلیاں محض تکنیکی یا انتظامی نوعیت کی نہیں تھیں، بلکہ انہوں نے دیہی معیشت کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا اور کسانوں کی زندگیوں پر گہرے اور زیادہ تر منفی اثرات مرتب کیے۔ برطانوی آمد سے قبل ہندوستان کا دیہی معاشرہ بڑی حد تک خود کفیل تھا۔ گاؤں ایک مکمل معاشی اکائی کی حیثیت رکھتا تھا جہاں کسان اپنی غذائی ضروریات کے لیے فصلیں اگاتے تھے اور مقامی کاریگر (جیسے لوہار، کمہار، جولاہے) ان کی ضروریات پوری کرتے تھے۔ زمینی محصول کا نظام اگرچہ موجود تھا، لیکن وہ عموماً پیداوار کے ایک حصے کی صورت میں وصول کیا جاتا تھا، جس کا مطلب یہ تھا کہ فصل خراب ہونے کی صورت میں کسان پر بوجھ کم ہو جاتا تھا۔ زراعت کا بنیادی مقصد خوراک کی پیداوار اور مقامی ضروریات کو پورا کرنا تھا، نہ کہ منڈی میں فروخت کر کے منافع کمانا۔ برطانوی حکومت نے ہندوستان کی زراعت کو اپنی معاشی ضروریات کے مطابق ڈھالنے کے لیے جو پالیسیاں اپنائیں، ان میں سب سے اہم "زراعت کی تجارت کاری" تھی۔

1. زراعت کی تجارت کاری (Commercialization of Agriculture)

برطانیہ میں صنعتی انقلاب کے لیے خام مال کی بڑھتی ہوئی طلب کو پورا کرنے کے لیے، برطانوی حکومت نے ہندوستانی کسانوں کو

روایتی غذائی فصلوں (جیسے گندم اور چاول) کی بجائے نقد آور فصلیں (Cash Crops) اگانے پر مجبور کیا۔ ان فصلوں میں نیل، کپاس، افیون، پٹ سن، گنا اور چائے شامل تھیں۔ ان فصلوں کا مقصد ہندوستان کی مقامی ضروریات کو پورا کرنا نہیں، بلکہ انہیں برطانوی فیکٹریوں کو خام مال کے طور پر فراہم کرنا یا بین الاقوامی منڈیوں میں فروخت کر کے منافع کمانا تھا۔ اس پالیسی کے کسانوں پر تباہ کن اثرات مرتب ہوئے۔ اول، غذائی فصلوں کی کاشت کا رقبہ کم ہو گیا، جس کی وجہ سے خوراک کی پیداوار میں کمی آئی اور غذائی قلت ایک مستقل مسئلہ بن گئی۔ اس کے نتیجے میں انیسویں صدی کے آخر میں ہندوستان میں بار بار شدید قحط آئے، جن میں لاکھوں لوگ بھوک سے ہلاک ہو گئے۔ اگرچہ قحط برصغیر کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی، لیکن برطانوی دور میں ان کی شدت اور تعداد میں بے پناہ اضافہ ہو گیا، جس کا الزام بہت سے نقاد نوآبادیاتی انتظامیہ کی پالیسیوں پر ڈالتے ہیں۔ دوم، کسان جو فصلیں اگاتے تھے، ان کی قیمت کا تعین مقامی منڈی نہیں بلکہ لندن اور نیویارک کی بین الاقوامی منڈیاں کرتی تھیں۔ قیمتوں میں اتار چڑھاؤ کا براہِ راست اثر کسان پر پڑتا تھا، جو اکثر اپنی فصل کو کم قیمت پر بیچنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ اس غیر یقینی صورت حال نے کسانوں کو مہاجنوں اور ساہوکاروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا، جن سے وہ بھاری سود پر قرض لینے پر مجبور ہوتے اور یوں قرض کے ایک نہ ختم ہونے والے چکر میں پھنس جاتے تھے۔

ہندوستان میں زرعی شعبے کی بازار کاری نے برطانوی کاشت کاروں، ساہوکاروں اور دیگر تاجروں کو فائدہ پہنچایا۔ اس کا دوسرا اثر یہ ہوا کہ دیگر تغذیہ سے متعلق فصلوں کی کاشت کم ہو گئی۔ معاشی مفادات کو آگے بڑھایا گیا۔ مثال کے طور پر 1892 تا 1893 اور 1919 تا 1920 تغذیاتی فصلوں کی کاشت کا علاقہ صرف سات فیصد تھا جب کہ معاشی فصلیں 43 فیصد علاقے پر پھیلی ہوئی تھیں۔ سال 1934 تا 1935 اور 1939 تا 1940 معاشی فصلوں کی کاشت کا علاقہ 1.6 ملین ایکڑ تک پھیل گیا اور تغذیاتی فصلوں کا علاقہ 1.5 ملین ایکڑ تک سکڑ گیا۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس وقت معاشی فصلوں کی بے دریغ پیداوار کی گئی اور انہیں برآمد کیا گیا۔ کپاس کی برآمدات میں سال 1900 اور 1901 کے درمیان میں 1,78,000 ٹن سے سال 37-1936 میں 7,62,133 ٹن کا اضافہ ہوا جو کہ 328 فیصد کا اضافہ تھا۔ چائے کی برآمدات میں سال 1901-1900 میں 190 ملین پاؤنڈ سے لے کر سال 40-1939 میں 359 ملین پاؤنڈ کا اضافہ ہوا۔ اس کے نتیجے میں ہندوستان کی عوام کو تغذیہ کی کمی کا سامنا کرنا پڑا جب کہ آبادی میں اضافہ ہوا۔ جس کے بعد کسی طرح کی ٹیکنالوجی کے بغیر اراضیات کا بٹوارہ ہوا۔

زراعت کی تجارت کاری کی سب سے بدترین مثال نیل (Indigo) کی کاشت تھی۔ برطانوی نیل کے تاجر کسانوں کو پیشگی رقم (جسے 'دَادنی' کہا جاتا تھا) دے کر ان سے معاہدہ کر لیتے تھے کہ وہ اپنی زمین کے سب سے زرخیز حصے پر صرف نیل کاشت کریں گے۔ یہ معاہدے انتہائی ظالمانہ ہوتے تھے۔ کسانوں کو نیل کی انتہائی کم قیمت ادا کی جاتی تھی جو مارکیٹ کی قیمت سے بہت کم ہوتی تھی۔ اگر کسان معاہدے سے انکار کرتا یا نیل کی کاشت سے گریز کرتا تو اسے تشدد کا نشانہ بنایا جاتا، اس کی فصلیں تباہ کر دی جاتیں اور اسے جھوٹے مقدمات میں پھنسا دیا جاتا۔ کسان ایک بار پیشگی رقم لے لیتا تو وہ نسل در نسل ان تاجروں کا غلام بن جاتا، کیونکہ وہ کبھی بھی اس قرض کو ادا نہیں کر پاتا تھا۔ اس شدید استحصال کے خلاف 1859ء میں بنگال کے کسانوں نے بغاوت کر دی، جسے "نیل کی بغاوت" (Indigo Revolt) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ کسانوں نے نیل کاشت کرنے سے انکار کر دیا اور نیل کے کارخانوں پر حملے کیے۔ یہ تحریک ہندوستان کی تاریخ کی پہلی بڑی

کسان تحریکوں میں سے ایک تھی، جس نے ہندو اور مسلمان کسانوں کو متحد کر دیا۔ اس تحریک نے برطانوی حکومت کو "انڈیگو کمیشن" قائم کرنے پر مجبور کیا، جس نے کسانوں پر ہونے والے ظلم کی تصدیق کی اور بالآخر بنگال میں نیل کی جبری کاشت کا خاتمہ ہوا۔

2. **آبپاشی کے نظام کی ترقی** (Development of irrigation systems)

برطانوی حکومت نے اپنے دور میں آبپاشی کے نظام، خاص طور پر نہروں کے جال کو وسیع کیا۔ اگرچہ اس سے لاکھوں ایکڑ زمین قابلِ کاشت ہوئی، لیکن ان منصوبوں کا بنیادی مقصد بھی برطانوی معاشی مفادات کا تحفظ تھا۔ نہروں کی تعمیر ان علاقوں میں کی گئی جہاں نقد آور فصلیں اگائی جاتی تھیں تاکہ ان کی پیداوار کو یقینی بنایا جاسکے۔ آبپاشی کے پانی پر بھاری ٹیکس (آبیانہ) عائد کیا گیا، جس نے کسانوں کے مالی بوجھ میں مزید اضافہ کر دیا۔ اس کے علاوہ، آبپاشی کے فوائد غیر مساوی تھے اور بڑے زمینداروں نے اس سے زیادہ فائدہ اٹھایا جبکہ چھوٹے کسان اکثر محروم رہے۔

3. **دیہی مقروضیت** (Rural Indebtedness)

برطانوی حکمرانوں نے نئی ریونیو پالیسیاں بنائی اور اراضی کی تقسیم کی جس کی وجہ سے زرعی شعبے پر دباؤ بڑھا۔ اس کے علاوہ حکومت اور کسانوں کے مابین درمیانی افراد کا بھی اضافہ ہوا۔ اس عمل میں ان کی کافی دولت صرف ہو جاتی تھی جس کے نتیجے میں زرعی شعبے سے وابستہ افراد کی غربت بڑھی۔ اس طرح دیہی مقروضیت میں اضافہ ہوا اور کسان قرضوں کے جال میں پھنستے چلے گئے۔ یہ صورت حال 1870 میں آبادی میں اضافے کے ساتھ ساتھ مزید خراب ہوتی چلی گئی۔ دوسری جانب پیسہ بازار میں لگ گیا اور کسان قرضوں کے بحران سے نکل نہیں سکے۔ اس کے علاوہ برطانوی حکومت کی پالیسیاں کسان مخالف تھیں اور دیہی کاشت کاروں کے بارے میں اس کا نظریہ منفی ہی تھا۔ بڑھتی ہوئی آبادی، ناقص زرعی سہولتیں اور قدیم زرعی طریقے دیہی مقروضیت میں اضافے کی اہم وجوہات تھیں۔ ان تمام حالات نے زرعی پیداوار میں کمی کر دی جب کہ اخراجات میں اضافہ ہوا۔ اور یہی سب دیہی مقروضیت کی سب سے بڑی وجہ بنی۔

4. **زرعی مزدوروں میں اضافہ** (Increase in Agricultural Labour)

برطانوی پالیسیوں کی وجہ سے زرعی مزدوروں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ برطانوی حکومت کی زمین داری، محل واری اور رعیت واری ریونیو پالیسیوں کا مقصد کسانوں سے زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانا تھا اور یہ نئے قوانین کسانوں کی پٹہ داری حقوق کی ضمانت نہیں دیتے تھے۔ کاشت کاروں کی آمدنی میں کمی، قرض کی وجہ سے زمینوں کو چھوڑ دینا اور زمینوں سے بے دخلی کی وجہ سے پٹہ داری حقوق کا خاتمہ ہوتا گیا اور یہ تمام عوامل زرعی مزدوروں کی تعداد میں اضافے کا سبب بنے۔ بڑھتی ہوئی آبادی کو غیر زرعی سیکٹر میں شامل نہیں کیا جاسکا۔ 1833 سے برطانوی پالیسی برائے شرح قیمت برائے تجارت نے زراعت کی تجارت کاری کی حوصلہ افزائی کی اور دستی مصنوعات کو نقصان پہنچایا۔ دستی صنعت برطانوی اشیا کی درآمدات کی وجہ سے شدید نقصان سے دوچار ہوئی۔ ہندوستانی گھریلو صنعت اور دستی صنعت کی اشیا برطانوی صنعتوں میں تیار اشیا سے مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں اور جس کے نتیجے میں ایک غیر مساوی مقابلہ شروع ہوا۔ جب کہ 1833 سے برطانوی قیمتوں کی شرح پالیسی نے دیہی دستی صنعت کو تباہ کر دیا۔ ہندوستان میں صنعتی ترقی سے متعلق برطانوی لاپرواہی نے مقامی لوگوں کی غربت میں اضافہ کیا اور گزر بسر

کے لیے تمام ذرائع ناپید ہونے لگے۔ عوام کی ایک بڑی تعداد جو زمینوں سے محروم ہو گئی تھی زرعی مزدوری کو اپنانے پر مجبور ہوئی۔

برطانوی زرعی پالیسیوں نے ہندوستانی دیہی معیشت کو تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا۔ کسان، جو کبھی اپنی زمین کا مالک اور اپنی پیداوار کا خود مختار تھا، اب ایک کرایہ دار یا مزدور بن کر رہ گیا، جو برطانوی صنعتوں کے لیے خام مال پیدا کرنے پر مجبور تھا۔ مختصراً، برطانوی راج کے تحت زراعت کا شعبہ ترقی کرنے کے بجائے زوال کا شکار ہوا، اور کسان جو اس ملک کی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی تھا، غربت، استحصال اور بے بسی کی تصویر بن گیا۔

7.3 زمینی مالگزاری کا نظام: استحصال کا ایک منظم طریقہ

(Land Revenue System: A Systematic Method of Exploitation)

برطانوی حکومت کے لیے ہندوستان محض ایک نو آبادی نہیں تھا، بلکہ آمدنی کا ایک بہت بڑا ذریعہ تھا۔ اس آمدنی کا سب سے بڑا حصہ زمینی محصول (Land Revenue) سے حاصل ہوتا تھا۔ لہٰذا، انگریزوں نے ہندوستان کے روایتی زمینی نظام کو ختم کر کے ایسے نئے نظام متعارف کروائے جن کا بنیادی مقصد زیادہ سے زیادہ اور مستقل بنیادوں پر محصول اکٹھا کرنا تھا۔ ان نظاموں نے نہ صرف کسانوں کا معاشی استحصال کیا بلکہ ہندوستان کے دیہی معاشرے کی ساخت کو بھی ہمیشہ کے لیے تبدیل کر دیا۔ برطانوی زمینی محصول کے نظام کے دو بنیادی مقاصد تھے: اول، کمپنی اور بعد میں برطانوی حکومت کو اپنے بڑھتے ہوئے انتظامی اور فوجی اخراجات کو پورا کرنے کے لیے ایک مستقل اور زیادہ سے زیادہ آمدنی کی ضرورت تھی۔ اس لیے انہوں نے ایسے نظام بنائے جس سے حکومت کی آمدنی کی ضمانت حاصل ہو، چاہے فصل کیسی بھی ہو۔ دوم، انگریزوں نے ہندوستان میں زمین کو ایک قابلِ خرید و فروخت شے (Commodity) بنا دیا۔ اس سے پہلے زمین پر کسی فرد کی نجی ملکیت کا تصور واضح نہیں تھا، بلکہ اسے گاؤں کی اجتماعی ملکیت سمجھا جاتا تھا۔ اس تبدیلی کا مقصد ایک ایسا طبقہ پیدا کرنا تھا جو برطانوی حکومت کا وفادار ہو اور محصول کی وصولی میں مدد کرے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں تین بڑے زمینی محصول کے نظام نافذ کیے گئے، استمراری بندوبست، رعیت واڑی نظام، اور محل واری نظام۔

1. استمراری بندوبست (The Permanent Settlement)

کارنوالس نے محسوس کیا کہ موجودہ نظام ملک کو غریب اور زراعت کو برباد کر رہا ہے اور وہ بڑی اور اضافی پیداوار بھی نہیں فراہم کر پا رہا ہے جس کی کمپنی کو امید تھی۔ یورپ کو برآمد کے لیے ہندوستانی سامان کے حصول میں دشواری کی وجہ سے کمپنی کی تجارت کو بھی نقصان پہنچا۔ کمپنی کی دو بڑی برآمدات ریشم یا کپاس کی پیداوار بنیادی طور پر زراعت پر مبنی تھیں، جب کہ زراعت میں کمی نے دستکاری کو بھی متاثر کیا۔ چنانچہ یہ سوچا گیا کہ اس صورت حال کو بہتر کرنے کا واحد طریقہ مالگزاری کے مسئلے کو مستقل طور پر طے کرنا ہے۔ در حقیقت 1770 سے ہی یعنی کارنوالس کے آنے سے کافی پہلے، کمپنی کے متعدد افسران اور الیکزینڈر ہنری پیٹلو، فلپ فرانسس اور تھامس لا جیسے یورپی مشاہدین استمراری بندوبست کی وکالت کرتے آرہے تھے۔ اپنے الگ الگ خیالات کے باوجود اس مادی نظریے میں سب کو یقین تھا جو کسی بھی ملک کی معیشت میں زراعت کو اولیت دیتا ہے۔ یہی نظریات 1793 کے استمراری (مستقل) بندوبست کی بنیاد بنے جس نے بنگال میں

'حتمی تشخیص' کے اصول کو لاگو کیا۔ اس سے اس بد عنوانی کی گنجائش کم ہو گئی جو افسران اپنی مرضی سے تشخیص میں تبدیلی کر کے کر سکتے تھے۔ زمیندار، منافع کو زمین کو بہتر بنانے میں لگا سکتے تھے، کیونکہ ریاست کا مطالبہ مستقل ہونے کی وجہ سے ان کو ہی پیداوار میں اضافے اور آمدنی میں بڑھوتری کا پورا فائدہ حاصل ہو گا۔ کمپنی کو باقاعدگی سے ٹیکس ملتا رہے گا۔ جیسا کہ کارنوالس کا خیال تھا کہ کمپنی حسب ضرورت کاروبار اور تجارت پر ٹیکس لگا کر اپنی آمدنی بڑھا سکتی تھی۔ 90-1789 کی تشخیص کو معیار مان کر یہ مالگزاری 268 لاکھ روپے (تقریباً 30 لاکھ پاؤنڈ) مقرر کی گئی۔ پی جے مارشل کے مطابق 1793 میں مالگزاری کا مطالبہ 1757 سے پہلے کے مقابلے میں تقریباً 20 فیصد زیادہ تھا۔ وہیں بی۔ بی۔ چودھری کے حساب سے یہ 1765 اور 1793 کے درمیان لگ بھگ دوگنا ہو گیا تھا۔

کمپنی کے لیے دوسرا مسئلہ یہ فیصلہ کرنا تھا کہ مالگزاری کس سے حاصل کرنی ہے۔ نواب اسے زمینداروں سے وصول کرتے تھے۔ ان میں سے کچھ بڑے جاگیردار تھے جو بڑے علاقوں کو کنٹرول کرتے تھے اور ان کے پاس خود کے مسلح دستے تھے۔ 1790 میں بنگال کے بارہ بڑے زمینداروں نے مالگزاری کے 53 فیصد سے زیادہ حصے کی ادائیگی کی۔ دوسرے چھوٹے زمیندار، براہ راست ریاست کو یا بڑے زمینداروں کے ذریعے مالگزاری ادا کرتے تھے۔ کسان کھیتی کرتے تھے اور زمینداروں کو روایتی نرخوں پر ادائیگی کرتے تھے، جو اکثر الگ الگ تحصیلوں میں مختلف ہوتی تھی اور بعض اوقات اضافی قانونی رقم بھی وصول کی جاتی تھی جسے ابواب (Abwab) کہا جاتا تھا۔ کمپنی انتظامیہ نے کچھ زمینداروں کو برقرار رکھا اور دیگر کی جگہ نئے مال گزار کسانوں کو دے کر اس صورت حال کو کافی الجھا دیا۔ تشخیص کے معاملے میں بھی روایتی حقوق کو نظر انداز کر دیا گیا اور جب تک کارنوالس کی آمد ہوئی اس خطے میں مکمل بد نظمی پھیل چکی تھی۔ برطانیہ کے زمیندار طبقے سے تعلق رکھنے کے ناطے کارنوالس فطری طور پر زمینداروں کو ترجیح دیتا تھا۔ زمینداروں سے توقع کی گئی کہ اگر ان کی ملکیت کے حقوق محفوظ کر دیے جائیں گے تو وہ زراعت کی بہتری کے لیے سرمایہ کاری کریں گے۔ بے شمار کسانوں سے آمدنی وصول کرنے کے مقابلے، جس کے لیے ایک بڑی انتظامی مشینری کی ضرورت پڑتی تھی، چیندہ زمینداروں سے مالگزاری وصول کرنا آسان تھا اور بالآخر یہ مقامی آبادی کے ایک طاقتور طبقے کی وفاداری کو یقینی بنا سکتا تھا۔ چنانچہ 1793 میں زمینداروں کے ساتھ استمراری بندوبست کیا گیا۔ بنگال، بہار اور اڑیسہ کی انچ انچ زمین اب ایک زمینداری کا حصہ بن گئی اور زمیندار کو اس پر مقرر کردہ مالگزاری ادا کرنا پڑتی۔ اگر وہ ایسا کرتا تو وہ اپنی زمینداری کا مالک رہ سکتا تھا، اسے بیچ سکتا تھا، رہن رکھ سکتا تھا اور منتقل کر سکتا تھا، اور یہ زمین اس کے ورثا کو بھی مل سکتی تھی۔ لیکن مالگزاری کی ادائیگی میں ناکامی کی صورت میں حکومت کی طرف سے زمینداری کو ضبط کر کے نیلامی کے ذریعے فروخت کر دیا جاتا تھا۔ پھر تو اس پر نئے خریدار کا مالکانہ حق ہوتا تھا۔ یہ نام نہاد نجی زمینی ملکیت کی تخلیق تھی۔

استمراری بندوبست نے زمین کی ملکیت کا حق زمینداروں کو دے دیا جو پہلے صرف مالگزاری وصول کرنے کا حق رکھتے تھے۔ اس لیے اس سارے معاملے یا بندوبست میں جن لوگوں کا نقصان ہوا وہ کسان تھے جنہیں زمینداروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ ان کے روایتی قبضے کے حق (Occupancy Rights) کو نظر انداز کر دیا گیا اور وہ کرایہ دار (Tenants) بنا کر رکھ دیے گئے۔ زمیندار، پٹے (کسان اور زمیندار کے درمیان تحریری معاہدہ جس میں ادا کیے جانے والے لگان کی رقم کا ریکارڈ ہوتا تھا) پر شاذ و نادر ہی عمل کرتے تھے۔ نہ

ہی حقوق اور ذمہ داریوں کے کسی بھی رسمی ریکارڈ کو کسان پسند کرتے تھے کیونکہ اس سے انہیں نقصان کا اندیشہ ہوتا تھا۔ اونچی مالگزاری کے تعین کا بوجھ کسانوں پر ڈال دیا گیا جن سے اکثر غیر قانونی اضافی رقوم ادا کرنے کا مطالبہ بھی کیا جاتا تھا۔ 1799 اور 1812 کے قوانین (Regulations) نے زمینداروں کو یہ حق دیا تھا کہ وہ کرایہ دار (کسان) کی جانب سے ادائیگی نہ ہونے کی صورت میں عدالت کی اجازت کے بغیر ان کی جائیداد ضبط کر سکتے تھے۔

اگرچہ یہ بندوبست زمینداروں کی حمایت کرتا تھا لیکن انہیں بھی کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ جیسا کہ ڈینیل تھورنر (Daniel Thorner) نے استدلال کیا ہے، زمین کی نجی ملکیت کی تخلیق ایک غلط لفظ تھا، کیونکہ حقیقی ملکیت تو سامراجی اقتدار اعلیٰ کے ہاتھوں میں تھی۔ زمینداروں کو نام نہاد "غروب آفتاب قانون" (Sunset Law) کے تحت ایک مخصوص تاریخ تک مالگزاری ادا کرنی پڑتی تھی، جس میں ناکامی کے نتیجے میں ان کی زمینداری نیلام کر دی جاتی تھی۔ ان کے لیے اکثر لگان وصول کرنا مشکل ہو جاتا تھا کیونکہ مطالبات بہت زیادہ تھے اور فطرت کی غیر یقینی صورت حال الگ سے تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ زمینداری جائیدادوں کی بڑے پیمانے پر فروخت ہونے لگی۔ 1794 اور 1807 کے درمیان بنگال اور بہار میں تقریباً 41 فیصد مالگزاری والی زمین نیلامی میں فروخت کی گئی۔ اڑیسہ میں 1804 اور 1818 کے درمیان نیلامی کی وجہ سے 51.1 فیصد اصلی زمیندار تباہ ہو گئے۔ یقیناً اس کا مطلب پرانے زمیندار طبقے کا زوال تھا لیکن پرانے مفروضوں کے برعکس جن لوگوں نے یہ زمینیں خریدیں وہ بنگال کے زرعی سماج میں ایک دم نئے نہیں تھے۔ پرانی زمینداریوں کو خود ان کے اپنے عملوں (زمینداری کارندوں)، امیر کسانوں یا پڑوسی زمینداروں نے آپس میں بانٹ لیا۔ بردوان زمینداری جیسے کچھ قدیم گھرانوں نے اپنے آپ کو شکمی زمینداری (Sub-infeudation) کے نئے طریقے کو اپنا کر بچائے رکھا، جس سے پٹے داری کی ساخت بے تکی اور پیچیدہ ہو گئی۔ نئی قانونی اصلاحات غریب کسانوں کو کوئی راحت نہیں دے سکیں۔

دوسری طرف ان اصلاحات نے صرف طاقتور امیر کسانوں کے ایک طبقے کو مضبوط کیا جنہیں "جوتدار" کہا جاتا تھا جو کہ حقیقت میں گاؤں کی سطح پر "جوتوں" پر تسلط رکھتے تھے جیسا کے رجت رے (Rajat Ray) اور رتن لیکھا رے (Ratnalekha Ray) کا ماننا ہے۔ دوسری طرف زمینداروں کو صرف مالگزاری وصول کرنے کا حق حاصل تھا۔ رے کی دلیل یہ ہے کہ نوآبادیاتی پالیسیوں سے آئی تبدیلیوں کے باوجود جوتداروں کی طاقت اور دیہی سماج میں ان کی پکڑ پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ ساتھ ہی نوآبادیاتی بنگال کے دیہی سماج کا تسلسل اسی بات میں تھا۔ جوت داری مفروضے (Jotedar Thesis) پر تیکھا حملہ سگاتا بوس (Sugata Bose) کی ایک تخلیق (1986) میں کیا گیا ہے جنہوں نے جوتداروں کے ایسے غلبے کو شمالی بنگال تک ہی محدود پایا۔ باقی علاقوں میں انہوں نے زرعی معیشت کے دو دوسرے واضح نظاموں کا پتہ لگایا ہے: مغربی بنگال میں کسانوں کی جوت اور آزاد مزدوروں کا ایک مربوط نظام، اور مشرقی بنگال میں چھوٹی جوتوں کا نظام۔ دونوں علاقوں میں انہوں نے 1930 کی دہائی تک زمینداروں کی طاقت کو غیر متاثر پایا اور اس نقطہ نظر کی حمایت اکینوبو کوئی (Akinobu Kawai) اور پارتھ چٹرجی (Partha Chatterjee) کی تصنیفات نے بھی کی ہے۔ جوتدار کے حق میں اپنی بعد کی ایک تحریر میں رجت رے نے یہ بات مانی ہے کہ دیہی بنگال میں زمینداروں کا اثر اور اختیار غالباً 1930 کی دہائی تک بنا رہا۔ ہاں! لیکن پھر بھی اس پورے دور میں

اچھے مالدار کسانوں کا ایک حصہ ایسا بھی رہا جن کو بنگال کے گاؤں میں اچھی خاصی طاقت حاصل تھی۔ بہر کیف زمینداروں کو زمین کا مالک تسلیم کرتے ہوئے 1790 میں ان کے ساتھ دس سال کا معاہدہ کیا گیا۔ 1893 میں دس سالہ بندوبست کو استمراری (مستقل) قرار دے دیا گیا اور زمیندار اور ان کے قانونی وارثین کو اپنی جائیدادیں ہمیشہ کے لیے متعین شدہ مالگزاری پر رکھنے کی اجازت دے دی گئی۔ ریاست کا حصہ 89% طے ہوا اور 11% حصہ زمیندار کو ان کی ذمہ داری نبھانے کے عوض دے دیا گیا۔

فوائد (Advantages)

مالی طور پر، استمراری بندوبست نے ریاست کے لیے ایک مقررہ اور مستحکم آمدنی طے کر دی اور ریاست کے لیے یہ آمدنی مستقل تھی چاہے فصل اچھی ہو یا نہ ہو۔ اس نے حکومت کے وہ اخراجات بچائے جو وقتاً فوقتاً تشخیص اور بندوبست کرنے میں خرچ ہوتے تھے۔ معاشی طور پر، استمراری بندوبست سے زراعت کی بازار کاری کی ہمت افزائی ہوئی اور تجارت میں اضافہ ہوا۔ بنجر زمینوں پر بھی کاشتکاری شروع ہوئی اور زیر کاشت زمین کو بہتر بنایا گیا۔ زمینداروں نے کاشت کے نئے طریقے متعارف کروائے جیسے فصلوں کی ادلا بدلی، کھاد کا استعمال وغیرہ۔ اس بندوبست کی بنا پر مٹی کی مکمل صلاحیت کو فروغ دینے کی کوششیں کی گئیں، جس کے نتیجے میں ایک مثبت اور صاحب تدبیر کسان طبقہ پیدا ہوا۔ سیاسی طور پر، کارنوالس کو توقع تھی کہ استمراری بندوبست سے وفادار زمینداروں کا ایک طبقہ پیدا ہو گا جو ہر قیمت پر کمپنی کا دفاع کرنے کے لیے تیار ہو گا کیونکہ کمپنی کی طرف سے ان کے حقوق کی ضمانت دی گئی تھی۔ بنگال کے زمیندار 1857 کی عظیم بغاوت کے دوران کمپنی کے وفادار رہے۔ سماجی طور پر، زمیندار، کسانوں (Ryot) کے فطری رہنما ثابت ہوئے اور تعلیم اور دیگر فلاحی سرگرمیوں کے پھیلاؤ میں مدد کرنے کے لیے اپنے اجتماعی جذبے کا مظاہرہ کیا۔ بنگال کے استمراری بندوبست نے کمپنی کے قابل ترین ملازمین کو تشخیص کے جھنجھٹ سے آزاد کر دیا جس بنا پر وہ عدالتی خدمات کے لیے اپنا وقت دینے کے قابل ہو گئے۔ مزید یہ کہ اس نے عارضی بندوبست سے منسلک خرابیوں جیسے، کاشتکار کو ہراساں کرنے، کاشتکار کی جانب سے مدت کے اختتام پر زمین کو خراب ہونے کے لیے چھوڑنے تاکہ وہ تشخیص میں خراب ثابت ہو، کے رجحان سے بچایا۔

نقصانات (Disadvantages)

گو کہ استمراری بندوبست اپنے پہلے سالوں میں بہت کارآمد ثابت ہوا لیکن یہ جلد ہی استحصال اور جبر کے آلے میں تبدیل ہو گیا۔ اس نے "سب سے اوپر زمین دار اور سب سے نیچے غلام" پیدا کرنے شروع کیے۔ مالی طور پر، طویل مدتی لحاظ سے ریاست کو شدید نقصان اٹھانا پڑا۔ جب زمین کے نئے قطعات زیر کاشت لائے گئے اور پہلے سے زیر کاشت زمین کی لگان میں کئی گنا اضافہ کیا گیا تو ریاست اس اضافے میں اپنے جائز حصہ کا دعویٰ نہیں کر سکتی تھی۔ 1793 میں طے شدہ ریاستی حصہ 1954 میں بھی اتنا ہی رہا۔ استمراری بندوبست نے بنگال کی معاشی ترقی کو روک دیا۔ زیادہ تر زمینداروں نے زمین کی بہتری میں کوئی دلچسپی نہیں لی بلکہ وہ کاشتکاروں سے صرف زیادہ سے زیادہ ممکنہ کرایہ حاصل کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ کاشتکار، بے دخلی کے مسلسل خوف میں رہتے تھے اور زمین کو بہتر بنانے میں ان کی کوئی دلچسپی باقی نہ رہی۔ زمیندار جاگیروں پر نہیں رہتے تھے بلکہ دور شہروں میں رہتے تھے جہاں وہ عیش و عشرت میں اپنا وقت اور پیسہ ضائع کرتے تھے۔ اس

کے علاوہ، ریاست اور اصل کاشتکاروں کے درمیان دلال پروان چڑھے۔ زمین داروں اور کسانوں کے درمیان میں نئے ثالث (بچو لیے یا گماشتے) پیدا ہوئے جنہیں اپنے منافع سے مطلب تھا اور کاشتکار کی حیثیت کم ہو کر ایک مزدور کی سی ہو گئی۔ امریکی زرعی سائنسداں جارج کارور (George Carver) لکھتا ہے کہ: "جنگ، قحط اور وبائی امراض کے بعد، دیہی برادری کے ساتھ سب سے زیادہ خراب جو ہو سکتا تھا وہ غیر حاضر زمینداری تھی۔" سیاسی طور پر، برطانوی انتظامیہ نے عوام کی ناراضگی و بیگانگی کی قیمت پر چند زمینداروں کی وفاداریاں حاصل کیں۔ اس نظام نے دیہی سماج کو زمینداروں اور کرایہ داروں (کاشتکاروں) میں تقسیم کر دیا۔ سماجی طور پر، زمینداروں کی ملکیت کے مطلق حق کو تسلیم کرتے ہوئے، کمپنی نے کسانوں کی جائیداد یا قبضے کے حقوق کو قربان کر دیا۔ ان کے مالکانہ حقوق کو ختم کر کے اور مکمل طور پر زمیندار کے رحم و کرم پر چھوڑ کر ان کے ساتھ ناانصافی کی گئی۔ آبادی میں اضافے کے نتیجے میں زمین پر بے تحاشہ دباؤ پڑا جو کہ زمینداروں کے ہاتھ میں تھی اور اس سے کسان کی حیثیت ایک غلام کی سی ہو گئی۔ زمینداروں کو مالگزاری کے لیے مقرر کردہ آخری دن کے غروب آفتاب تک مالگزاری سرکاری خزانے میں جمع کروانا تھا جس میں ناکامی کی صورت میں زمینیں ضبط کر کے نیلام کر دی گئیں۔ اس غروب آفتاب کے قانون نے بڑی مشکلات پیدا کیں اور بہت سے زمینداروں کو ان کی زمینوں سے محروم کر دیا، اور اتنا عدم تحفظ پیدا کر دیا کہ ایک وقت ایسا آیا جب کوئی بولی لگانے والا سامنے نہیں آ رہا تھا۔ زمین کی ملکیت میں متواتر تبدیلیوں نے کاشتکاروں کی حالت کو متاثر کیا۔

2. **رعیت واری بندوبست** (Ryotwari Settlement)

کارنوالس کو توقع تھی کہ اس کا استمراری بندوبست یا زمینداری نظام ہندوستان کے دیگر حصوں تک بھی پھیل جائے گا۔ جب ویلزلی ہندوستان آیا تو اس نے 1798 میں مدراس پریزیڈنسی تک اس کی توسیع کا حکم دیا۔ یہاں مسئلہ بنگال کی طرح قابل قدر زمینداروں کی تلاش کا تھا۔ مدراس انتظامیہ نے بڑے پیمانے پر مقامی پولیگاروں کا تعارف زمیندار کے طور پر کرایا جنہیں مدراس پریزیڈنسی میں زمیندار کے طور پر تسلیم بھی کر لیا گیا۔ ایسے علاقوں میں جہاں ایسے لوگ نہیں مل سکے، دیہی جائیدادوں کو جمع کر کے سب سے زیادہ بولی لگانے والوں کو نیلامی میں فروخت کر دیا گیا۔ برطانوی سرکاری حلقوں میں استمراری بندوبست کے بارے میں مایوسی بڑھ رہی تھی کیوں کہ اس کی وجہ سے حکومت کے پاس آمدنی بڑھانے کا کوئی ذریعہ نہیں بچا تھا۔ تھامس منرو (Thomas Munro) جس نے کمپنی کے مالگزاری نظام میں تبدیلی لانے کی پہل کی تھی، ہندوستان میں حکومتی منصوبہ بندی کی پالیسی کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔ ڈیوڈ ریکارڈو (David Ricardo) کا لگان کا نظریہ موجودہ نظام پر نظر ثانی کا اشارہ دے رہا تھا۔ لگان یا کرایہ زمین سے حاصل ہونے والا فاضل تھا یعنی اس کی آمدنی میں سے پیداوار پر آنے والی لاگت اور مزدوری کو الگ کرنے کے بعد بچنے والی رقم اور ریاست کے پاس اس اضافی رقم پر دعویٰ جائز تھا بجائے اس کے کہ انہیں غیر پیداکاروں (ثالثوں، بچولوں، گماشتوں) کے حوالے کیا جاتا، جن کا واحد دعویٰ ان کے ملکیتی حق کی وجہ سے تھا۔ نئے بندوبست کی ایک زیادہ طاقتور وجہ مدراس پریزیڈنسی کا ہمہ وقت رہنے والا مالی بحران تھا جو جنگ کے بڑھتے ہوئے اخراجات کی وجہ سے مزید گہرا ہو گیا تھا۔ یہ مدراس پریزیڈنسی میں رعیت واری بندوبست کی ابتدا تھی۔

رعیت واری کا تجربہ الیگزینڈر ریڈ (Alexander Reed) نے 1792 میں بارہ محل میں شروع کیا تھا اور اسے تھامس منرو نے

1801 سے جاری رکھا جب اسے ملحقہ اضلاع کے محصول انتظامیہ کا چارج سنبھالنے کو کہا گیا۔ زمینداروں کے بجائے اس نے براہ راست گاؤوں سے مالگزاری اکٹھا کرنا شروع کیا، اور ہر گاؤں کے ذمے ادائیگی کی رقم طے کر دی۔ اس کے بعد اس نے ہر کاشت کار یا رعیت کا الگ الگ جائزہ لیا اور اس طرح رعیت واری نظام تیار کیا۔ اس نے زمین کی ذاتی ملکیت کی تخلیق کی اور یہ زمیندار کے بجائے کسانوں کے ہاتھ میں تھی۔ منرو نے "چار یا پانچ سو بڑے مالکان کے مقابلے میں چالیس سے پچاس ہزار چھوٹے مالکان کے ہاتھ میں" ہونے کو ترجیح دی۔ ہر کھیت پر قابل ادائیگی لگان کا فیصلہ کرنے کے لیے (Field-Assessment System) یا ایک کھیت جائزہ نظام تیار کیا گیا جس میں مستقل طور پر تمام زمینوں کے عمومی سروے کے ذریعے تخمینہ لگایا جاتا تھا۔ حکومت اور کاشتکار کے درمیان سالانہ معاہدے کیے جاتے تھے، اور کاشتکار معاہدے کو قبول کرنے یا مسترد کرنے کا اختیار رکھتے تھے۔ اگر کاشتکار راضی ہوتا تو اسے ایک پٹہ ملتا، جو اسے نجی ملکیت کا حق دیتا اور اگر کوئی کاشتکار نہ ملتا تو زمین ویسی ہی پڑی رہتی۔ لہٰذا پرکشش اور قابل لحاظ ہونے کے لیے زمین کے تفصیلی سروے کی ضرورت تھی یعنی مٹی کا معیار، کھیت کا رقبہ اور زمین کے ہر ٹکڑے کی اوسط پیداوار کا تخمینہ لگا کر اس کی بنیاد پر مالگزاری کی مقدار طے کی جاتی تھی۔ لیکن عملی طور پر تخمینہ، اندازے کی بنیاد پر لگایا جاتا اور حکومتی طلب اکثر اتنی زیادہ ہوتی تھی کہ وہ بڑی مشکل سے حاصل ہو پاتی تھی یا بالکل ہی ناقابل حصول تھی۔ چنانچہ 1807 میں منرو کی لندن روانگی کے فوراً بعد رعیت واری نظام تقریباً ترک کر دیا گیا۔

1820 کے آس پاس جب تھامس منرو مدراس کے گورنر کے طور پر ہندوستان واپس آیا تو صورت حال بدلنا شروع ہو گئی، کیونکہ اس نے دلیل دی کہ رعیت واری قدیم ہندوستانی مالگزاری نظام تھا اور ہندوستانی حالات کے لیے بہترین طور پر موزوں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ برطانوی سلطنت کو خود مختاری کے ایک متفقہ تصور کی ضرورت ہے اور رعیت واری نظام اس کے لیے ایک بنیاد فراہم کر سکتا ہے۔ وہ یہ دلیل دے کر اپنے موقف کا جواز پیش کرتا ہے کہ ہندوستان میں تاریخی طور پر زمین ریاست کی ملکیت تھی اور ریاست نے انفرادی کسانوں سے مالگزاری وصول کرنے کے لیے افسران کے ایک سلسلے کا استعمال کیا جنہیں انعام میں زمینیں دی جاتی تھی۔ منرو نے زور دیا کہ یہ نظام کسانوں کے لیے مالگزاری کے بوجھ کو کم کرے گا جب کہ اس سے ریاست کے لیے زمینی محصولات کی بڑی مقدار حاصل ہو گی کیونکہ اس میں کوئی بچولیہ (ثالث یا گماشتہ) نہیں ہو گا جو اضافی رقم کا حصہ دار بنے گا۔ اگرچہ اس سے حکومت کی آمدنی میں اضافہ ہوا، لیکن اس نے کاشتکاروں کو شدید پریشانی میں ڈال دیا۔ بہت سے علاقوں میں کوئی سروے نہیں کیا گیا تھا اور رعیت کے ٹیکس کا تخمینہ، پچھلی ادائیگیوں کے اندازے سے گاؤں کے کھاتوں کی بنیاد سے کیا جانے لگا، جسے پٹ کٹ بندوبست (Put-cut Settlement) کہا جاتا تھا۔ رعیت کی طرف سے ادا کی جانے والی آمدنی ہر کھیت پر نہیں پورے فارم پر مقرر کی گئی تھی جس میں آبپاشی کی سہولیات اور پیداواری صلاحیت مختلف سطحوں کی ہو سکتی تھیں۔ کسان روز بروز مقروض ہو رہے تھے اور کھیتی کی توسیع کے لیے سرمایہ کاری نہیں کر سکتے تھے۔

رعیت واری نظام نے گاؤں کے اشرافیہ کو حکومت اور کسانوں کے درمیان بچولیے کے طور پر ختم نہیں کیا۔ چونکہ مراعات یافتہ میراثی داروں کے خصوصی حقوق کو تسلیم کیا گیا تھا اور برہمنوں کی ذات کی مراعات کا احترام کیا گیا تھا، موجودہ گاؤں کی طاقت کا ڈھانچہ شاید ہی بدلا تھا بلکہ درحقیقت نئے نظام سے اور بھی مضبوط ہوا تھا۔ میراثی دار زرعی ذاتیں تھیں جیسے کہ تامل علاقے میں ویلال۔ مالگزاری حکام نے

اپنے آپ میں مالگزاری اور وصولی اور پالیسی ڈیوٹی کو یکجا کر دیا تھا جس کا نتیجہ ماتحت اہلکاروں کی جانب سے رشوت اور بدعنوانی کی صورت میں نکلا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ موثر اصلاحات کی ضرورت تھی۔

مدراس کے زرعی سماج پر رعیت واری نظام کے اثرات کو مختلف طریقوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس نے جائیداد کے حقوق کی تعریف کی، اس نے درحقیقت گاؤں کے طاقتور افراد کی طاقت کو اور مضبوط کیا اور اس طرح سماجی تنازعات میں شدت آئی۔ مدراس حکومت نے میراثی داری طاقت کے خلاف کرایہ داروں کی فعال لیکن بے نتیجہ مزاحمت کے باوجود ان کے حقوق کے تحفظ میں قطعی کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ تنجاور (تنجور) ضلع میں کاویری ڈیلٹا میراثی داروں کے "سنہری دور" کو ظاہر کرتا ہے، جنہوں نے زمین اور مزدوروں پر اپنا تسلط جمالیا اور اس طرح "مقامی سماج کی واضح تفریق کو تیز تر کر دیا"۔ مدراس پریذیڈنسی کے آندھرا اضلاع میں رعیت واری نظام نے کسانوں کے اندر تفریق کو فروغ دیا۔ بڑے زمینداروں کا ایک امیر گروپ تھا جسے "کسان بورژوا" کہا جاتا تھا جو بڑے کھیتوں کو کنٹرول کرتا تھا اور اضافی زمین بے زمین کرایہ داروں اور بٹائی پر کاشت کرنے والوں کو لیز (Lease) پر دیتا تھا۔ ایک طرف بچو لیے طبقے کے معاشی حالات مستحکم تھے تو دوسری طرف غریب کسان جو کہ دیہی آبادی کی اکثریت تھی، ناساز گار حالات میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ امیر کسانوں اور قرض داروں کے ہاتھوں ان کا استحصال کیا گیا اور وہ نامساعد حالات کے باوجود مزدوری کرنے پر مجبور ہو گئے اور زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے بندھے رہے۔

بمبئی پریزیڈنسی میں رعیت واری نظام کا آغاز 1803 میں اس کے گجرات میں الحاق کے بعد ہوا تھا، اور پھر جب 1818 میں پیشوا کے علاقوں کو فتح کیا گیا تھا، تو اسے منرو کے شاگرد ماؤنٹ اسٹوارٹ ایلفنسٹن (Mount Stuart Elphinstone) کی نگرانی میں ان علاقوں تک بڑھا دیا گیا تھا۔ ابتدائی طور پر، ان علاقوں میں انگریز، دیش مکھوں اور گاؤں کے سرداروں یا پٹیلوں کے ذریعے مالگزاری وصول کرتے تھے۔ لیکن اس سے اتنی آمدنی نہیں ہوئی جتنی ان کو توقع تھی۔ اسی لیے انہوں نے 14-1813 سے کسانوں سے براہ راست مالگزاری وصول کرنا شروع کی۔ چونکہ مقرر کردہ محصولات کی شرحیں غیر معمولی طور پر زیادہ نکلیں۔ بار بار فصل کی ناکامی اور قیمتوں میں کمی کے باعث، کسانوں کو یا تو اپنی زمینیں ساہوکاروں کے پاس گروی رکھنی پڑیں یا پھر کاشت چھوڑ کر پڑوسی ریاستوں میں ہجرت کرنا پڑی جہاں قیمتیں کم تھیں۔ یہ اسکیم، جو پہلی بار 1830 میں اِنداپور تعلقہ میں متعارف کرائی گئی تھی، جلد ہی ناقص پائی گئی اور اسے ترک کر دیا گیا۔ اسے 1835 میں دو افسران جی ونگیٹ (G. Wingate) اور گولڈ اسمتھ (Goldsmith) کے ذریعے وضع کردہ ایک اصلاح شدہ "بامبے سروے سسٹم" (Bombay Survey System) کے ذریعے تبدیل کر دیا گیا۔

مغربی ہندوستان کے زرعی سماج پر رعیت واری بندوبست کا اثر تاریخی بحث کا موضوع ہے، کیونکہ اس نے 1875 میں بامبے اور دکن میں دیہی بغاوت کو جنم دیا تھا۔ اس نے گاؤں کے پاٹل (پٹیل) کی حیثیت کو ایک عام کسان اور حکومتی ملازم تک محدود کر دیا تھا۔ بندوبست نے تمام زمینداروں کو بھی بے گھر نہیں کیا تھا۔ گجرات میں بھاگے داروں، نرواداروں اور احمد آباد کے تعلقہ داروں کے اعلیٰ حقوق کا احترام کیا گیا، اور اس کے نتیجے میں، ان خطوں میں "زیادہ سے زیادہ سیاسی اور سماجی استحکام کو یقینی بنایا گیا۔" صرف وسطی دکن ہی میں طاقت کا خلا پیدا

ہوا، جس نے مارواری اور گجراتی بنیوں کے لیے زیادہ فعال کردار کے مواقع فراہم کیے۔ یہاں جو بات شاید دیکھی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ مدراس اور بمبئی دونوں میں رعیت واری نظام کے سماجی اثرات، استمراری بندوبست کے مقابلے کم تباہ کن تھے۔ لیکن اس کے "تسلسل" کے موضوع پر بحث کرنا مشکل ہے، کیونکہ پرانی شکلیں جو رائج تھیں، "سامراج کے ذریعے مختلف انداز میں ترتیب دی جاچکی تھیں۔"

3. **محل واری بندوبست** (Mahalwari Settlement)

"گاؤں کی برادری"، جس کے بارے میں کچھ ابتدائی مغربی مبصرین نے اتنی وضاحت سے بات کی، نہ تو اس کا خیال استمراری بندوبست میں رکھا گیا اور نہ ہی رعیت واری نظام میں۔ تاہم، جب ان دو نظاموں پر کام کیا جارہا تھا، شمال اور شمال مغربی ہندوستان کے وسیع علاقے جو ایک زمانے میں مغل سلطنت کا مرکز تھے، جو ہمالیہ کے دامن سے لے کر وسطی ہندوستانی پٹھار تک بشمول گنگا جمنا دوآب پھیلے ہوئے تھے۔ اس علاقے کی زرعی ساخت میں، ایک طرف، زمینداروں کا ایک چھوٹا گروہ تھا، جسے تعلقہ دار کے نام سے جانا جاتا تھا۔ سید نورالحسن (Saiyid Nurul Hasan) نے انہیں "درمیانی زمیندار" کہا ہے، جنہوں نے "دیے گئے علاقے کی مالگزاری کی وصولی کے لیے ریاست کے ساتھ معاہدہ کیا۔" دوسری طرف، "بنیادی زمینداروں" کا ایک بڑا گروہ تھا، جو "زرعی اور رہائشی زمینوں پر ملکیتی حقوق" رکھتے تھے۔ اس گروپ میں چھوٹے مالک کسان اور کئی گاؤوں کے بڑے زمیندار بھی شامل تھے۔ بنگال طرز کو ذہن میں رکھتے ہوئے، انگریز مالگزاری کی وصولی کے لیے ابتدائی طور پر تعلقہ داروں سے رجوع ہوئے، جن میں اٹھارویں صدی کے آخر تک دو الگ الگ سماجی گروہ شامل ہو گئے تھے۔ ایک طرف مقامی طور پر "پشتینی ریاستوں کے حکمران" تھے اور دوسری طرف مغل جاگیردار، مالگزاری حکام اور ٹیکس دینے والے مالدار کسان جنہوں نے خود کو "اصل راجا یا تعلقہ دار" بنا رکھا تھا۔

بہت سے بڑے تعلقہ داروں نے نئی حکومت اور اس کی اونچی مالگزاری کی مانگ کے خلاف مزاحمت کی تاہم انہیں انتہائی بے رحمی کے ساتھ کچل دیا گیا۔ بہت سے لوگوں کو بھگا دیا گیا اور ان کے کچے قلعوں کو زمین بوس کر دیا گیا۔ دیگر معاملات میں حکومت کی طرف سے محصول نہ چکا پانے کی صورت میں جائیدادیں فروخت کر دی گئیں۔ نتیجے کے طور پر، 1820 تک، ان میں سے بہت سے لوگ "یا تو اپنی حیثیت مکمل طور پر کھو چکے تھے یا پھر حقیر ہو کر رہ گئے تھے۔" نیلامی میں فروخت ہونے والی زمین اکثر عملہ اور تحصیلداروں کے ذریعے خریدی جاتی تھی، جنہوں نے اپنی مقامی جانکاری اور علاقے میں کچھ بہترین جائیدادیں خریدنے کے لیے اپنی طاقت کا استعمال کیا۔ بنارس کے علاقے میں انیسویں صدی کے وسط تک زمین کے مالک بدل چکے تھے۔ وہ "سرکاری ملازمین، ان کی اولادوں، تاجروں اور مہاجنوں" کے قبضے میں چلی گئی۔ ان لوگوں نے "زمینداروں کا ایک نیا طبقہ" تشکیل دیا، جو دیہی برادری سے باہر تھے اور زمین کے بارے میں مختلف رویہ رکھتے تھے۔ تاہم اس صورت حال سے ایک خوف پیدا ہوا کہ زمین غیر کسان طبقوں کے ہاتھ میں جارہی ہے۔

چنانچہ تعلقہ داروں سے انگریزوں کی ترجیح اب "بنیادی زمینداروں" اور گاؤں کی برادریوں کی جانب منتقل ہو گئی۔ میکنزی کی تجاویز (Mackenzie's Recommendations) کو 1822 کے ضابطہ نمبر VII میں شامل کیا گیا تھا، جس میں آمدنی کے جائزے کے لیے ایک تفصیلی کھیت در کھیت سروے فراہم کیا گیا تھا۔ بندوبست، دیہی برادری کے ساتھ کیا جانا تھا یا جہاں ممکن ہو کسی تعلقہ دار کے ساتھ۔

مالکان کے حقوق کے علاوہ، رہائشی کاشتکاروں کی طرف سے ادا کیے جانے والے لگان کا بھی پتہ لگانا اور ریکارڈ کرنا تھا۔ اس طرح تعلقہ داروں کا مکمل خاتمہ نہیں ہوا، لیکن جہاں ممکن ہوا زمین پر مشترکہ ملکیتی حق، گاؤں کی برادریوں کو دیا گیا۔ مالگزاری کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کے ساتھ ساتھ کسان مالکان کے حقوق کے تحفظ کے لیے زراعت کی بہتری کو یقینی بنانے کی ضرورت تھی۔ اس کے بجائے "ریکارڈین تھیوری آف رینٹ" (The Ricardian Theory of Rent) کے اثر و رسوخ نے محل واری بندوبست کے قیام کی ترغیب دی۔

رابرٹ مرٹنس برڈ (Robert Merttins Bird, 1853-1788) نے ایک بہتر اور نظر ثانی شدہ محل واری نظام پیش کیا، جس میں ایک پورے محل یا مالیاتی اکائی کی مالگزاری کا تخمینہ لگانے کے لیے تفصیلی سروے کیا جاتا تھا، جو کھیت کی ممکنہ پیداوار کی نقد قدر پر مبنی تھا۔ اس طرح طے شدہ کل مالگزاری کو مشترکہ ملکیت کے ممبران میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ ریاست کو زمین کی خالص آمدنی کا دو تہائی حصہ دینا تھا اور بندوبست تیس سال کے لیے کیا جاتا تھا۔ یہ دیہی طبقوں کے لیے ایک اچھا موقع تھا، جو کہ زیادہ محصول کی طلب، بڑھتے ہوئے قرضوں کے بوجھ، پچھلے محصول کے بقایا جات اور اس کے نتیجے میں ان کی جائیدادوں کی فروخت اور شہری عدالتوں کے احکام کے ذریعے ملکیت کی محرومی کی وجہ سے برباد ہو گئے تھے۔ بہت سے معاملات میں زمین ساہوکاروں اور سوداگروں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ 1857 کی بغاوت میں شمالی ہندوستان کے دیہی سماج کی شکایات کا اظہار کہیں زیادہ زور و شور اور پر تشدد طریقے سے ہوا۔

7.4 صنعت: روایتی صنعتوں کا زوال (The Industry: Decline of Traditional Industries)

برطانوی راج کا ہندوستان کی صنعتی ساخت پر سب سے گہرا اور تباہ کن اثر پڑا۔ انگریزوں کی آمد سے قبل ہندوستان نہ صرف ایک زرعی ملک تھا بلکہ صنعتی پیداوار، خاص طور پر کپڑے اور دستکاری میں دنیا بھر میں شہرت رکھتا تھا۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں ہندوستان دنیا کا ایک اہم صنعتی مرکز تھا۔ یہاں کی بنی ہوئی مصنوعات، خصوصاً سوتی اور ریشمی کپڑا (جیسے ڈھاکہ کی ململ اور کالی کٹ کی کیلیکو) کی یورپ، ایشیا اور افریقہ کی منڈیوں میں بہت زیادہ مانگ تھی۔ ہندوستانی کاریگر اپنے ہنر میں بے مثال تھے۔ کپڑے کے علاوہ، ہندوستان جہاز سازی، لوہے، اور دھاتوں کے کام میں بھی ترقی یافتہ تھا۔ بقول انگریز مصنفین، ہندوستان کی صنعتی برتری کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسے ختم کرنے میں برطانوی حکومت کو طویل عرصہ لگا۔ اس صنعتی خوش حالی کی وجہ سے ہی ہندوستان کو "سونے کی چڑیا" کہا جاتا تھا اور یہی چیز یورپی تاجروں کو اس خطے کی طرف کھینچ لائی تھی۔ لیکن برطانوی پالیسیوں نے اس روایتی صنعتی ڈھانچے کو منظم طریقے سے تباہ کر دیا اور ہندوستان کو برطانیہ کی ابھرتی ہوئی صنعتوں کے لیے محض ایک خام مال فراہم کرنے والے اور تیار شدہ مال کی منڈی میں تبدیل کر دیا۔

7.4.1 زوالِ صنعت اور روایتی صنعتوں کی تباہی
(De-industrialization and Destruction of Local Industries)

برطانیہ میں اٹھارہویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں صنعتی انقلاب برپا ہوا۔ برطانیہ کی نئی فیکٹریوں کو دو چیزوں کی اشد ضرورت تھی: خام مال (خصوصاً کپاس) اور اپنی تیار شدہ مصنوعات کو فروخت کرنے کے لیے ایک بڑی منڈی۔ ہندوستان ان دونوں ضروریات کو پورا کر سکتا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے برطانوی حکومت نے جو پالیسیاں اپنائیں، ان کے مجموعی عمل کو زوال صعنت کہا

جاتا ہے۔ اس پالیسی کے نتیجے میں ہندوستان کی عالمی شہرت یافتہ کپڑے کی صنعت تباہ ہو گئی۔ برطانیہ کی مشینوں سے بنا ہوا سستا کپڑا ہندوستانی بازاروں میں بھر گیا، جس کا مقابلہ ہاتھ سے بنے ہوئے ہندوستانی کپڑے نہیں کر سکے۔ لاکھوں جولاہے، کاتنے والے اور دیگر کاریگر بے روزگار ہو گئے۔ ڈھاکہ، مرشد آباد اور سورت جیسے بڑے صنعتی مراکز، جو کبھی اپنی خوش حالی کے لیے مشہور تھے، ویران ہو گئے۔ بے روزگار ہونے والے یہ لاکھوں کاریگر اور دستکار شہروں کو چھوڑ کر دیہاتوں کی طرف چلے گئے اور زراعت پر بوجھ بن گئے، جس سے زراعت کے شعبے پر دباؤ مزید بڑھ گیا۔ یہ صرف کپڑے کی صنعت تک محدود نہیں تھا، بلکہ لوہے، کاغذ، شیشے اور جہاز سازی جیسی دیگر صنعتیں بھی زوال کا شکار ہوئیں۔

7.4.2 ہندوستان میں برطانوی نو آبادیات کے مراحل (Stages of British Colonialism in India)

کارل مارکس نے ہندوستان میں نو آبادیاتی لوٹ پاٹ کو اجاگر کرتے ہوئے اسے تین مرحلوں میں تقسیم کیا گیا ہے: تجارتی تحفظات پر منحصر سرمایہ داری کا مرحلہ (1757 سے 1813 تک)، آزاد تجارت پر مبنی صنعتی سرمایہ داری کا مرحلہ (1813 سے 1857 تک)، مالیاتی سامراجیت کا مرحلہ (1858 سے 1947 تک)

1. تجارتی سرمایہ داری کا مرحلہ (Stage of Mercantile Capitalism)

ہندوستان میں نو آبادیات کا پہلا مرحلہ دراصل تجارتی سرمایہ داری کا دور تھا، جس میں یورپی طاقتیں خاص طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی محض تاجر اور سوداگر کے روپ میں برصغیر میں داخل ہوئیں۔ ان کا بنیادی مقصد شروع میں منافع بخش تجارت تک محدود تھا، جس کے لیے انہوں نے ساحلی شہروں میں فیکٹریاں، گودام اور تجارتی مراکز قائم کیے اور مقامی حکمرانوں سے مراعات حاصل کیں۔ اس مرحلے میں ہندوستان یورپی منڈیوں کے لیے خام مال اور قیمتی مصنوعات جیسے کپڑا، مصالحہ جات، ریشم، نیلا اور افیون فراہم کرنے والا خطہ بن گیا، جبکہ بدلے میں محدود اور اکثر غیر معیاری تیار شدہ مصنوعات درآمد کی جاتی تھیں۔ اگرچہ اس دور میں براہ راست سیاسی قبضہ ابھی مکمل طور پر قائم نہیں ہوا تھا، لیکن تجارتی مفادات کے تحفظ کے لیے کمپنی نے مقامی سیاست میں مداخلت شروع کر دی، فوجی چھاؤنیاں قائم کیں اور تجارتی معاہدوں کو دباؤ یا رشوت کے ذریعے نافذ کیا۔ یوں تجارت کے نام پر قائم ہونے والا یہ تعلق آہستہ آہستہ معاشی استحصال اور سیاسی بالادستی کی سمت بڑھتا گیا، جو آگے چل کر نو آبادیاتی اقتدار کے اگلے مراحل—علاقائی قبضے اور صنعتی سرمایہ داری—کی بنیاد بن گیا۔

2. صنعتی سرمایہ داری کا مرحلہ (Stage of Industrial Capitalism)

یہ مرحلہ 1813 کے منشور (ایکٹ) کے ذریعے ہندوستان کے ساتھ تجارت پر کمپنی کی اجارہ داری کے خاتمے کے ساتھ شروع ہوا۔ 1813ء کے منشور (ایکٹ) سے پہلے ہندوستان کی تجارت پر کمپنی کی اجارہ داری تھی۔ کمپنی کے علاوہ یورپ کا کوئی اور تاجر ہندوستان کے ساتھ کاروبار نہیں کر سکتا تھا۔ اس اجارہ داری کو قائم کرنے کے لیے کمپنی نے فرانسیسیوں، پرتگالیوں اور ولندیزیوں کو شکست دی اور انہیں ہندوستان سے نکال دیا گیا اور جو باقی رہ گئے وہ انتہائی محدود علاقوں میں رہنے پر مجبور ہو گئے۔ برطانوی پارلیمنٹ میں 1813ء کے منشور (ایکٹ) کے ذریعے ایک قانون پاس کیا گیا۔ اسے 1813ء کا منشور (ایکٹ) کہا جاتا ہے۔ منشور (ایکٹ) ہر 20 سال کے وقفے سے جاری کیا

جاتا تھا۔ اس سے پہلے 1793ء کا منشور (ایکٹ) تھا۔ منشوروں کو پاس کرنے کا مقصد برطانوی حکومت کی طرف سے علیحدہ قانون سازی کے ذریعے کمپنی پر اپنا کنٹرول قائم کرنا تھا۔ 1813ء میں منظور کیے گئے منشور (ایکٹ) کے ذریعے برطانوی پارلیمنٹ کے ذریعے کمپنی کی اجارہ داری ختم کر دی گئی۔ 1813ء میں منظور ہونے والے منشور (ایکٹ) کے مطابق اب کمپنی کی یہ اجارہ داری صرف دو شعبوں تک محدود تھی جو درج ذیل ہیں۔

1. چائے کی تجارت پر
2. چین کے ساتھ تجارت پر

برطانیہ میں صنعتی کارخانوں میں بڑے پیمانے پر پیداوار شروع ہوئی۔ وسائل کی تکنیکی دریافتوں کی وجہ سے بڑے پیمانے پر پیداوار کی وجہ سے اب برطانوی کمپنیوں کے سامنے دو طرح کے مسائل پیدا ہو رہے تھے۔ (1) تیار کردہ سامان کو کس طرح استعمال کیا جائے۔ (2) پیداوار میں اضافے کی وجہ سے خام مال کی سپلائی کو کیسے بڑھایا جائے۔ مندرجہ بالا وجوہات کی بنا پر 1813 کے منشور (ایکٹ) کے ذریعے ہندوستان کی تجارت پر کمپنی کی اجارہ داری کو سب سے پہلے ختم کر دیا گیا اور ہندوستانی منڈیاں تمام تاجروں کے لیے کھول دی گئیں۔ اس طرح ہندوستان کو برطانوی کارخانوں میں تیار ہونے والی اشیا کی بازار کے لیے تیار کیا گیا۔ ہندوستان کو برطانوی صنعتوں کے لیے خام مال کی فراہمی کا ذریعہ بھی بنایا گیا تھا۔ 1813 میں، ہندوستانی بازار برطانوی فیکٹریوں میں تیار ہونے والے سستے کپڑوں سے بھر گیا، کارخانوں میں بنی چیزیں موثر اور سستی تھیں۔ ہندوستان میں ہاتھ سے بنے کپڑے برطانوی کپڑوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس طرح ہندوستانی کپڑے اور دستکاری کی صنعتوں کو بڑا دھچکا لگا اور ہندوستان میں بے روزگاری بڑھنے لگی۔ یہ بڑھتی ہوئی بے روزگاری 1857ء کے انقلاب کا پس منظر بن گئی۔ 1813 کے ہندوستان میں غذائی اجناس کی پیداوار کی حوصلہ شکنی کی گئی کیونکہ اگر اناج پیدا ہوگا تو کارخانوں کے لیے خام مال کیسے پیدا ہوگا؟ کارخانوں اور نقد فصلوں کے لیے خام مال کی فراہمی کے لیے ان اناج کی پیداوار کی حوصلہ شکنی کی گئی جو کھیتوں میں اگائی جاتی تھی۔ اور کپاس، انڈگو، چائے، ربڑ وغیرہ کی پیداوار کو فروغ دیا گیا۔ ہندوستان میں ان نقد فصلوں کی پیداوار کی وجہ سے غذائی اجناس کی پیداوار گرنے لگی، غذائی اجناس کی پیداوار میں کمی کے باعث ہندوستان کی منڈیوں میں غذائی اجناس کی قیمتیں بڑھنے لگیں، اس کے ساتھ ہی ہندوستان میں غذائی قلت بھی بڑھ گئی۔ ہندوستان میں خام مال کی پیداوار میں اضافہ ہوا، اس کے ساتھ ساتھ سوتی کپڑوں کی درآمد میں بھی اضافہ ہوا، ہندوستان میں خام مال کی برآمد میں اضافے کے ساتھ ہندوستان میں غیر ملکی کپڑوں کی درآمد میں بھی اضافہ ہوا۔ ہندوستانی باغانوں سے تیار ہونے والا خام مال بندرگاہوں پر بھیجا جاتا تھا اور بندرگاہوں کے ذریعے یہ خام مال لوڈ کرکے برطانیہ بھیجا جاتا تھا، اب ہندوستان میں پیدا ہونے والے خام مال کو تیزی سے بندرگاہوں تک بھیجنے کے لیے نقل و حمل کے ذرائع تیار کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی جس کی وجہ سے ہندوستان میں 1853 میں ریلوے کی ترقی شروع کی گئی تاکہ ہندوستانی باغانوں سے خام مال کو برطانیہ کی اندرونی منڈیوں تک پہنچایا جا سکے۔ ہندوستان میں ریلوے کی ترقی کے بنیادی طور پر تین مقاصد تھے۔

1. ہندوستان سے بندرگاہوں تک خام مال کی نقل و حمل۔

2. انگلینڈ کے تیار کردہ سامان کو بندرگاہوں سے ہندوستان کی اندرونی منڈیوں تک پہنچانا۔
3. کسی بھی بغاوت کی صورت میں ملک کے کسی بھی حصے میں فوج کی تیز رفتار نقل و حرکت۔

3. مالیاتی سرمایہ داری کا مرحلہ (Stage of Finance Capitalism)

برطانیہ میں صنعتی پیداوار کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ کمپنی کی جانب سے ہندوستانی منڈیوں کے استحصال سے برطانیہ میں بہت بڑا سرمایہ جمع ہو گیا۔ محنت کش طبقہ اپنے فائدے کے لیے منظم ہو گیا، رفتہ رفتہ برطانوی سرمایہ دار طبقہ خوف زدہ ہونے لگا، چنانچہ صنعت کاروں نے سوچا کہ برطانوی سرمایہ کو برطانیہ میں لگانا سود مند نہیں، اس لیے اب انہوں نے برطانوی سرمائے کو ہندوستان میں لگانے کا منصوبہ بنایا۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت کو ریلوے کی ترقی کے لیے سرمائے کی ضرورت تھی، اس لیے برطانوی سرمایہ داروں نے عوامی قرضوں کے ذریعے ہندوستان کو سرمایہ دیا۔ اس عوامی قرض پر نہ صرف سود ادا کرنا تھا بلکہ حکومت ہند کو ریلوے کے منافع کا حصہ بھی دینا تھا۔ سال 1939 تک حکومت ہند پر عوامی قرضوں کا بوجھ 88 ملین پاؤنڈ تک پہنچ چکا تھا۔ برطانوی سرمائے کی سب سے بڑی سرمایہ کاری ہندوستان میں ریلوے کی ترقی میں کی گئی۔ ہندوستان میں ریلوے کے بعد برطانوی سرمائے کی دوسری بڑی سرمایہ کاری، چائے، کافی، ربڑ اور نیل کی پیداوار میں کی گئی، یہی وجہ تھی کہ مالیاتی سرمایہ داری کے دور میں ہندوستان میں ربڑ، چائے، کافی اور نیل کے بڑے بڑے باغات لگائے گئے۔

7.4.3 جدید صنعتوں کا ارتقا (Evolution of Modern Industries)

برطانوی دور میں ہندوستان میں کچھ جدید صنعتوں کا قیام بھی عمل میں آیا، لیکن ان کی ترقی کا عمل بہت سست، محدود اور غیر متوازن تھا، اور اس کی نوعیت بھی نوآبادیاتی مفادات کے تابع تھی۔

ریلوے کا قیام: برطانوی راج کا ایک بڑا کارنامہ ہندوستان میں ریلوے کے وسیع نیٹ ورک کی تعمیر کو سمجھا جاتا ہے۔ 1853ء میں پہلی ٹرین چلائی گئی اور بیسویں صدی کے آغاز تک ہندوستان میں ایک وسیع ریلوے نظام قائم ہو چکا تھا۔ تاہم، ریلوے کی تعمیر کے پیچھے بنیادی مقاصد ہندوستانی عوام کی فلاح و بہبود نہیں تھے، بلکہ کچھ اس طرح تھے۔ اول، ملک کے اندرونی حصوں سے خام مال (جیسے کپاس، پٹ سن، اناج) کو بندرگاہوں تک تیزی سے پہنچانا تاکہ اسے برطانیہ بھیجا جا سکے۔ دوم، برطانیہ سے درآمد شدہ تیار مال کو ملک کے کونے کونے میں واقع منڈیوں تک پہنچایا جا سکے۔ سوم، فوج اور فوجی ساز و سامان کی تیز رفتار نقل و حرکت کو یقینی بنانا تاکہ ملک کے کسی بھی حصے میں اٹھنے والی بغاوت کو آسانی سے کچلا جا سکے۔ مزید بر آں، ریلوے کی تعمیر پر اٹھنے والے تمام اخراجات ہندوستانی خزانے سے ادا کیے گئے، لیکن اس سے حاصل ہونے والا تمام منافع برطانوی سرمایہ کاروں کی جیبوں میں جاتا تھا۔ اس کے علاوہ، ریلوے کے لیے تمام مشینری، انجن اور یہاں تک کہ کوئلہ بھی ابتدائی طور پر برطانیہ سے درآمد کیا جاتا تھا، جس سے ہندوستان میں بھاری صنعت کی ترقی کی حوصلہ شکنی ہوئی۔

جدید فیکٹریوں کا قیام: انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں ہندوستان میں کچھ جدید صنعتیں قائم ہوئیں، جیسے کپاس اور پٹ سن کی ملیں، کوئلے کی کانیں اور بعد میں لوہے اور اسٹیل کے کارخانے۔ تاہم، ان صنعتوں کی ترقی میں کئی رکاوٹیں تھیں۔ زیادہ تر صنعتیں، خاص طور پر پٹ سن، چائے کے باغات اور کان کنی، برطانوی سرمائے سے لگائی گئی تھیں اور ان کا منافع بھی برطانیہ منتقل ہو جاتا تھا۔ ہندوستانی صنعتکاروں،

جیسے جمشید جی ٹاٹا، کو فیکٹریاں لگانے میں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ انہیں بینکوں سے قرض ملنا مشکل تھا، اور حکومت کی پالیسیاں ہمیشہ برطانوی صنعتکاروں کے حق میں ہوتی تھیں۔ برطانوی حکومت نے ہندوستان میں مشینری بنانے والی، کیمیکل اور دیگر بھاری صنعتوں کے قیام کی حوصلہ افزائی نہیں کی، کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ہندوستان صنعتی طور پر خود کفیل ہو اور برطانیہ کا مقابلہ کرے۔ تاہم تمام تر رکاوٹوں کے باوجود، ہندوستان میں جدید صنعتی ترقی کا آغاز بمبئی (1854) میں پہلی سورت کپڑا مل کے قیام سے ہوا۔ اس فیکٹری کے قیام میں ہندوستانی سرمایہ اور ہندوستانی انتظام اہم عوامل تھے۔ جوٹ صنعت کا آغاز 1855 میں کولکتہ کے قریب وادی ہگلی میں ایک جوٹ مل کے قیام سے ہوا، جس میں سرمایہ اور انتظامی کنٹرول دونوں غیر ملکی تھے۔ کوئلے کی کان کنی کی صنعت سب سے پہلے 1772 میں رانی گنج (مغربی بنگال) میں شروع ہوئی۔ ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل پلانٹ 1907 میں جمشید پور (ریاست جھارکھنڈ) میں قائم کیا گیا تھا۔ اس کے بعد سیمنٹ، شیشہ، صابن، کیمیکل، جوٹ، چینی اور کاغذ وغیرہ جیسے کئی درمیانی اور چھوٹی صنعتی اکائیاں قائم ہوئیں۔ آزادی سے پہلے کی صنعتی پیداوار نہ تو کافی تھی اور نہ ہی متنوع۔ آزادی کے وقت، ہندوستان کی معیشت پسماندہ تھی، ہندوستان کی جی ڈی پی میں زراعت کا حصہ 60 فیصد سے زیادہ تھا اور ملک کی برآمدات کی زیادہ تر آمدنی زراعت سے آتی تھی۔

7.5 برطانوی حکومت کے معاشی اثرات: ایک بحث

(The Economic Impact of British Rule: A Debate)

برطانوی راج کے معاشی ورثے کا سوال تاریخ کا ایک پیچیدہ اور متنازع موضوع ہے۔ اس حوالے سے دو بنیادی اور مخالف نظریات پائے جاتے ہیں، جن کی قیادت قوم پرست اور نظر ثانی پسند مورخین کرتے ہیں۔ ان دونوں مکاتب فکر کا تفصیلی جائزہ ذیل میں پیش کیا گیا ہے۔

قوم پرست اور مارکسی نظریہ: قوم پرست اور مارکسسٹ مورخین کا مکتبہ فکر، جس کے بانیوں میں دادابھائی نوروجی، رومیش چندر دت، اور بعد میں آر-پی-دت جیسے نام شامل ہیں، اس بات پر متفق ہیں کہ برطانوی راج ہندوستان کے لیے ایک معاشی تباہی تھی۔ ان کا بنیادی موقف یہ ہے کہ برطانوی پالیسیاں ہندوستان کی فلاح و بہبود کے لیے نہیں، بلکہ برطانیہ کے صنعتی اور معاشی مفادات کو پورا کرنے کے لیے بنائی گئی تھیں۔ اس نظریے کے دو اہم ستون ہیں: دولت کی نکاسی (Drain of Wealth) کا نظریہ اور نظریہ زوالِ صنعت (De-industrialization) کا نظریہ۔

دادابھائی نوروجی نے اپنے مشہور "دولت کی نکاسی کے نظریے" میں یہ ثابت کیا کہ برطانیہ منظم طریقے سے ہندوستان کی دولت کو انگلستان منتقل کر رہا تھا۔ یہ منتقلی براہِ راست لوٹ مار کی شکل میں نہیں، بلکہ "قانونی" طریقوں سے ہو رہی تھی، جیسے کہ برطانوی افسران کی بھاری تنخواہیں اور پنشن، ہندوستان میں برطانوی فوج رکھنے کے اخراجات، اور برطانوی سرمایہ کاری پر بے تحاشا منافع، جو سب ہندوستانی ٹیکس دہندگان کے پیسوں سے ادا کیا جاتا تھا۔ یہ دولت کا یک طرفہ بہاؤ تھا جس کے بدلے ہندوستان کو کوئی معاشی فائدہ نہیں پہنچ رہا تھا اور جس نے ملک کو اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا۔

رمیش چندر دت نے اپنی کتاب The Economic History of India میں اعداد و شمار کے ذریعے یہ واضح کیا کہ کس طرح برطانوی دور میں زراعت پر ٹیکسوں کا بوجھ بڑھایا گیا اور روایتی صنعتوں کو تباہ کیا گیا، جس سے قحط اور غربت میں اضافہ ہوا۔ اسے "نظریہ زوالِ صنعت" کہتے ہیں۔ یہ نظریہ یہ بیان کرتا ہے کہ برطانیہ کی تجارتی پالیسیوں نے ہندوستان کی صدیوں پرانی اور عالمی شہرت یافتہ کپڑے کی صنعت کو جان بوجھ کر تباہ کیا۔ انگریزوں نے برطانوی مشینوں سے بنے سستے کپڑے کو ہندوستان کی منڈیوں میں فروغ دیا جبکہ ہندوستانی مصنوعات پر بھاری محصولات (ٹیرف) عائد کیے، جس کی وجہ سے ہندوستان جو کبھی دنیا کو تیار مال برآمد کرتا تھا، اب صرف خام مال (جیسے کپاس) برآمد کرنے اور برطانیہ سے تیار شدہ مصنوعات درآمد کرنے والا ملک بن کر رہ گیا۔ اس عمل نے لاکھوں کاریگروں اور دستکاروں کو بے روزگار کرکے زراعت پر انحصار کرنے پر مجبور کر دیا، جس سے زمین پر آبادی کا دباؤ بڑھا اور غربت میں مزید اضافہ ہوا۔

نظر ثانی پسند نظریہ: دوسری طرف، نیل فرگوسن (Niall Ferguson) جیسے کچھ مغربی اور نظر ثانی پسند (Revisionist) مورخین ایک مختلف تصویر پیش کرتے ہیں۔ ان کا موقف ہے کہ قوم پرست مورخین برطانوی راج کے منفی اثرات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں اور اس کے مثبت پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان کے مطابق، انگریزوں نے ہندوستان کو سیاسی اور انتظامی طور پر متحد کیا، جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے جدید انفراسٹرکچر، خاص طور پر ریلوے، ٹیلی گراف، اور نہری نظام متعارف کرایا، جس نے معیشت کو جدید بنانے کی بنیاد رکھی۔ وہ یہ بھی دلیل دیتے ہیں کہ قانون کی حکمرانی (Rule of Law) اور نجی ملکیت (Private Property) جیسے مغربی تصورات کے نفاذ نے ہندوستان میں سرمایہ دارانہ ترقی کی راہیں کھولیں۔ ان مورخین کا ماننا ہے کہ ہندوستان کی پسماندگی کی وجوہات نوآبادیاتی پالیسیوں میں نہیں، بلکہ اس کے اپنے سماجی اور ثقافتی ڈھانچے، جیسے کہ ذات پات کا نظام اور کاروباری طبقے کی کمی، میں پوشیدہ تھیں۔ ان کے نزدیک، برطانوی راج کے خاتمے کے وقت ہندوستان کی غربت کی وجہ انگریزوں کا استحصال نہیں، بلکہ ہندوستان کا اپنی اندرونی کمزوریوں سے نہ نکل پانا تھا۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ برطانوی حکومت کا مقصد ہندوستان کی ترقی نہیں تھا، لیکن ان کے اقدامات کے غیر ارادی طور پر کچھ مثبت نتائج ضرور نکلے۔

اگرچہ نظر ثانی پسند مورخین کے دلائل میں کچھ سچائی ہو سکتی ہے، لیکن تاریخی شواہد اور معاشی اعداد و شمار زیادہ تر قوم پرست نظریے کی تائید کرتے ہیں۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ 18ویں صدی کے آغاز میں جب برطانیہ کی طاقت بڑھنا شروع ہوئی، عالمی معیشت میں ہندوستان کا حصہ تقریباً 24 فیصد تھا، جو 1947 میں برطانوی راج کے خاتمے پر کم ہو کر محض 4 فیصد رہ گیا تھا۔ یہ ڈرامائی گراوٹ محض ایک اتفاق نہیں ہو سکتی۔ بلاشبہ ریلوے اور دیگر انفراسٹرکچر تعمیر ہوئے، لیکن ان کا بنیادی مقصد ہندوستانی عوام کی سہولت نہیں بلکہ بندرگاہوں تک خام مال پہنچانا اور ملک کے کونے کونے تک فوج کی رسائی کو یقینی بنانا تھا۔ قانون کی حکمرانی بھی ہندوستانیوں اور انگریزوں کے لیے یکساں نہیں تھی۔ خلاصہ یہ کہ برطانوی راج نے ہندوستان کو جدیدیت کے کچھ اوزار ضرور دیے، لیکن ان کا استعمال ہندوستان کو ترقی دینے کے بجائے اس کے وسائل کو نچوڑنے کے لیے کیا گیا۔ اس منظم معاشی استحصال کا ورثہ آج بھی جنوبی ایشیا کی غربت اور معاشی مسائل کی صورت میں زندہ ہے۔

برطانوی دور کی زراعت، زمینی محصول اور صنعتی پالیسیوں کا مجموعی جائزہ لینے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کا ہندوستان کی معیشت پر اثر گہرا، وسیع اور زیادہ تر تباہ کن تھا۔ یہ پالیسیاں ہندوستان کی فلاح و بہبود کے لیے نہیں، بلکہ برطانوی سلطنت کے معاشی اور سیاسی مفادات کو پورا کرنے کے لیے بنائی گئی تھیں۔ برطانوی راج کے اختتام پر، 1947 میں، ہندوستان کی معیشت کی جو تصویر ابھرتی ہے، وہ اس کی ماضی کی شان و شوکت کے بالکل برعکس تھی۔ عالمی معیشت میں ہندوستان کا حصہ، جو 18ویں صدی میں تقریباً 25 فیصد تھا، کم ہو کر محض 4-3 فیصد رہ گیا تھا۔ ملک شدید غربت، پسماندگی اور معاشی جمود کا شکار تھا۔ برطانوی پالیسیوں نے کروڑوں ہندوستانیوں کو خط غربت سے نیچے دھکیل دیا۔ زراعت کی تباہی، صنعتوں کے زوال اور دولت کے نکاس نے عوام کی معاشی حالت کو بد سے بدتر بنا دیا۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں بار بار آنے والے قحط، جن میں ایک اندازے کے مطابق کروڑوں لوگ ہلاک ہوئے، اسی معاشی استحصال کا بھیانک نتیجہ تھے۔ امرتیہ سین جیسے نوبل انعام یافتہ ماہرِ معاشیات کا کہنا ہے کہ یہ قحط خوراک کی کمی کی وجہ سے نہیں، بلکہ برطانوی حکومت کی ناقص تقسیم اور بے حسی پر مبنی پالیسیوں کی وجہ سے آئے تھے۔ ہندوستان جو کبھی صنعتی اور تجارتی مرکز تھا، ایک پسماندہ زرعی معیشت بن کر رہ گیا، جہاں کی زیادہ تر آبادی کا انحصار زراعت پر تھا، اور وہ بھی ایک ایسی زراعت جو خود بحران کا شکار تھی۔ جدید صنعت، بینکاری اور تکنیکی ترقی کے شعبوں میں ہندوستان باقی دنیا سے بہت پیچھے رہ گیا۔ جب انگریز ہندوستان سے رخصت ہوئے، تو یہاں شرح خواندگی صرف 16 فیصد، اور اوسط عمر محض 27 سال تھی۔

7.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

برطانوی ہندوستان میں زراعت، زمینی محصول اور صنعت کے شعبوں کا تنقیدی جائزہ اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ برطانوی راج کا معاشی ایجنڈا بنیادی طور پر استحصالی نوعیت کا تھا۔ اس کا مقصد ہندوستان کے وسائل کو برطانیہ کے صنعتی اور سامراجی مفادات کے لیے استعمال کرنا تھا۔ اس عمل میں، ہندوستان کی صدیوں پرانی اور خود کفیل معیشت کو منظم طریقے سے تباہ کر دیا گیا اور اسے عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے ایک غیر مساوی حصے کے طور پر ضم کر دیا گیا۔ زراعت کے شعبے میں، تجارت کاری کی پالیسی نے کسانوں کو غذائی فصلوں کی بجائے نقدی فصلیں اگانے پر مجبور کیا، جس سے غذائی قلت، قحط اور دیہی قرضوں میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ زمینی محصول کے نظام، چاہے وہ استمراری بندوبست ہو، رعیت واڑی ہو یا محلواری، سب کا مقصد کسانوں سے زیادہ سے زیادہ محصول نچوڑنا تھا۔ ان نظاموں نے کسانوں کو ان کی زمینوں سے محروم کیا اور انہیں غربت کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دیا۔ صنعت کے میدان میں، یک طرفہ آزاد تجارت کی پالیسی نے ہندوستان کی عالمی شہرت یافتہ دستکاریوں، خاص طور پر ٹیکسٹائل کی صنعت، کو برباد کر دیا اور لاکھوں کاریگروں کو بے روزگار کر دیا۔ جدید صنعت کی ترقی کو جان بوجھ کر محدود اور برطانوی مفادات کے تابع رکھا گیا، جس سے ہندوستان ایک صنعتی طاقت بننے کی بجائے محض خام مال فراہم کرنے والا ملک بن کر رہ گیا۔ دادا بھائی نوروجی کی "ڈرین تھیوری" اس تمام استحصال کا نچوڑ پیش کرتی ہے، جس کے مطابق ہندوستان کی دولت کو منظم طریقے سے برطانیہ منتقل کیا گیا، جس نے ہندوستان کو غریب اور برطانیہ کو امیر بنایا۔ اگرچہ انگریزوں نے ریلوے اور نہروں جیسا انفراسٹرکچر تعمیر کیا، لیکن اس کا بنیادی مقصد بھی ہندوستان کے وسائل کے استحصال کو مزید موثر بنانا تھا۔ برطانوی راج کا معاشی ورثہ ایک گہری اور وسیع

غربت، ایک تباہ حال زرعی شعبہ، اور ایک کمزور صنعتی بنیاد تھی۔ 1947 میں جب ہندوستان اور پاکستان آزاد ہوئے تو انہیں یہی ورثہ ملا۔ ان ممالک کو اپنی معیشتوں کی تعمیر نو کے لیے صفر سے آغاز کرنا پڑا۔ برطانوی نو آبادیاتی پالیسیوں کے طویل مدتی اثرات آج بھی جنوبی ایشیا کے معاشی اور سماجی مسائل میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ لہٰذا، برطانوی دور کو محض ایک سیاسی تبدیلی کے طور پر نہیں، بلکہ ایک گہرے معاشی استحصال کے دور کے طور پر یاد رکھنا ضروری ہے جس نے برصغیر کی تقدیر پر انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

7.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

7.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. استمراری بندوبست کس گورنر جنرل نے متعارف کرایا؟

(a) ویلزلی　(b) کلائیو

(c) کارنوالس　(d) منرو

2. رعیت واری بندوبست سب سے پہلے کہاں رائج ہوا؟

(a) بنگال　(b) مدراس

(c) بمبئی　(d) پنجاب

3. محل واری بندوبست کا بنیادی مرکز کون سا علاقہ تھا؟

(a) بنگال　(b) پنجاب اور شمالی ہندوستان

(c) بہار　(d) مدراس

4. نیل کی بغاوت کس سال میں ہوئی؟

(a) 1847　(b) 1859

(c) 1875　(d) 1885

5. برطانوی دور میں سب سے زیادہ کاشت کی جانے والی نقدی فصل کون سی تھی؟

(a) گندم　(b) کپاس

(c) جوار　(d) گیہوں

6. ”دولت کی نکاسی“ کا نظریہ کس نے پیش کیا؟

(a) بپن چندرہ　(b) دادابھائی نوروجی

(c) آر۔پی۔دت　(d) ایرک ہابس بام

7. ”زوالِ صنعت“ کا مطلب ہے:

(a) صنعتوں کی ترقی
(b) صنعتوں کی تباہی
(c) زراعت میں اضافہ
(d) تجارت میں ترقی

8. پہلی ہندوستانی ریلوے کب شروع ہوئی؟

(a) 1833
(b) 1853
(c) 1875
(d) 1907

9. ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل پلانٹ کب قائم ہوا؟

(a) 1854
(b) 1870
(c) 1907
(d) 1920

10. انگریزوں کے زیر اثر ہندوستان کو کس شکل میں استعمال کیا گیا؟

(a) خام مال فراہم کرنے والا ملک
(b) خود کفیل صنعتی ملک
(c) تجارتی طور پر آزاد ملک
(d) زرعی اجناس درآمد کرنے والا ملک

جوابات	1	2	3	4	5	6	7	8	9	10
	c	b	b	b	b	b	b	b	c	a

7.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. زراعت کی تجارت کاری سے مراد کیا ہے اور اس کے اثرات کیا تھے؟
2. استمراری بندوبست کے فوائد اور نقصانات مختصراً بیان کریں۔
3. رعیت واری بندوبست میں کسانوں کی حیثیت کیا تھی؟
4. زوالِ صنعت سے مقامی دستکار طبقے پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟
5. "دولت کی نکاسی" کے نظریے کی وضاحت کریں۔

7.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. برطانوی دور میں زرعی پالیسیوں کا تفصیلی جائزہ لیں اور ان کے سماجی و معاشی اثرات پر بحث کریں۔
2. استمراری، رعیت واری اور محل واری بندوبست کے نظاموں کا تقابلی مطالعہ کریں۔
3. برطانوی دور میں روایتی صنعتوں کے زوال اور جدید صنعتوں کے ارتقا پر تفصیلی روشنی ڈالیں۔

اکائی 8: زوال صنعت، دولت کی نکاسی برطانویوں کے تقاضے اور ترجیحات

(De-Industrialization, Drain of Wealth, Requirements and Priorities of the British)

اکائی کے اجزا:

8.0 تمہید(Introduction)

8.1 مقاصد(Objectives)

8.2 ابتدائی یورپی تجارت(Early European Trade)

8.3 ہندوستان میں برطانوی سلطنت کا قیام (Establishment of the British Empire in India)

8.3.1 کمپنی کی حکمرانی(Company Rule, 1757–1858)

8.3.2 تاج برطانیہ کی حکمرانی(Rule by the Crown of Great Britain, 1858–1947)

8.4 صنعتوں اور دستکاری کا زوال(Decline of Industries and Handicrafts)

8.5 کپڑے کی صنعت کا زوال(Decline of the Textile Industry)

8.6 صنعتوں اور دستکاری کے زوال کے نتائج (Consequences of the Decline of Industries and Handicrafts)

8.7 دولت کی نکاسی کا نظریہ(Theory of the Drain of Wealth)

8.8 اکتسابی نتائج(Learning Outcomes)

8.9 نمونہ امتحانی سوالات(Model Examination Questions)

8.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات(Objective Answer Type Questions)

8.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات(Short Answer Type Questions)

8.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات(Long Answer Type Questions)

8.0 تمہید (Introduction)

برطانوی سلطنت کا ہندوستان پر قبضہ محض سیاسی غلامی تک محدود نہیں رہا بلکہ اس تسلط نے معاشی ڈھانچے میں گہرائیوں تک

سرایت کر کے پورے سماجی اور معاشی نظام کو بدل کر رکھ دیا۔ اس تناظر میں خصوصاً تین باتیں نہایت اہمیت کے حامل ہیں: اول، دست کاریوں اور گھریلو صنعتوں کی تباہی یعنی "صنعت کا زوال" (De-Industrialisation)، دوم، ہندوستانی وسائل اور سرمائے کا مسلسل بیرون ملک انخلا جسے "دولت کی نکاسی" (Drain of Wealth) کہا جاتا ہے، سوم، ان سب کے پسِ پشت برطانوی حکومت کی ضروریات وترجیحات جنہوں نے اس استحصالی عمل کو شکل دی۔ برطانوی اقتدار سے قبل ہندوستان نہ صرف زراعت بلکہ دستکاری کے میدان میں بھی ایک خود کفیل اور عالمی منڈیوں میں منفرد شناخت رکھنے والی معیشت تھا، مگر ایک اجنبی حکومت اور مشینی برطانوی صنعتوں کے سامنے اس کی صنعتیں ٹھہر نہ سکیں۔ ممنوعہ قوانین، بھاری محصولات، اور برطانوی مصنوعات کی حد سے زیادہ سرپرستی نے مقامی کاریگروں، جولاہوں اور صنعتکاروں کو فاقہ کشی پر مجبور کر دیا۔ دوسری طرف برطانوی حکام نے ہندوستانی محصولات اور دولت کو اپنی سلطنت کے دیگر حصوں میں فوجی مہمات سے لے کر شاہی اخراجات تک پورا کرنے کے لیے استعمال کیا۔ یعنی ہندوستان اپنی ہی دولت سے اپنی ہی محکومی کا بندوبست کر تا رہا۔ یہ دولت محض تجارتی منافع کے ذریعے نہیں بلکہ غیر متناسب ٹیکس، یک طرفہ تجارتی پالیسیوں، اور خزانے کی براہ راست منتقلی کے ذریعے مسلسل باہر بھیجی گئی۔ اس معاشی نچوڑ کا مقصد ہندوستان کی ترقی نہیں بلکہ برطانوی سلطنت کی بقا اور توسیع تھا۔ اس طرح ہندوستان کی معیشت کو جان بوجھ کر خام مال فراہم کرنے والے اور برطانوی مصنوعات کھپانے والی منڈی میں تبدیل کیا گیا۔ نتیجتاً نہ صرف روایتی صنعتیں ماند پڑ گئیں بلکہ ہندوستان عالمی معیشت میں ایک محتاج اور تابع دار ملک بنا دیا گیا۔ چنانچہ زوال صنعت اور دولت کی نکاسی محض تاریخی اصطلاحات نہیں بلکہ وہ جیتی جاگتی حقیقتیں ہیں جنہوں نے پورے برصغیر کی سماجی ساخت، طبقاتی تقسیم اور معاشی امکانات کو صدیوں کے لیے اپاہج کر دیا اور جنہیں سمجھے بغیر نو آبادیت کے اصل مقصد اور اس کے دیرپا اثرات کو نہیں سمجھا جا سکتا۔

8.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- ابتدائی یورپی رابطے کی آمد اور ان کی تجارت سے متعلق جان سکیں گے۔
- بحر ہند میں ایشیائی آزاد تجارت کی اصل کو سمجھ سکیں گے۔
- ہندوستان کے ساتھ یورپی تجارت اور اس کی نوعیت کو سمجھ سکیں گے۔
- دستکاری پر آزاد تجارت کے اثرات کی وضاحت کر سکیں گے۔
- صنعتی زوال اور دستکاری کے زوال کے اسباب بیان کر سکیں گے۔
- تجارتی ضوابط اور کپڑے پر برآمد درآمد کی حکمت عملی کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- ہندوستان سے دولت کی نکاسی کے نظریے کا جائزہ لے سکیں گے۔

8.2 ابتدائی یورپی تجارت (Early European Trade)

1453 میں ترکوں کا قسطنطنیہ پر قبضہ جنیوا کے لیے ایک بہت بڑا دھچکا تھا کیوں کہ بحیرہ اسود کی بندرگاہیں، جو مشرقی سامان کی فروخت کا ان کا اصل بازار ہوا کرتا تھا، آہستہ آہستہ ان کے لیے بند ہوتا گیا۔ یہ اور اس کے علاوہ وینس کے ساتھ ان کی پرانی دشمنی ہی وہ اہم عوامل تھے، جس کی وجہ سے جنیوا نے پرتگال اور اسپین کی، بحری جہازوں، پیسوں کے ذریعے سمندری راستوں کی تلاش میں مدد فراہم کی۔ جیسا کہ مشہور ہے، کرسٹوفر کولمبس نے 1492 میں امریکہ کو دریافت کیا تھا، جب واسکوڈا گاما کالی کٹ پہنچا تو وہاں کے زمورین یعنی راجا نے اس کا پرجوش استقبال کیا۔ اس نے مصالحوں کی تجارت کرنے، فیکٹری اور مال کا ذخیرہ کرنے کے لیے گودام قائم کرنے کی اجازت مانگی۔ ساحل یورپ تک مصالحوں کی تجارت پر پرتگالی اپنی اجارہ داری قائم کرنا چاہتے تھے۔ آہستہ آہستہ پرتگالیوں نے کالی کٹ، کوچین، گوا، دیو اور دمن میں تجارتی مراکز قائم کیے۔ پرتگال وہ پہلا یورپی ملک تھا جس نے ہندوستان جانے والے سمندری راستے کی کھوج کی تھی اور وہ پہلے یورپی شہری بھی تھے جنہوں نے سمندری راستے سے ایشیا کے ساتھ براہ راست تجارت میں سرگرم کردار ادا کیا تھا۔ ہندوستان کے مغربی ساحل پر واقع گوا کے اپنے مرکزی دفتر سے، انہوں نے ملک کے وسطی حصے پر قبضہ کرکے روایتی تجارت اور جہاز رانی کے نیٹ ورک پر گرفت حاصل کرنے کی کوشش کی، جس نے بحر ہند کے خطے اور اس کے درمیان ایشیائی تجارتی نیٹ ورک میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔

1498 میں پرتگالی مہم جو، واسکوڈا گاما (Vasco da Gama) کی کافی مشقتوں کے بعد تین جہازوں کے ساتھ کالی کٹ پہنچنے کو عالمی تاریخ میں خاص طور پر ایشیا اور یورپ کے مابین تعلقات کے سلسلے میں ایک نئے دور کا آغاز سمجھا جاتا ہے جس سے یورپی تجارت میں اضافہ ہوا۔ اس سے پہلے سلطنت عثمانیہ نے ایشیا کے تقریباً تمام یورپی تجارتی راستوں پر کنٹرول حاصل کیا تھا اور چونکہ عثمانی بندرگاہوں سے گزرنے والے تجارتی جہازوں کو جہاز سے مال اتار کر زمین کے راستے آگے بھیجنا پڑتا تھا، جس سے لاگت اور خطرہ دونوں بڑھ جاتے تھے۔ اس لیے پرتگال اس وقت افریقہ کے آس پاس سمندر کے ذریعے ہندوستان جانے والا تجارتی راستہ تلاش کر رہا تھا۔ پرتگال کے پرنس ہنری (Prince Henry) نے بحری مہم جوؤں کو بلاکر نئے راستوں کی تلاش کی غرض سے سرگرمیاں شروع کر دی تھیں۔ یہ دنیا بھر میں زبردست تحقیق کا آغاز تھا۔ تقریباً 1419 سے لے کر 1460 میں اپنی موت تک شہزادہ ہنری نے افریقہ کے ساحل پر کئی جہاز رانی مہمات کی قیادت کی۔ اس کے بعد 1481 میں پرتگال کے بادشاہ، جان دوم (John-II) نے ان کوششوں کو جاری رکھا اور افریقہ کے جنوبی ساحلوں کے آس پاس سمندری راستہ تلاش کیا جاتا رہا۔ بہت سے کھوجیوں نے متعدد کوششیں کیں۔ بارتھولومیڈیاس (Bartholomew Dias)، ایک پرتگالی مہم جو تھا جس نے 1488 میں افریقہ اور بحر ہند کے آس پاس اولین بحری سفر کیا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ ہندوستان تک پہنچ سکے، اسے پرتگال واپس لوٹنا پڑا۔ جب 1495 میں ایمانوئیل اول (Emmanuel-I) پرتگال کا بادشاہ بنا تو اس نے افریقہ کے آس پاس جاکر ہندوستان کے تجارتی راستے کھولنے کی کوششیں جاری رکھی۔ ایمانوئل نے بالآخر اس کام کے لیے 37 سالہ واسکوڈی گاما کو منتخب کیا۔ مالابار کے ساحل پر اس دوران واسکوڈی گاما نے اپنے سمندری کیریئر کا آغاز کیا۔ ایسٹ انڈیز تک راس امید (Cape of Good Hope) کے راستے کی دریافت اور اسپین میں امریکی چاندی کی بڑھتی ہوئی درآمد کو سولہویں صدی میں جدید معاشی نظام کے عروج کے پیچھے دو بڑی

طاقتوں کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اٹھارویں صدی کے آخر تک، ایشیا کا بیشتر حصہ یوروپیوں کے اثر ورسوخ میں رہا۔ دنیا کی تجارت میں متعدد ایشیائی ممالک کی بڑھتی ہوئی شمولیت نے ان کی معیشتوں اور معاشروں پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

نیدرلینڈ کے اسٹیٹس جنرل کے ذریعے منشور عطا کی ہوئی Vereenigde Oostindische Compagnie یا ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کی تشکیل 1602 میں ہوئی تھی۔ یہ دنیا کی پہلی ملٹی نیشنل کارپوریشن (Multinational Corporation) اور گودام کی سہولت فراہم کرنے والی اولین کمپنی تھی۔ ڈچوں کی اصل دلچسپی ہندوستان میں نہیں بلکہ ان مصالحوں میں تھی جو زیادہ تر انڈونیشیا میں پیدا ہوا کرتے تھے۔ ڈچوں نے ہندوستان میں سورت، بھروچ، کیمبے، ناگا پٹنم، مچھلی پٹنم، چنسورا، پٹنہ اور آگرہ میں تجارتی مراکز قائم کیے۔ اس کے بعد، انہوں نے 1605 میں اپنی پہلی فیکٹری مسولی پٹنم میں قائم کی اور پرتگالیوں پر فتح حاصل کی۔ 1616 کے بعد سے پلی کٹ ان کا مرکز رہا تھا اور اس کے بعد اسے ناگا پٹنم منتقل کیا گیا۔ 16ویں صدی کے نصف آخر میں، شمالی نیدرلینڈ کے باشندے بھی اس تجارت میں داخل ہوئے اور اس کامیابی کو مورخین "ڈچوں کے انوکھے کام" سے منسوب کرتے ہیں۔ اس وقت ڈچ مصالحوں کی تجارتی منڈی کے گویا تنہا مالک ہو گئے اور سادہ لوح جنوبی نیدرلینڈ والوں میں ان کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ لیکن شاید تقدیر نے ان کا ساتھ نہ دیا اور ان کا سنہرا دور جلد ہی روبہ زوال ہوا۔ اس زوال کے متعدد اسباب تھے۔

1595 میں پہلی مہم کے فوراً بعد ہی، ڈچوں نے ایشیا میں جاری تجارتی مقابلے میں پرتگالیوں اور دیگر یورپی ممالک پر سبقت حاصل کی۔ ایشیائی تجارتی کمپنیوں تک سفر کے لیے جہازوں پر تجارتی سامان لادنے کی غرض سے بڑے بڑے مراکز قائم کیے گئے۔ اس طرح سے تجارت میں کافی منافع ہوا اور اسے مقبولیت بھی خوب حاصل ہوئی۔ ساتھ ہی ساتھ ان کی توقعات بھی بڑھتی گئی اور نتیجے میں بڑے بڑے جہازوں کو ایشیا کے لیے روانہ کیا جانے لگا۔ 1602 تک، جب ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت 65 جہازوں پر مشتمل اکٹھے چودہ بیڑے بھیجے گئے تھے، جب کہ 1591 تا 1601 کے دوران پرتگالیوں نے 59 جہازوں پر مشتمل قافلہ روانہ کیا تھا۔ تاہم ڈچ قوت زوال پذیر ہونے لگی اور آخر کار 1759 میں چنسورا کی جنگ (Battle of Chinsurah) میں انگریزوں کے ہاتھوں شکست کھا کر ختم ہو گئی۔ ڈچ اور برطانیہ کی ایسٹ انڈیا کمپنیوں کی ابتدائی کوششیں مصالحوں کی تجارت تک ہی محدود تھیں لیکن بعد میں یہی کوششیں کپڑے کی طرف بڑھتی گئیں کیونکہ ہندوستانی کپڑے کی یورپ میں بہت ڈیمانڈ یا طلب تھی۔

ہندوستان کے ساحل پر پہنچنے والا آخری یورپی ملک فرانس تھا۔ گوکہ وہ سولہویں صدی کے آغاز ہی سے مشرقی ممالک کے ساتھ تجارت میں مصروف تھا۔ لوئی پانژدہم (Louis-XV) کے دور حکومت میں اس کے قابل وزیر کولبرٹ (Colbert) نے 1664 میں فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد رکھی۔ فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان اور بحر الکاہل میں تجارت کے لیے 50 سال کی اجازت حاصل ہوئی۔ یہ کمپنی 1667 تک ہندوستان میں نوآبادکاری کی کوشش کے تحت اپنے وسائل کا خوب استعمال کرتی رہی۔ اسی کے تحت اس نے سورت میں ایک فیکٹری قائم کی۔ اس کے بعد 1669 میں مسولی پٹنم میں مزید ایک فیکٹری قائم کی۔ ساتھ ہی ساتھ کولکاتہ کے قریب چندر نگر میں ایک بستی بسائی۔ 1673 اور 1674 میں ان کے ذریعے پدوچیری میں فیکٹریاں قائم کی گئیں۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی اور

خاص طور پر ساحلی علاقوں میں ماہے، کریکال، بالاسور اور قاسم بازار فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی کے چند اہم تجارتی مراکز تھے۔ اگرچہ برطانوی اور فرانسیسی ہندوستان میں تجارتی مقاصد سے آئے تھے، تاہم یہ دونوں اپنی روایتی دشمنی کے ساتھ ہندوستان میں اپنے اپنے اقتدار کو پھیلانے کے لیے ایک دوسرے سے لڑے۔ ہندوستان کی سرزمین اینگلو-فرانسیسی دشمنی کا میدان جنگ بن گئی۔ آسٹریا میں تخت نشینی کی جنگ کے ساتھ اس کا دوبارہ آغاز ہوا اور سات سالہ جنگ کے بعد یہ اختتام پذیر ہو گئی۔ خاص طور پر ہندوستان میں اس باہمی رقابت کے نتیجے میں تین جنگیں ہوئیں جس کے نتیجے میں فرانس والوں کی ہار ہوئی اور ہندوستان پر برطانیہ کا اقتدار پہلے سے زیادہ مضبوط اور مستحکم ہو گیا۔ ہندوستان پر اپنی بالادستی قائم کرنے میں فرانسیسی ناکام رہے۔

8.3 ہندوستان میں برطانوی سلطنت کا قیام (Establishment of the British Empire in India)

پرتگالیوں کی کامیابی اور مشرقی علاقوں میں تجارت سے زیادہ منافع حاصل ہونے کے سبب برطانوی تاجروں نے بھی ایشیائی تجارت میں قدم رکھا۔ نتیجتاً 1599 میں ان کے ایک گروہ نے اپنے آپ کو تجارتی مہم جو (Merchant Adventurers) کے نام سے موسوم کیا اور ایک کمپنی تشکیل دی۔ اس کے بعد ملکہ ایلزبتھ اول (Queen Elizabeth-I) نے 31 دسمبر 1600 کے روز ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام تجارتی حقوق کا ایک منشور (Charter) جاری کیا اور باضابطہ طور پر پندرہ سالہ اجارہ داری کو منظوری دی۔ اسی کے ساتھ مئی 1609 میں ایک نئے منشور کے ذریعے اسے غیر معینہ مدت تک بڑھا دیا گیا۔ ڈچ پہلے ہی مشرق کی جانب بہت زیادہ توجہ دے رہے تھے۔ لیکن اس سے قبل ہی برطانیہ نے کپڑے اور دیگر تجارتی مصنوعات کی تلاش میں ہندوستان کا رخ کیا۔

اٹھارویں صدی کے وسط میں اس ہنگامہ آرائی کے دوران فرانسیسی اور انگریزی حریف تجارتی کمپنیاں ہندوستان کی ساحلی منڈیوں اور تجارتی مراکز پر بالادستی قائم کرنے کے لیے باہم مقابلہ کر رہی تھیں۔ کے این چوہدری (K.N. Chaudhry) نے اسے Three Great Crafts یا تین عظیم دستکاریوں، کپڑے (Textiles)، روئی (Cotton) اور ریشم (Silk)، دھات (Metal) اور ایشیائی چینی مٹی کے برتن (Porcelain of Asia) کے عنوان سے موسوم کیا۔ چاندی کے متبادل سامان کی خاطر یورپی منڈیوں پر ان کا تسلط قائم ہوا۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدیوں میں ڈچ، فرانسیسی اور انگریز پرتگالیوں کے زیرِ سایہ ہوا کرتے تھے اور کپڑے، ریشم اور اسی کے ساتھ نمک کے کارخانے قائم کرنے کی غرض سے ساحلی اور صوبائی تجارتی مراکز کی تلاش میں تھے۔

آہستہ آہستہ انگریزوں نے اپنے تمام حریفوں کو شکست دے کر میدان سے باہر کر دیا۔ مقامی حکمرانوں کو بھی متعدد جنگوں میں شکست دے کر ہندوستان کے اقتدار اعلیٰ کے مالک بن گئے۔ اپنی سیاسی برتری کو اس نے اپنے معاشی اور تجارتی فائدے کے لیے استعمال کیا۔ اس کے نتیجے میں ہندوستان کی مالگزاری سے حاصل شدہ رقم برطانیہ بھیجنے کے لیے تجارتی سامان بہت کم قیمت پر خریدے گئے۔ بدلے میں ہندوستان کو کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا تھا۔ اسے معاشی اصطلاح میں دولت کی نکاسی (Drain of Wealth) کہا گیا۔ دوسری طرف انگلینڈ میں صنعتی انقلاب آنے سے مشین کے ذریعے پیداوار کا عمل تیز ہو گیا۔ اس کے لیے کچے مال کی فراہمی اور تیار شدہ مال کی کھپت کے لیے بازار کی ضرورت پیش آئی۔ ہندوستان چونکہ برطانیہ کے قبضے میں تھا اور امریکی نوآبادیات چھن جانے کی وجہ سے برطانوی صنعتوں کی ان دونوں

ضرورتوں کو بآسانی پورا کر سکتا تھا۔ ساتھ ہی اس سے کسی مزاحمت کی توقع بھی نہیں تھی چونکہ کوئی مقامی مقتدر اعلی ان کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان برطانیہ کے لیے کچے مال کی فراہمی اور مشینی مصنوعات کی کھپت کا بازار بن گیا۔ ہندوستانی دستکار اور صنعت کار، مشین سے بنی سستی اور خوبصورت اشیا کا مقابلہ نہیں کر سکے اور مقامی حکمرانوں کی سرپرستی سے محروم ہونے کی وجہ سے اپنے خریدار کھو بیٹھے۔ اس طرح ہندوستانی صنعت اور دستکاری کا زوال شروع ہو گیا۔ اس عمل کو زوال صنعت (De-industrialisation) یا مقامی صنعتوں کی تباہی کا عمل کہا جاتا ہے۔ یہ معاشی تباہ کاریاں، دو مراحل میں شروع ہوئی۔ پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکمرانی کے دوران اور دوسرے تاج برطانیہ کی حکومت میں زوال کا یہ عمل مزید تیز ہو گیا۔

8.3.1 کمپنی کی حکمرانی (Company Rule, 1757–1858)

1757 کی پلاسی کی جنگ کے بعد برصغیر ہند، برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت چلا گیا جسے ہندوستان میں کمپنی کی حکمرانی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کمپنی حکومت کے دوران سامان تجارت اور مزدوروں کو لانے لے جانے کے لیے برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کئی تجارتی جہاز استعمال کرتی تھی۔ پلاسی کی جنگ سے حاصل شدہ مال و دولت سے ہندوستانی راجاؤں کے خلاف جنگ چھیڑنے میں مدد ملی جس سے انگریزوں کی سیاسی قوت کو استحکام ملا اور بالآخر برطانوی اقتدار قائم ہو گیا۔ اس دور میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستانی مصنوعات بالخصوص کپڑے پر اجارہ داری حاصل کر لی۔

انگریزوں کی اختیار کردہ معاشی پالیسیوں کے نتیجے میں ہندوستانی معیشت تیزی سے نو آبادیاتی معیشت میں تبدیل ہو رہی تھی جس کا مزاج اور ساخت انگریزوں کی ضروریات کے مطابق تھا۔ ہندوستان پر برطانوی تسلط نے ہندوستانی معیشت کی روایتی ساخت کو مکمل طور پر تہس نہس کر دیا۔ 1813 کے بعد برطانیہ نے ہندوستان پر یک طرفہ آزاد تجارت کی پالیسی تھوپ دی اور برطانوی صنعت کاروں نے بالخصوص کپڑے کی صنعت میں دخل اندازی کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ قدیم تکنیک سے تیار کردہ مصنوعات، بھاپ پر چلنے والی مشینوں سے بڑے پیمانے پر تیار کردہ مصنوعات سے مقابلہ نہیں کر پا رہی تھی۔

1856 میں اودھ کے برطانوی حکومت کے ماتحت چلے جانے کے بعد ہمالیہ تک برصغیر ہند کا پورا علاقہ اور برما کا بیشتر حصہ کمپنی کی حکومت میں یا پھر ان مقامی حکمرانوں کے تحت چلا گیا جن کا کمپنی کے ساتھ الحاق ہو چکا تھا۔ اپنے دور حکمرانی میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں صوبہ بنگال (Bengal Presidency)، صوبہ بمبئی (Bombay Presidency)، صوبہ مدراس (Madras Presidency) اور شمال مغربی صوبہ جات (North-West Frontier Provinces) کے نام سے چار اہم صدر مقام قائم کر لیے تھے۔ کمپنی کا اقتدار اور برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی توسیع کا یہ مرحلہ 1857 کی ہندوستانی بغاوت تک جاری رہا۔ 1857 کے بعد بالآخر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1858 کے ساتھ کمپنی کا اقتدار ختم ہو گیا۔ حالانکہ ایسٹ انڈیا کمپنی پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت 1874 میں تحلیل ہوئی۔

8.3.2 تاج برطانیہ کی حکمرانی (Rule by the Crown of Great Britain, 1858–1947)

1858 سے ہندوستان ملکہ برطانیہ کی بادشاہت کے تحت چلا گیا۔ اس حکمرانی میں ریاست کے محصول میں کوئی بڑی تبدیلی واقع نہیں ہوئی لیکن اس کے سبب برطانوی سلطنت کی معیشت دور دراز کے علاقوں میں پہونچ گئی۔ نتیجتاً برطانوی تجارت کی توسیع، سرمائے کی روانی اور مقامی دستکاری میں تنزلی ظاہر ہونے لگی۔ ہندوستانی معیشت جمود کی حالت میں پہنچ گئی اور صنعتی زوال کا شکار ہوگئی جب کہ برطانوی معیشت ترقی پاکر صنعتی انقلاب کے دور سے گذر رہی تھی۔ انگریزوں کی نافذ کردہ متعدد معاشی پالیسیوں کے سبب ہندوستان کے دستکاری شعبے میں تنزل واقع ہوا۔ اس کے نتیجے میں ملازمتوں اور خدمات میں کمی واقع ہوئی۔ مجموعی طور پر نو آبادیاتی حکومت نے ہندوستان پر گہرے معاشی اثرات مرتب کیے۔ انیسویں صدی کے درمیانی حصے میں تجارت کے حجم میں اضافہ ہوا لیکن تجارت کا توازن اب بدل چکا تھا اور یہ برطانیہ کے حق میں ہو گیا تھا۔ ماضی میں ہندوستان کپڑے کا برآمد کنندہ ملک تھا لیکن اب یہ برطانیہ کو زرعی اشیا اور کچے مال فراہم کرنے والا اور وہاں سے تیار شدہ مصنوعات درآمد کرنے والا ملک بن گیا تھا۔ کچی سوت اور غذائی اجناس نے سامراجی تجارت میں اہم رول ادا کیا۔ ہندوستان میں ریلوے کے نظام کی توسیع کے لیے نجی اور سرکاری انگریز سرمایہ کاروں نے بڑی مقدار میں سرمایہ کاری کی جس کے سبب اعلیٰ درجے کی تجارت اور فوج کے استعمال میں مدد ملی۔ 1853 میں ریلوے کا آغاز ہوا اور اس میں بتدریج اضافہ ہوا اور اس کے بعد برصغیر کے دور دراز علاقوں تک رسائی ممکن ہوئی۔

8.4 صنعتوں اور دستکاری کا زوال (Decline of Industries and Handicrafts)

جدید ہندوستان صنعتی ملک نہیں تھا۔ لیکن سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے معیارات کے مطابق غالباً یوروپی اقوام کی آمد سے قبل ہندوستان دنیا کی صنعتی کارگاہ تھی۔ ہندوستان کی روایتی معیشت، زراعت اور دستکاری کا ملاجلا بہترین نمونہ تھی۔ برطانوی حکومت نے اس کی صنعت اور زراعت کی تباہی میں اہم رول ادا کیا۔ برطانوی حکومت کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ہندوستانی معیشت کی ساخت اور کارکردگی میں تبدیلی کی گئی جس کے نتیجے میں ہندوستانی معیشت پوری طرح تباہ ہوگئی اور یہ ایک نو آبادیاتی معیشت (Colonial Economy) میں تبدیل ہوگئی، جس کا مقصد مادر وطن (Mother Country) کے فائدے کے لیے کام کرنا تھا۔ انگریزوں نے جان بوجھ کر روایتی ہندوستانی صنعتوں کو تباہ کرنے والی پالیسیاں اپنائی۔ انگریز تاجروں اور صنعت کاروں کے دباؤ میں آکر برطانوی حکومت نے ہندوستانی صنعت کاروں پر برطانوی کارخانہ داروں کو ترجیح دی اور اس کے خراب اثرات کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ ہندوستان کو مشینوں سے تیار کردہ برطانوی مصنوعات کا بڑا بازار بنانا ہی ان کا مقصد تھا۔ اس کے نتیجے میں بالآخر ہندوستان صرف زرعی خام مال فراہم کرنے والا ملک بن کر رہ گیا اور اس طرح ہندوستان برطانیہ کی خام مال کی بڑھتی ہوئی ضروریات پوری کرنے کی حد تک محدود ہو گیا۔ ان دونوں مقاصد کا حصول اسی وقت ممکن تھا جب کہ دستکاری کی صنعت کا خاتمہ ہو جائے۔ اب ہندوستان کو مصنوعات کے لیے برطانیہ سے درآمدات پر انحصار کرنا پڑا۔ 1800 میں ہندوستان کی روایتی مصنوعات کی تیاری میں بڑی حد تک کمی واقع ہوئی اور یہاں سے زرعی پیداوار کی برآمد میں اضافہ ہوا۔ اب برصغیر ہند پوری طرح سے برطانوی صنعتوں کے تابع ہو گیا۔ اٹھارہویں صدی میں ہندوستان میں صنعتی اشیا کی تیاری اور روزگار میں

کمی کو زوال صنعت کے نام سے جانا جاتا ہے۔

اٹھارہویں صدی کے دوران ہندوستان کو دنیا میں ایک نمایاں تیار کنندہ ملک کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ اس کی 15 سے 20 فیصد آبادی یا دوسرے لفظوں میں ڈیڑھ سے دو کروڑ افراد مقامی صنعتوں سے منسلک تھے۔ یہاں کی اہم صنعتوں میں کپڑے کی کتائی بنائی، چمڑا اور چمڑے کی اشیا کی تیاری، دھاتوں کے کام، قالین اور شالوں کی تیاری شامل تھی۔ ان تمام صنعتوں میں مشینوں کا استعمال نہیں ہوتا تھا اور یہ بڑے کارخانوں کی صورت میں منظم نہیں تھیں اور نہ ہی یہ انگلینڈ کی طرح کسی طرح کے قوانین کی تابع تھی۔ یہ زیادہ تر خاندانی کاریگروں اور گھریلو عورتوں کے ذریعے پر کی جاتی تھی جنہیں روایتی صنعتوں (Traditional Industries) کا نام دیا گیا۔ اس دوران ہندوستان اور عالمی تجارت میں ڈرامائی اضافہ ہوا اور ہندوستانی روایتی صنعتوں کو برطانیہ کی جدید صنعتوں سے سخت مقابلہ کرنا پڑا۔ برطانیہ میں مشینوں سے تیار کردہ کپڑے نے ہندوستان میں ہاتھ سے تیار کردہ دھاگے اور کپڑے سے مقابلہ شروع کیا۔ مورخین کے مطابق ہندوستان میں مستحکم صنعتی تیاری کی روایت تھی، ان روایتی صنعتوں کو نو آبادیاتی دور میں زوال واقع ہوا۔ ان کی جگہ حاصل کرنے والی جدید صنعتوں نے روزگار اور آمدنی میں نقصانات کی بھرپائی نہیں کی۔ صنعتی زوال کے نہایت منفی اثرات مرتب ہوئے۔ اس نظریے کو چار نکات میں بیان کیا جاسکتا ہے:

1. ہندوستان میں روایتی صنعتوں کا زوال
2. تکنیکی فرسودگی کے سبب زوال
3. ہاتھ سے تیار کردہ اشیا اور مشینوں سے تیار کردہ اشیاء میں غیر مساوی مقابلہ آرائی
4. بازار کا برطانیہ کی ضروریات کے مطابق چلنا

ان وجوہات کے سبب برطانیہ سے نزدیکی معاشی رشتے استوار ہوئے۔ یہ پورا عمل نو آبادیاتی پالیسیوں کے سبب قائم رہا اور ہندوستانی نو آبادی کو اس کی وجہ سے معاوضے سے محروم ہونا پڑا۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے دوران ایشیا سے وسیع پیمانے پر کاروبار میں مصروف کمپنیاں اجارہ دار کمپنیاں تھیں جن کا تعلق یورپ کے شمال مغرب کے متعدد ممالک سے تھا۔ یورپ میں ایسٹ انڈیا کمپنی قائم ہوئی اور مغربی بازار میں مشرق کی اشیائے تعیش کی طلب میں اضافہ ہوا کیونکہ یورپ میں ان کی بڑی مانگ تھی۔ ابتدائی قوم پرست مورخ رمیش چندر دت (Romesh Chunder Dutt) کے مطابق "آزاد تجارت نے روایتی دستکاری صنعت کو ختم کر دیا اور ہندوستان کو مزید غریب بنا دیا۔" ان کے مطابق ہندوستانی صنعتکاروں سے برطانوی کارخانہ داروں کی طرف تبدیلی برطانوی ہند کی تاریخ کا ایک دردناک باب ہے۔

ہندوستان میں صنعتی زوال کی متعدد وجوہات حسب ذیل ہیں۔

- برطانوی فیکٹریوں نے سستا کپڑا اپنایا اور ہندوستان میں اس کا سیلاب آ گیا۔ صنعتی انقلاب کے ساتھ برطانیہ نے کپڑے کی تیاری کے لیے جدید ٹکنالوجی اور مشینیں متعارف کیں۔ اس وجہ سے اشیا کی تیاری میں آسانی ہوئی اور برصغیر ہند میں انگریزی کپڑے کی کثرت ہو گئی۔ یہ کپڑا سستے داموں پر فروخت ہوتا تھا اور اس طرح ہندوستان کی روایتی صنعت تباہ ہو گئی۔
- 1853 میں ریلوے نظام متعارف ہوا جس کے سبب ہندوستان کے دور دراز علاقوں تک برطانوی اشیا کی رسائی ممکن ہو گئی۔

- ہندوستانی دستکاری کی حفاظت کے لیے ٹیرف پالیسیوں کی عدم موجودگی۔ انگریزوں نے برطانوی مصنوعات کے فروغ کے لیے برطانوی مصنوعات کے ہندوستان میں داخلے کو آسان بناتے ہوئے اس پر عائد ٹیکسوں میں کمی کی، جب کہ ہندوستانی مصنوعات کی برآمدات پر زیادہ سے زیادہ ٹیکس عائد کیا۔ اس پالیسی کو تجارتی تحفظ پسندی (Mercantilism) کی پالیسی کہا گیا۔ بین الاقوامی بازار، بین الاقوامی تاجروں کے کنٹرول میں تھا جس کے سبب دستکاروں کو ان تاجرین کے رحم و کرم کا محتاج ہونا پڑا۔ دیگر اقوام کے مقابلے میں ہندوستان میں دستکاروں کی تنظیمیں کمزور ہوگئی۔
- برطانوی اقتدار کے سبب کاریگروں کے لیے مقامی بادشاہوں کی سرپرستی میں کمی آگئی جو قدیم زمانے سے ان کے بڑے خریدار اور سرپرست رہے تھے۔ اس کے نتیجے میں دستکاری زوال کا شکار ہوئی۔
- ہندوستان اور برطانیہ کی مصنوعات میں مقابلہ آرائی کے لیے غلط قوانین ہندوستان پر مسلط کیے گئے۔ ناانصافی اور غیر برابری پر مبنی پالیسیوں جیسے ہندوستانی اشیا پر پابندی، گھریلو بازار میں بھاری قیمت اور آزاد تجارت کے نام برطانوی تاجروں کے لیے ہندوستانی بازار میں آزادی، وغیرہ کے ذریعے ہندوستانی کارخانہ داروں کے لیے انگلینڈ کے بازار تک رسائی کو محدود کیا گیا۔
- 1848 سے ہندوستان سے انگلینڈ کے لیے برآمدات پر زیادہ ٹیکس عائد کیا گیا اور گھریلو چنگیوں (Inland Customs) اور ترسیلی محصول نظام (Transit Duty System) کے ذریعے ہندوستانی بازار کو محدود کر دیا گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنا سیاسی اثر ورسوخ استعمال کر کے کاریگروں اور کپڑا بنکروں پر اجارہ دارانہ کنٹرول قائم کیا اور، انہیں سستی اشیا کی تیاری یا پھر اس میں ناکامی کی صورت میں اپنے آبائی پیشے کو چھوڑنے پر مجبور کیا۔

8.5 کپڑے کی صنعت کا زوال (Decline of the Textile Industry)

15ویں صدی میں انگریزوں کی آمد سے قبل ہندوستان میں سوتی کپڑے کی تیاری نے ایک ممتاز شکل اختیار کرلی تھی جس کے سبب ہندوستان سے زمینی اور سمندری راستے کے سے بڑے پیمانے پر مشرق میں انڈونیشیا اور جاپان جیسے ایشیائی ممالک اور عرب، ایتھوپیا، مصر اور مغربی افریقہ تک تجارت کے لیے وسیع بنیاد فراہم ہوئی۔ ہندوستانی تاجر سوتی کپڑے کی مختلف اقسام کی تجارت کرتے تھے جس کے عوض وہ متعدد اشیا جیسے کھانے پینے کی اور پر تعیش اشیا خریدتے تھے۔ مغربی ہندوستان میں گجرات کا علاقہ، شمال میں کورومنڈل اور بعد ازاں بنگال بڑے تجارتی مراکز بنتے جارہے تھے۔ یوروپی اقوام بھی اس طرح کی بڑے پیمانے پر تجارت سے کافی حیرت زدہ تھیں۔ بحری سیاحوں نے بھی ناگا پٹنم، سینٹ تھامس اور مسولی پٹنم میں تیار کیے جانے والے مہین کپڑے کا مشاہدہ کیا۔ یہ سوتی کپڑے اپنے رنگ اور مختلف طریقوں کی بنائی اور نقش و نگار کے لیے مشہور تھے جو بہت مہین تھا اور نزاکت سے تیار کردہ تھا اور ہندوستان میں عام طور سے استعمال ہوتا تھا۔ ہندوستانی سوتی کپڑے بحر ہند کے علاقے میں زیادہ تر ممالک تک رسائی رکھتے تھے۔ سترہویں صدی کی ابتدا میں بڑی مقدار میں یہ ہندوستانی سوتی کپڑے ایران کے شمالی ساحل پر مستقلاً فروخت ہوتے تھے اور ہندوستانی تاجروں کے ذریعے زمینی اور سمندری راستے سے فارس، بغداد اور بصرہ جاتے تھے جب کہ شام کے راستے قسطنطنیہ تک پہنچتے تھے۔ براعظم ایشیا کے دیگر ممالک کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم کرنے میں دیگر

مصنوعات کے ساتھ کپڑے نے بھی اہم رول ادا کیا۔ یہاں تک کہ 1660 کے دہے میں بیک وقت 25 تا 30 ہزار اونٹوں پر سوار کپڑے کی مصنوعات ہندوستان سے ہر سال ایران روانہ کی جاتی تھی۔ سترہویں صدی کی ابتدا سے یورپ، ہندوستانی کپڑے کا نیا بازار بن چکا تھا۔ حالانکہ بنگال، گجرات اور کورومنڈل بین الاقوامی تجارت کے مراکز بنے رہے لیکن ان کی اہمیت میں کمی واقع ہوئی اور صرف بنگال کافی اہمیت اختیار کر گیا۔ 1700 تک ہندوستانی بحری تجارت، ہندیورپی نوعیت کی حامل تھی اور اس تجارت کی اہم ترین مصنوعات کپڑا بن گیا تھا۔ اس نے چاول اور مصالحوں کی جگہ لے لی تھی جس کا اب تک بحری تجارت پر غلبہ تھا۔

ہندوستان اور چین سے پر تعیش اشیا کی یورپ درآمد نے اٹھارہویں صدی کے آخر میں یورپی معیشت کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔ پر تعیش اشیا کی صورت میں کپڑے نے مغربی صارفین اور صنعتوں تک رسائی حاصل کرلی۔ ایشیا سے درآمدی اشیا کی طلب صرف دربار اور امیر افراد تک محدود نہیں رہی بلکہ فیشن انڈسٹری میں بھی اس کی طلب میں اضافہ ہوا۔ یوروپی یہ مصنوعات درآمد کرتے تھے۔ طلب اور رسد میں غیر معمولی اضافہ اور دیگر ایشیائی مصنوعات کی یورپی بازار میں رسائی کے سبب انیسویں صدی کے آخر تک آسان تکنیک پر مبنی کپڑے کی صنعت نے بین الاقوامی بازار پر غلبہ بنائے رکھا۔ ابتدا میں یورپی کمپنیوں کو کپڑے برآمد کرنے کے لیے مناسب درآمدی سامان تلاش کرنے میں کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ہندوستان میں سب سے زیادہ طلب قیمتی سونے اور چاندی کی تھی جس کے سبب ہندوستان میں بلین (Bullion) یا سونے اور چاندی کی بڑے پیمانے پر ترسیل کا آغاز ہوا۔ 1757 میں برطانیہ کے سیاسی اقتدار کے حصول تک یہ رجحان جاری رہا۔ اس کے بعد سونے کی ترسیل رک گئی اور اس کی جگہ کمپنی کو حاصل ہونے والے زمینی محصول نے لے لی۔ کمپنی نے زمینی محصول میں اضافہ کر دیا اور کپڑے پر بھی محصول نافذ کر دیا۔ ہندوستانی کپڑے کو بین الاقوامی بازار میں سوتی کپڑوں کے معیار اور ڈیزائن نیز کاریگروں کی کم اجرت پر دستیابی کے سبب مسابقتی فوائد حاصل ہوئے۔ اٹھارہویں صدی کے درمیانی عرصے میں ہندوستانی کپڑے کی مصنوعات، برطانیہ میں صنعتی انقلاب آنے سے مشین سے تیار کی جارہی مصنوعات کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہو گئی۔ حالانکہ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے برآمدات کے لیے ادائیگی کے ذریعے اس مسئلے کے حل کی کوشش کی لیکن کپڑے کی صنعت کو ایک بڑا دھچکا لگا جس کے سبب بین الاقوامی بازار میں ہندوستان کے مقام کو کافی نقصان پہنچا۔ انیسویں صدی کے آخر تک ہندوستانی دستکاری صنعت، زوال کا شکار ہوئی اور اس کے ختم ہو جانے کی نوبت آپہنچی۔

برطانیہ میں کاریگروں کی اجرت ہندوستان کے مقابلہ میں پانچ گنا زیادہ تھی اس لیے وہاں ہندوستانی تکنیک سے کپڑے کی تیاری کافی مہنگی تھی۔ صنعتی انقلاب کی کم محنت طلب تکنیک کے سبب یہ حالات تبدیل ہو گئے اور مشینوں کے ذریعے سوتی کپڑوں کی تیاری سے اس کی قیمتوں میں کافی کمی واقع ہوئی۔ ہندوستانی کاریگر اس قیمت پر کپڑے تیار نہیں کر سکتا تھا اور ادھر برطانیہ میں تیزی سے کپڑے کی تیاری جاری رہی، جس کے سبب برطانوی بازار میں ہندوستانی کپڑا مقابلہ نہیں کر پایا۔ ادھر اندرون ملک بھی ہندوستانی مصنوعات کو برطانوی مصنوعات سے مقابلہ پیش آیا۔ انیسویں صدی کے درمیانی عرصے میں رفتہ رفتہ ہندوستانی مصنوعات کی جگہ برطانوی مصنوعات نے لے لی۔ دستکاری سے تیار کردہ مصنوعات، صنعتی انقلاب کے سبب مشینوں سے تیار کردہ مصنوعات کا مقابلہ نہیں کر پائی اور ہندوستانی صنعت اور دستکاری زوال

کا شکار ہو گئی۔ ایسا اس وجہ سے بھی ہوا کیوں کہ ہندوستانی دھاگے نے ہندوستانی کپڑے پر اپنا قابو کھو دیا۔ ہندوستان میں تکنیکی تبدیلیوں کی رفتار کافی سست تھی اور ہندوستانی بنکروں نے گھریلو تیار کردہ دھاگے کی جگہ اب سستے اور ٹکاؤ باہر سے منگائے ہوئے دھاگے کا استعمال شروع کر دیا تھا۔ اس کے بعد ہندوستانی کپڑے کی صنعت کی جگہ انگریزی ملوں میں تیار کردہ کپڑے نے لے لی تھی، جس کے سبب 1830 اور 1880 کے درمیان ہندوستانی کپڑوں کی مصنوعات کے گھریلو استعمال میں کمی واقع ہوئی۔ سال 1828 میں سوتی کپڑوں کی سالانہ درآمدات 40 لاکھ سے زائد تھی جو مجموعی درآمدات کا 8 فیصد تھی۔ 1867 اور 1886 کے دوران سوتی کپڑے کی درآمدات 95.8 کروڑ گز سے بڑھ کر 215.6 کروڑ گز تک پہنچ گئی۔ سال 1870 میں ان مصنوعات کی درآمدات مجموعی درآمدات کی 47 فیصد تک پہنچ گئی اور 1960 میں یہ 230.9 کروڑ گز تک پہنچ گئی۔

8.6 صنعتوں اور دستکاری کے زوال کے نتائج

(Consequences of the Decline of Industries and Handicrafts)

جدید صنعتی ترقی کی جانب انگریزوں نے کسی طرح کے اقدامات نہیں کیے تھے۔ روایتی زندگی ہندوستان میں صنعت کاری سے ماورا نہیں رہ پائی جو اسی دوران انگلینڈ اور دیگر صنعتی ممالک میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ اس کے سبب ہندوستان میں صنعتوں کا زوال ہوا جب کہ یورپ میں صنعتی انقلاب پوری شدت کے ساتھ ترقی کر رہا تھا۔ یہ تمام سرگرمیاں اس وقت ہو رہی تھیں جب کہ ہندوستانی کاریگر اور دستکار پہلے ہی زمینداروں اور مقامی حکمرانوں کی سرپرستی سے محرومی کے سبب بحران کا شکار تھے جو اب نئے مغربی اقتدار کے زیر اثر آ چکے تھے۔ اس عمل کے نتیجے میں دیہاتوں کی جانب واپسی کا عمل شروع ہوا۔ ہزاروں بنکر اپنی گزراوقات سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ایک تخمینے کے مطابق بنگال میں 1801 میں صنعتی روزگار میں 9 فیصد کے مقابلے 1901 میں 21 فیصد کی گراوٹ درج کی گئی۔ مجموعی افراط زر میں صنعت و تجارت کے شعبے میں بھی کمی واقع ہوئی۔ انیسویں صدی کے دوران شہروں میں سکونت اختیار کرنے کے رجحان میں 15 سے 9 فیصد کی گراوٹ درج ہوئی۔ اس دوران ہندوستان کی مصنوعات کی تیاری کی بین الاقوامی حصے داری میں 2 سے 27 فیصد تک کی گراوٹ درج ہوئی۔ ہندوستان جو ماضی میں صنعتی اشیا کا برآمد کنندہ ملک تھا، آہستہ آہستہ زرعی پیداوار کا برآمد کنندہ ملک بن گیا اور برطانوی سلطنت کی بین الاقوامی معیشت سے مربوط ہو گیا۔ 1880 میں سوتی کپڑے کا مقامی مصرف 60 فیصد برطانوی درآمدات کی صورت میں درج ہوا۔ چونکہ درآمد کردہ سوتی کپڑا سستا تھا لہٰذا فی کس آمدنی میں بھی کمی درج ہوئی۔ ہندوستانی اشیا کی تیاری بھی زوال کا شکار ہوئی اور تیار شدہ اشیا اس کی فہرست برآمدات سے خارج ہو گئی۔ 1880 کے بعد جدید کپڑے کی صنعت کی ترقی کے ساتھ ہندوستانی کپڑا بنانے والے بازار میں حصص (Shares) حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ کپڑا بنکروں اور کاریگروں کی بے روزگاری میں اضافہ ہوا جس کے سبب وہ گزراوقات کے لیے زراعت کی جانب متوجہ ہوئے لیکن اس کے سبب کاریگروں کے مجموعی معیار زندگی پر برے اثرات مرتب ہوئے۔ 1901 تک 1.3 کروڑ صنعتی مزدوروں کی ایک تہائی تعداد دستکاروں پر مشتمل تھی۔ متعدد کاریگر، کمپنی حکومت کے تحت کم سے کم اجرت اور جابرانہ پالیسیوں کا شکار ہوئے۔ کاریگروں اور بنکروں کو کم سے کم اجرت دی جاتی تھی اور ان کی تیار کردہ اشیا کم قیمت پر فروخت کرنے کے لیے انہیں مجبور کیا جاتا۔ اس کے سبب زرعی زمینوں پر

بوجھ میں اضافہ ہوا۔ برطانوی دور حکومت میں غربت کی ایک بڑی وجہ زرعی شعبے پر اضافی بوجھ بھی تھا جس کی وجہ سے دیہاتوں کا معاشی نظام بھی متاثر ہوا۔

8.7 دولت کی نکاسی کا نظریہ (Theory of the Drain of Wealth)

1. ابتدااورارتقا (Origin and Development)

برطانوی ہندوستان میں، ہندوستانی مصنوعات سیاسی وجوہات کی بنا پر انگلینڈ کی طرف جارہی تھی، اور اس کے عوض میں ہندوستان کو کچھ نہیں ملتا تھا، اسے دولت کی نکاسی (Drain of Wealth) کے نظریے کا نام دیا گیا تھا۔ دولت کی نکاسی کا تصور، تجارتی فکر کے دوران پروان چڑھا۔ اس وقت کے بہت سے معاشی مؤرخین نے دولت کی نکاسی کے اصول پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ان میں سب سے پہلے دادا بھائی نوروجی (Dadabhai Naoroji) نے دولت کی نکاسی کا تصور اپنی کتاب Poverty and Un-British Rule in India میں پیش کیا۔ انہوں نے دولت کی نکاسی کو تمام برائیوں کی جڑ کہا ہے۔ 1905 میں انہوں نے کہا تھا کہ "دولت کی نکاسی تمام برائیوں اور ہندوستانی غربت کی جڑ ہے۔" رمیش چندر دت، مہادیو گووند راناڈے اور گوپال کرشن گوکھلے جیسے قوم پرست مفکرین نے بھی دولت کی نکاسی کے اس عمل پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے مطابق حکومت آبپاشی کے منصوبوں پر خرچ کرنے کے بجائے ایسی چیزوں پر خرچ کرتی ہے جس کا براہ راست تعلق سامراجی حکومت کے مفادات سے پُر ہے۔ دولت کی نکاسی کے اہم عناصر میں برطانوی انتظامیہ اور فوج کے افسران کی تنخواہ اور بھتے، ہندوستان کے بیرونی ملک سے لیے گئے قرضوں پر سود، شہری اور فوجی محکمے کے لیے برطانوی اسٹوروں سے خریدی گئی اشیا، جہازرانی کمپنیوں اور غیر ملکی بینکوں کو ادائیگیاں اور بیما کے منافع شامل تھے۔ ہندوستانی دولت کی انگلینڈ کی طرف بہاؤ کی وجہ سے ہندوستان میں سرمائے کی تشکیل اور اس کا ارتقا نہیں ہوسکا، جب کہ اس دولت سے انگلینڈ میں صنعتی ترقی کے ذرائع میں اضافہ ہوا اور ترقی کی رفتار میں بہت تیزی آئی۔ دولت سے برطانوی معیشت کو جو منافع ملاوہ سرمائے کی صورت میں ہندوستان میں دوبارہ لگایا گیا اور یوں ہندوستان کا استحصال بڑھتا ہی چلا گیا۔ اس طرح ہندوستان سے دولت کی نکاسی کی وجہ سے روزگار اور آمدنی کے امکانات پر بہت برا اثر پڑا۔ دولت کی یہ بے تحاشا نکاسی ہندوستان کو اندر سے کمزور بھی بنارہی تھی۔

تجارتی نظام کے تحت، دولت کی نکاسی اس صورت حال کو کہا جاتا ہے جب سونا، چاندی جیسی قیمتی دھاتیں (Bullion) منفی تجارتی توازن کی وجہ سے ملک سے باہر چلی جاتی ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ پلاسی کی جنگ سے 50 سال قبل برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستانی اشیا کی خریداری کے لیے دو کروڑ روپے کی قیمتی دھات ہندوستان لائی تھی۔ کمپنی کے اس اقدام پر برطانوی حکومت نے تنقید کی لیکن کرناٹک کی جنگوں اور پلاسی اور بکسر کی لڑائیوں کے بعد صورت حال ڈرامائی طور پر بدل گئی۔ برطانوی کمپنی کو بنگال کی دیوانی کے حصول کے ساتھ، کمپنی نے اپنی سرمایہ کاری کا مسئلہ حل کر لیا۔ اب اندرونی تجارت سے حاصل ہونے والی دولت کا ایک حصہ، بنگال کی لوٹ مار سے حاصل ہونے والی دولت اور بنگال کی دیوانی سے حاصل ہونے والی دولت کو ہندوستانی سامان کی خریداری میں لگایا جانے لگا۔ اس طرح ہندوستان نے برطانیہ کو جو کچھ برآمد کیا اس کے بدلے ہندوستان کو کوئی معاشی، مادی یا مالی فائدہ نہیں ملا۔ لیکن بنگال کی دیوانی سے حاصل ہونے والی آمدنی کا ایک حصہ

سامان تجارت کی شکل میں ہندوستان سے برطانیہ منتقل ہوتا رہا۔ اسے برطانیہ کے حق میں ہندوستان سے دولت کی منتقلی کہا جا سکتا ہے۔ یہ سلسلہ 1813 تک جاری رہا لیکن 1813 کے منشور کے تحت کمپنی کا مالگزاری کھاتا اور کمپنی کا کاروباری کھاتا الگ کر دیا گیا۔

1813 کے منشور کے تحت برطانوی سامان کے لیے ہندوستان کا راستہ کھول دیا گیا اور ہندوستان میں کمپنی کی تجارتی اجارہ داری ختم کر دی گئی۔ اسے ایک اہم تبدیلی کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ صورت حال اس وقت مزید تشویشناک ہو گئی جب کمپنی کی جانب سے ہندوستان سے تیار مال کی برطانیہ اور یورپ کو برآمد (Export) کی بھی حوصلہ شکنی کی گئی۔ نتیجے کے طور پر، کمپنی کو اب اپنے حصص مالکان کو ادا کیے جانے والے منافع کے مسئلے کا سامنا ہوا۔ ابتدائی طور پر کمپنی نے نیل اور روئی کو برآمد کر کے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی لیکن کیمیائی مصنوعات اور سستی مزدوری کی وجہ سے ہندوستانی نیل اور کپاس کم قیمت امریکی مصنوعات کے سامنے نہ ٹھہر سکی۔ اس لیے برآمدی اداروں کو نقصان اٹھانا پڑا۔ یہی وجہ تھی کہ کمپنی نے متبادل کے طور پر ہندوستان میں افیون کی پیداوار پر اصرار کیا۔ پھر بڑی مقدار میں افیون چین کو برآمد کی گئی۔ افیون کی برآمد کمپنی کی تجارتی صحت کے لیے اتنی ہی ضروری تھی جتنی چینی لوگوں کی صحت کے لیے وہ خراب تھی۔ افیون کی تجارت کی مخالفت کے بعد بھی برطانوی کمپنی نے زبردستی یہ مہلک زہر چین پر مسلط کر دیا۔ برطانیہ ہندوستان سے چین کو افیون برآمد کرتا تھا اور اس کے بدلے میں ریشم اور چائے جمع کرتا تھا اور منافع کماتا تھا۔ اس طرح ہندوستان سے برآمدات تو ہوتی رہیں لیکن درآمدات اس تناسب سے تبدیل نہ ہو سکیں۔

یہ مسئلہ اپنی بدلی ہوئی شکل کے ساتھ 1858ء کے بعد بھی جاری رہا۔ 1858 میں ہندوستان کا انتظام انگریزوں نے کمپنی سے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس تبدیلی کے تحت، ہندوستان کی انتظامیہ کے لیے Secretary of State for India یا سیکریٹری برائے ہندوستانی ریاست کا عہدہ تشکیل دیا گیا تھا۔ ہندوستان کے سکریٹری اور ان کی کونسل کے اخراجات ہندوستانی کھاتے میں منتقل کر دیے گئے۔ جو دولت 1857ء کی بغاوت کو دبانے میں خرچ کی گئی تھی، وہ بھی ہندوستانی کھاتے میں منتقل کر دی گئی۔ اس سے بھی زیادہ قابل غور حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی حکومت ہر سال ایک مخصوص دولت گھریلو اخراجات (Home Charges) کے طور پر برطانیہ بھیجتی تھی۔ اخراجات کی اس مد میں بہت سی چیزیں شامل تھیں، جیسے کہ ریلوے پر ضمانت شدہ سود، سرکاری قرضوں پر سود، برطانیہ میں ہندوستان کے لیے فوجی سامان کی خریداری، ہندوستان سے ریٹائر ہونے والے برطانوی افسران کی پنشن وغیرہ۔ اس طرح گھریلو اخراجات کی رقم بھی، دولت کی نکاسی کے طور پر شمار کی گئی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ 19ویں صدی میں دولت کی نکاسی میں نہ صرف گھریلو اخراجات شامل تھے بلکہ اس میں کچھ دیگر اشیا بھی شامل کی گئیں۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں کام کرنے والے انگریز افسروں کی تنخواہ کا وہ حصہ جو ہندوستان سے بچا کر برطانیہ بھیجا گیا اور نجی برطانوی تاجروں کا منافع جو ہندوستان سے برطانیہ بھیجا گیا۔ پھر، جب 1870 کی دہائی میں برطانوی پاؤنڈ کے مقابلے میں روپے کی قدر میں کمی ہوئی تو ترسیلات زر کی اصل دولت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی۔

2. **دولت کی نکاسی کے اسباب** (Causes of the Drain of Wealth)

دادابھائی نوروجی نے دولت کی نکاسی کے نظریہ کو تقویت پہنچانے کی جو وجوہات بتائی ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

1. ہندوستان میں غیر ملکی حکمرانی اور انتظامیہ۔
2. معاشی ترقی کے لیے جو پیسہ اور محنت درکار تھی وہ غیر ملکی لائے تھے۔ لیکن پھر غیر ملکیوں نے ہندوستان پر زیادہ توجہ نہیں دی۔
3. تمام برطانوی شہریوں کی انتظامیہ اور فوج کے اخراجات ہندوستان ادا کرتا تھا۔
4. ہندوستان اندر اور باہر تعمیر کا بوجھ اٹھا رہا تھا۔
5. ہندوستان کی طرف سے ملک کی آزاد تجارت کو کھولنے کا زیادہ فائدہ برطانیہ کو تھا۔
6. برطانوی دور حکومت میں ہندوستان میں بڑے سرمایہ کار غیر ملکی تھے۔ انہوں نے ہندوستان سے جتنا بھی پیسہ کمایا، وہ کبھی کچھ خریدنے کے لیے ہندوستان میں سرمایہ کاری نہیں کرتے تھے۔ بلکہ وہ اس دولت کے ساتھ ہندوستان چھوڑ جاتے تھے۔

3. دولت کی نکاسی کے نتائج (Consequences of the Drain of Wealth)

معیشت پر اثر

1. دولت کی نکاسی کے نتیجے میں ہندوستان میں سرمایہ جمع نہیں ہو سکا۔ سرمایہ جمع نہ ہو سکا تو صنعتی ترقی بھی نہیں ہوئی۔
2. عوام کا معیار زندگی مسلسل گرتا رہا اور غربت میں اضافہ ہوا۔
3. دولت کی نکاسی سے عوام پر ٹیکسوں کا بوجھ بہت بڑھ گیا۔
4. اس کے ساتھ دستکاری کی اور گھریلو صنعتیں تباہ ہو گئیں اور زراعت پر دباؤ بڑھتا گیا جس سے بے زمین زرعی مزدوروں کی تعداد بڑھتی گئی۔

سیاست پر اثر

دولت کی نکاسی کے نظریے کی تائید کرتے ہوئے، قوم پرست مفکرین نے سامراج اور قوم پرستی کے تضاد کو تسلیم کیا اور اس طرح معاشی قوم پرستی کا تصور پیدا ہوا۔ اس سے برطانوی حکومت کے تمام دعووں کو مسترد کرنے میں مدد ملی، جیسے افادیت پسندی، جدیدیت کی علامتیں، مقامی خود حکومتی، تعلیم وغیرہ۔ معاشی قوم پرستی کا یہ شعور 1906 میں سودیشی تحریک میں ابھرنا شروع ہوا جب غیر ملکی اشیا کے بائیکاٹ اور دیسی اشیا کے فروغ اور اس کے استعمال کا نعرہ بلند ہوا۔

معاشرے اور ثقافت پر اثر

دولت کی کمی سے ریشم کی صنعت، تجارت، زراعت وغیرہ میں سرمایہ کاری نہیں ہوئی۔ نتیجتاً عوام کی فی کس آمدنی کم ہونے لگی۔ قحط کے تسلسل نے ان کی زندگی کو مزید خوفناک بنا دیا۔ اس طرح یورپ کی دیگر ریاستوں کے مقابلے میں ہندوستان کے لوگوں کا معیار زندگی اور بہتر زندگی کی توقع دونوں میں کمی واقع ہوئی اور یہی استحصال شدہ لوگ بعد میں ہندوستانی قوم پرستی کی سماجی بنیاد بن کر ابھرے۔

4. دولت کی نکاسی کے طریقے (Methods of the Drain of Wealth)

جب ہم دولت کی نکاسی کے طریقے پر غور کرتے ہیں تو درج ذیل نکات سامنے آتے ہیں۔

1. کاروباری اجارہ داری سے حاصل کردہ منافع
2. کمپنی کے ملازمین کی تنخواہ اور پنشن
3. کمپنی کے سرمایہ کاروں کو ادا کردہ منافع
4. کمپنی کے لندن آفس اور اس سے متعلقہ ملازمین پر اٹھنے والے اخراجات
5. کمپنی کے فوجی اور شہری امور سے متعلق سامان ہندوستان کے بازار سے نہیں بلکہ لندن کے بازار سے خریدا جاتا تھا جسے "اسٹور پرچیز" کہا جاتا تھا، تاکہ وہاں کے تاجروں کو فائدہ ہو۔
6. عوامی اخراجات کے لیے لندن سے لیے گئے قرض پر سود کی ادائیگی، جیسے: نہری اسکیم، قحط انتظامیہ، فوج، ریلوے وغیرہ سے متعلق اخراجات۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس عوامی قرض کا بہت کم حصہ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کیا گیا۔ تقریباً 40 فیصد حصہ فوج اور ریلوے پر خرچ ہوا۔ اور یہ فوج سلطنت کی حفاظت کے لیے استعمال کی جاتی تھی اور ہندوستان کا ریلوے کے ذریعے معاشی طور پر استحصال بڑھ گیا۔ بیرونی سرمایہ کاری پر ادا کردہ سود اور اس سرمایہ کاری سے حاصل ہونے والے منافع دونوں کا اخراج، جیسے: ہندوستان میں برطانوی حکومت، ہندوستانی ریلوے کی ترقی میں سرمایہ لگانے والی برطانوی کمپنیاں۔ ان کے کل سرمائے کے 5 فیصد سود کی حقدار تھیں۔ جبکہ برطانیہ میں یہ منافع کی شرح صرف 2 فیصد تھی۔

5. دولت کی نکاسی کے بارے میں مورخین کے خیالات (Historians' Views on the Drain of Wealth)

سامراجی اور قوم پرست مورخین دولت کی نکاسی کے حوالے سے مختلف آرا پیش کرتے ہیں۔

سامراجی مورخین

سر جان اسٹریچی نے اپنے 1888ء کے خطبات میں دولت کے نکاس (Drain of Wealth) کے طریقے کار کی بڑی صفائی کے ساتھ اور کسی لاگ لپٹ کے بغیر وضاحت کی تھی جو اس طرح ہے "سیکریٹری آف اسٹیٹ بلوں کی ادئیگی ہندوستان میں سرکاری خزانے سے کراتے ہیں اور ہندوستان میں عوامی مالیہ سے ادا کئے جانے والے ان بلوں کے ذریعے سوداگر وہ رقم حاصل کرلیتا ہے جس کی اسے ہندوستان میں ضرورت ہوتی ہے اور سیکریٹری آف اسٹیٹ کو وہ رقم حاصل ہو جاتی ہے جس کی انگلینڈ میں ضرورت ہوتی ہے۔" دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں برآمداتی سامان کی خریداری کا ارادہ رکھنے والے انگریز تاجر اسٹرلنگ کے بدلے میں سیکریٹری آف اسٹیٹ سے کاؤنسل کے بلوں کو خریدتے تھے اس کے بعد ان کاؤنسل بلوں کو حکومت ہند کے مالیہ سے روپے میں تبدیل کرالیا جاتا تھا اور اس روپے سے ہندوستان کے برآمداتی سامان کی خریداری کا کام لیا جاتا تھا۔ سر جان اسٹریچی جیسے سامراجی مورخین کا کہنا ہے کہ برطانیہ نے ہندوستان کی دولت نہیں لوٹی بلکہ برطانیہ نے ہندوستان میں اچھی انتظامیہ، سیکورٹی اور بنیادی ڈھانچہ تیار کیا اور اس کے بدلے میں معاوضہ (دولت) حاصل کیا۔ اس سلسلے میں مورس ڈی مورس کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کا کردار ایک چوکس چوکیدار جیسا ہے جس نے ہندوستان میں ترقی کے امکانات کو تحفظ فراہم کیا۔

قوم پرست مورخین

دولت کی نکاسی کے عمل پر روشنی ڈالتے ہوئے قوم پرست دانشوروں نے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ برطانوی حکومت کی استحصالی معاشی پالیسیاں ہندوستان کی پسماندگی اور صنعتی، ثقافتی، پسماندگی کی براہ راست ذمہ دار ہیں۔ قوم پرست مصنفین کا کہنا ہے کہ ہندوستان کی غربت اور پسماندگی نہ تو خدائی غضب ہے اور نہ ہی کوئی تاریخی ورثہ۔ ان کے نزدیک جس سماجی، سیاسی، ثقافتی اور معاشی عمل نے برطانیہ میں صنعتی انقلاب کو جنم دیا، ثقافتی ترقی کی راہ ہموار کی، اسی عمل نے پسماندگی، غربت، قحط، تجارت اور صنعتوں کی تباہی وغیرہ کی ہندوستان میں راہ ہموار کی۔

دادا بھائی نوروجی پہلے قوم پرست رہنما تھے جنہوں نے دولت کی نکاسی کے عمل کی نشاندہی کی اور بتایا کہ برطانوی حکومت کس طرح آمدنی، صنعت، تجارت وغیرہ کے ذرائع سے ہندوستانی دولت کو نکالتی ہے۔ نوروجی کے مطابق اس سامراجی حکومت کی معاشی پالیسیوں کا سب سے مکروہ پہلو یہ ہے کہ یہاں کا پیسہ باہر نکل کر برطانیہ چلا گیا اور وہی دولت ہمیں قرض کی صورت میں دستیاب کرائی گئی جس کے لیے ہمیں بھاری دولت ادا کرنی پڑی۔ نوروجی کے مطابق، برطانوی حکومت نہ صرف ہندوستانی دولت کو ضبط کرتی ہے بلکہ اخلاقیات کو بھی ضبط کرتی ہے کیونکہ یہ ہندوستانی عوام کو ان کے حقوق سے محروم کرتی ہے۔ اس تناظر میں عالم سلیوان کا بیان سامراجی ذہنیت کو بے نقاب کرتا ہے۔:"برطانوی حکومت کا نظام اسفنج کی طرح ہے جو گنگا کے پانی کو جذب کر کے دریائے ٹیمز میں نچوڑ دیتا ہے۔" سمت سرکار کے مطابق "دولت کے نکاس کے نظریے کو شروع ہی سے تنقید کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے اور اس سلسلے میں قوم پرستوں کے بعض فارمولے اب کسی قدر تشنہ اور مبالغہ آمیز معلوم ہونے لگے ہیں" سمت سرکار یہ بھی کہتے ہیں کہ "دولت کے بہاؤ کے سلسلے میں قوم پرستوں نے مبالغہ سے کام لیا ہے کیونکہ غیر ملکی تجارت اور برآمداتی توفیر (Surplus) ہندوستان کی قومی آمدنی کا ایک معمولی حصہ رہی ہوگی، مگر نوروجی کی بات میں یقیناً بہت وزن تھا جب انہوں نے 1895ء میں Welby Commission کو بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ ہندوستان سے ہماری دولت باہر لے جائی جارہی ہے وہ ایک ایسا توفیر (Surplus) ثابت ہو سکتی ہے جو ملک میں مناسب سرمایہ کاری کی صورت میں ہندوستان کی آمدنی قابل لحاظ اضافہ کا باعث ہوتی، اس سلسلے میں سامراجی حلقوں کی طرف سے دفاع کرتے ہوئے اسٹریچی کا کہنا تھا کہ "ہندوستان میں انجام دی گئی انگریزی خدمات کے معاوضہ یا انگلینڈ کے سرمائے میں توسیع کے علاوہ برطانیہ سے ہندوستان کو کچھ اور نہیں ملتا۔"

6. **نکالی گئی دولت کی مقدار اور نوعیت** (Amount and Nature of the Wealth Extracted)

برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی اور برطانوی ولی عہد کی طرف سے ہندوستان سے نکالی گئی دولت کا صحیح اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ مختلف مؤرخین اور دانشوروں نے مختلف اعداد و شمار بیان کیے ہیں۔

1. صوبہ بنگال میں موصول ہونے والی آمدنی اور اخراجات کی تفصیلات کے مطابق، کمپنی نے پہلے 6 سالوں (1765 سے 1771) کے دوران 1,30,66,991 پاؤنڈ خالص آمدنی حاصل کی، جس میں سے 90,27,609 پاؤنڈ خرچ ہوئے۔ بقیہ 40,39,152 پاؤنڈ کا سامان انگلینڈ بھیج دیا گیا۔

2. ولیم ڈگبی کے مطابق 1757 سے 1815 تک ہندوستان سے 50 سے 100 ملین پاؤنڈ کی دولت انگلینڈ بھیجی گئی۔

3. 1828 میں مارٹن منٹگمری نے اندازہ لگایا کہ ہر سال 30 ملین پاؤنڈ ہندوستان سے باہر جاتے ہیں۔

4. جارج ونسنٹ کے 1859 میں لگائے گئے تخمینے کے مطابق 1834 سے 1851 تک ہر سال تقریباً 42 لاکھ پاؤنڈ ہندوستان سے باہر گئے۔

8.8 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

برطانوی استعمار نے ہندوستان کے سیاسی اقتدار پر قابض ہونے کے ساتھ ساتھ معاشی ڈھانچے کو بھی نہایت منظم اور منصوبہ بند انداز میں اپنی ضروریات کے مطابق ڈھال لیا۔ ہندوستان جو کبھی صنعت، دستکاری اور تجارت میں ایک خود کفیل اور خوشحال خطہ تھا، رفتہ رفتہ خام مال فراہم کرنے والی نوآبادی اور تیار شدہ برطانوی مصنوعات کی کھپت گاہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ صنعتوں کے زوال کے نتیجے میں لاکھوں کاریگر اور بنکر بے روزگار ہوئے، جبکہ زرعی شعبے پر غیر معمولی دباؤ بڑھ گیا۔ دوسری جانب دولت کی نکاسی نے ہندوستان کی معاشی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا، کیونکہ ہندوستانی محصولات، محنت اور وسائل کو برطانیہ کی سلطنت کو مستحکم کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا رہا، مگر اس کے بدلے ہندوستان کو کوئی حقیقی فائدہ نہ ملا۔ برطانوی حکومت کی ترجیحات ہمیشہ اپنی سلطنت کی فوجی، سیاسی اور صنعتی ضروریات کے گرد گھومتی رہیں، جس کے سبب ہندوستان میں نہ صرف معاشی جمود پیدا ہوا بلکہ ایک مستقل غربت، محرومی اور استحصال کا سلسلہ قائم ہوا۔ لہٰذا یہ کہنا بجا ہوگا کہ برطانوی حکومت نے محض سیاسی بالادستی نہیں قائم کی بلکہ ہندوستان کی معاشی روح کو صدیوں تک متاثر کرنے والا زخم دیا جس کے اثرات آزادی کے بعد بھی طویل عرصے تک محسوس کیے جاتے رہے۔

8.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

8.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. دادابھائی نوروجی نے (Poverty and Un-British Rule in India) کس سال میں شائع کی؟

(a) 1865 (b) 1871

(c) 1901 (d) 1905

2. "دولت کی نکاسی" کا تصور سب سے پہلے کس مفکر نے پیش کیا؟

(a) راناڈے (b) گوپال کرشن گوکھلے

(c) دادابھائی نوروجی (d) رمیش چندر دت

3. ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی اجارہ داری کو باضابطہ طور پر کس منشور کے تحت ختم کیا گیا؟

(a) 1773 (b) 1813

(c) 1858 (d) 1874

4. برطانوی مصنوعات کو ہندوستانی بازار میں فروغ دینے کے لیے کون سی پالیسی اختیار کی گئی؟

(a) فری مارکیٹ (b) مرکینٹلزم

(c) سوشلسٹ ماڈل (d) زرعی اجارہ داری

5. برصغیر میں کپڑے کی صنعت کے زوال کی ایک بڑی وجہ کیا تھی؟

(a) کاریگروں کی بغاوت (b) خام مال کی کمی

(c) مشینی صنعتوں کی آمد (d) کاریگروں کی ہجرت

6. Home Charges کس چیز کو کہا جاتا تھا؟

(a) کسانوں سے لیا جانے والا نقدی محصول (b) ہندوستان سے برطانیہ بھیجے جانے والے سالانہ اخراجات

(c) ہوم آرمی کے لیے خرچ ہونے والی رقم (d) انکم ٹیکس کی ایک مخصوص شرح

7. 1853 میں ریل کا نظام متعارف کرانے کا بنیادی مقصد کیا تھا؟

(a) عام لوگوں کی سہولت (b) فوجی نقل و حمل

(c) مذہبی یاترا کے لیے آسانی (d) مقامی تجارت کو فروغ دینا

8. صنعتی زوال کے نتیجے میں اکثر بے روزگار بنکر کس شعبے کی طرف گئے؟

(a) دستاویزی کام (b) زراعت

(c) فوجی خدمات (d) عدالتی نظام

9. مندرجہ ذیل میں سے کون سا عنصر "دولت کی نکاسی" کے طریقوں میں شامل نہیں تھا؟

(a) کمپنی ملازمین کی پنشن (b) مقامی مدارس کی اعانت

(c) اسٹور پرچیز (d) سرکاری قرضوں پر سود

10. سرجان اسٹریچی (Sir John Strachey) کس فکر سے وابستہ تھے؟

(a) سامراجی مورخ (b) قوم پرست مورخ

(c) سماجی اصلاح کار (d) مارکسی مفکر

جوابات	1	2	3	4	5	6	7	8	9	10
	c	c	c	a	c	b	b	b	b	a

8.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. یوروپی ممالک مشرق کے لیے بحری راستے کی تلاش میں کیوں تھے؟ واضح کریں۔

2. یوروپیوں کی ہندوستان کے ساتھ ابتدائی تجارت کی نوعیت کا تنقیدی جائزہ لیں۔
3. کمپنی کی حکومت پر مختصر نوٹ لکھیں۔
4. تاج برطانیہ کی حکومت پر مختصر نوٹ لکھیں۔
5. صنعت اور دستکاری کے زوال کے نتائج پر نوٹ لکھیں۔

8.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

6. ہندوستان میں برطانوی سلطنت کے قیام پر تفصیلی مضمون لکھیں۔
7. روایتی صنعتوں پر برطانوی نو آبادیاتی حکومت کے نتائج کا جائزہ لیں۔
8. کپڑے کی صنعت کے زوال پر تفصیلی روشنی ڈالیں۔

فرہنگ

(Glossary)

ادائیگی :Payments-تجارت میں کسی شے کی قدر کا مبادلہ۔

استمراری بندوبست :Permanent Settlement-نظام جس میں زمین کے محصول (ٹیکس) کو ہمیشہ کے لیے مقرر کر دیا گیا تھا اور زمیندار کو زمین کا مالک تسلیم کر لیا گیا۔

بازارکاری :Commercialisation-زراعت یا صنعت صرف ذاتی یا مقامی ضرورت کے بجائے منڈی میں بیچنے اور منافع کمانے کے لیے کی جائے۔

برآمدات :Exports-جو چیز ملک سے کہیں باہر جائے۔

بندھنا طریقہ کار :رنگائی کے لیے دہلی میں استعمال ہونے والا طریقہ کار۔

بولین :Bullion-قیمتی دھاتیں۔

پاہی کاشت :وہ کسان جو دوسرے کے کھیت میں کھیتی کرتا ہے۔

تجارتی تحفظ پسندی :Trade Protectionism-اپنی ملکی تجارت کو بیرونی مصنوعات کے مقابلے میں چنگیوں کے ذریعے تحفظ دینا۔

تشخیص / تخمینہ کاری :Assessment-عمل جس سے کسی زمین یا فصل سے وصول ہونے والے محصول کی مقدار کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔

ٹیرف پالیسی :Tariff Policy-چنگی کی پالیسی، جو کسی چیز کی درآمد یا برآمد پر محصول لگا کر اپنائی جاتی ہے۔

جمع :تشخیص شدہ کل محصول یا وہ رقم / پیداوار جو سرکاری حساب میں درج کی جاتی تھی۔

حاصل :جو محصول حقیقت میں حاصل ہو پاتا تھا۔

خریف :Kharif-اپریل سے ستمبر کے دوران اُگائی اور کاٹی جانے والی فصلیں، مثلاً دھان (چاول)، مکئی اور باجرہ۔

خود کاشت :وہ کسان جو خود کے کھیت میں کھیتی کرتا ہے۔

دام :تانبے کا سکہ۔

درآمدات :Imports-جو چیز ملک میں کہیں باہر سے آئے۔

دستک :تجارتی اجازت نامہ۔

دستور / دستورالعمل :مغل عہد میں زرعی محصولات کے لیے نافذ کیے گئے باضابطہ قواعد و ضوابط جن کے تحت محصول کی شرح، مقدار اور طریقۂ وصولی طے کی جاتی تھی۔

دولت کی نکاسی کا نظریہ :Drain of Wealth- نظریہ جس کے مطابق انگریز ہندوستان کی دولت مختلف طریقوں سے یورپ لے جا رہے تھے، جیسے ٹیکس، تنخواہیں، اور منافع۔

دیہی مقروضیت :Rural Indebtedness- کیفیت جس میں گاؤں کے کسان بار بار قرض لے کر سود کے جال میں پھنس جاتے ہیں اور اسے واپس نہیں کر پاتے۔

ربیع : Rabi- اکتوبر سے مارچ کے دوران اُگائی اور کاٹی جانے والی فصلیں، مثلاً گیہوں، جو اور سرسوں۔

رعیت واری بندوبست :Ryotwari Settlement- نظام جس میں زمین کا محصول براہِ راست کسان (رعیت) سے لیا جاتا تھا، بیچ میں کوئی زمیندار نہیں ہوتا تھا۔

زرعی محصول :Agricultural Tax- زرعی پیداوار پر لیا جانے والا محصول، جو حکومت کسانوں سے وصول کرتی تھی۔

زمورین :کالی کٹ کے راجاؤں کا لقب۔

زوال صنعت :De-industrialisation- مقامی صنعتوں اور دستکاریوں کی تباہی اور نئی صنعتوں کے نہ بڑھنے کا عمل

عامل : گاؤں سے لگان وصول کرنے والا کارکن۔

عمل گزار :مالگزاری نظام کا ایک ذمہ دار عملہ یا اہلکار جو محصول کی تشخیص، جمع یا وصولی میں شامل ہوتا تھا۔

غروب آفتاب قانون :Sunset Law- برطانوی قانون جس کے مطابق اگر زمیندار مقررہ تاریخ (غروبِ آفتاب تک) تک محصول ادا نہ کرے تو اس کی زمین ضبط کر کے نیلام کر دی جائے۔

محل واری بندوبست :Mahalwari Settlement- نظام جس میں پورے گاؤں یا برادری کو ایک اکائی مان کر مالگزاری عائد کی جاتی تھی اور سب کسان اجتماعی طور پر ذمہ دار ہوتے تھے۔

مقدم : گاؤں کا مکھیہ۔

مہاجن / ساہوکار :Moneylender- وہ افراد جو کسانوں کو قرض دیتے تھے اور عموماً سود (بہت زیادہ شرح پر) وصول کرتے تھے۔

مہر :اشرفی، سونے کا سکہ۔

نیل کی بغاوت : Indigo Revolt- سال 1859 میں بنگال کے کسانوں کی نیل کی جبری کاشت کے خلاف بغاوت۔

تجویز کردہ اکتسابی مواد

(Suggested Learning Resources)

1. Alam, M., & Subramanyam, S. (2002). *The Mughal State, 1526-1750.* New Delhi: Oxford University Press.
2. Ali, M. A. (2006). *Mughal India: Studies in Polity, Ideas, Society and Culture.* New Delhi: Oxford University Press.
3. Bandyopadhyay, S. (2014). *From Plassey to Partition and After.* New Delhi: Orient Blackswan.
4. Banerjee-Dube, I. (2019). *A History of Modern India.* Cambridge University Press.
5. Barlkrishan, S. (2008). *Jagirdars in the Mughal empire during the Reign of Akbar.* New Delhi: Manohar.
6. Bayly, C. A. (1983). *Rulers, Townsmen and Bazaars: North Indian Society in the Age of British Expansion.* Cambridge.
7. Chandra, B. (2009). *History of Modern India.* New Delhi: Orient BlackSwan.
8. Chandra, B. (2016). *The Rise and Growth of Economic Nationalism in India.* Anamika Publishers & Distributors Pvt., Ltd.
9. Chandra, S. (1986). *The 18th Century in India: Its Economy and the Role of the Marathas, the Jats, the Sikhs and the Afghans.* Calcutta: Centre for Studies in Social Sciences.
10. Chandra, S. (1999). *Medieval India: From Sultanate to the Mughals.* New Delhi: Har Anand Publications.
11. Chitnis, K. N. (2008). *Medieval Indian History.* New Delhi: Atlantic Publishers and Distributors.
12. Cohn, B. S. (1996). *Colonialism and Its Forms of Knowledge: The British in India.* Princeton University Press.
13. Dalrymple, W. (2019). *The Anarchy: The East India Company, Corporate Violence, and the Pillage of an Empire.* London: Bloomsbury.
14. Davis, M. (n.d.). *Late Victorian Holocausts: El Niño Famines and the Making of the Third World.* Verso.
15. Gandhi, R. (2018). *A History of Modern South India: A History from the 17th Century to Our Times.* New Delhi: Aleph Book Company.
16. Habib, I. (1963). *The Agrarian System of Mughal India 1556–1707.* New Delhi: Oxford University Press.
17. Habib, I. (2001). *The Economic History of Medieval India: A Survey.* Aligarh: Aligarh Historians Society.
18. Habib, I. (2013). *The Agrarian System of Mughal India 1556-1707.* New Delhi: Oxford University Press.
19. Habib, I. (2021). *Akbar and His India.* New Delhi: Oxford University Press.

20. Habib, I., & Raychaudhari, T. (1982). *The Cambridge Economic History of India* (Vol. 1). Cambridge University Press.
21. Hasan, S. N. (1990). *Thoughts on Agrarian Relations in Mughal India.* New Delhi: People's Publishing House.
22. Iraqi, S. (2008). *Medieval India 2: Essays in Medieval Indian History and Culture.* New Delhi: Manohar.
23. Khan, I. A. (2016). *India's Polity in the Age of Akbar.* Ranikhet: Permanent Black.
24. Kumar, D., & Desai, M. (2014). *Cambridge Economic History of India* (Vol. 2). Cambridge University Press.
25. Marshall, P. J. (2003). *Eighteenth Century in Indian History, Revolution and Evolution.* OUP.
26. Mehta, J. L. (1995). *Advanced Study in the History of Medieval India: Medieval Indian Society and Culture* (Vol. 3). New Delhi: Sterling Publishers.
27. Metcalf, B. D., & Metcalf, T. R. (2012). *A Concise History of Modern India* (3rd ed.). New Delhi: Cambridge University Press.
28. Moosvi, S. (1987). *The Economy of the Mughal Empire, C. 1595: A Statistical Study.* New Delhi: Oxford University Press.
29. Moreland, W. H. (2022). *From Akbar to Aurangzeb: A Study in Indian Economic History.* New Delhi: Manohar.
30. Naqvi, H. K. (1968). *Urban Centres and Industries in Upper India, 1556-1580.* Bombay: Asia Publishing House.
31. Richards, J. F. (2002). *The Mughal Empire.* New Delhi: Cambridge University Press.
32. Roy, T. (1999). *Traditional Industry in the Economy of Colonial India.* Cambridge University Press.
33. Roy, T. (2000). *The Economic history of India: 1857-1947.* Oxford University Press.
34. Roy, T. (2002). *India in the World Economy: From Antiquity to the Present.* Cambridge University Press.
35. Sarkar, S. (1989). *Modern India: 1885-1947.* New Delhi: Macmillan.
36. Subramanyam, S. (2011). *Explorations in Connected History: From the Tagus to the Ganges.* New Delhi: Oxford University Press.
37. Subramanyan, S. (2014). *Explorations in Connected History: Mughals and Franks.* New Delhi: Oxford University Press.
38. Tharoor, S. (2016). *An Era of Darkness: The British Empire in India.* New Delhi: Aleph.
39. Vanina, E. (2004). *Urban Crafts and Craftsmen in Medieval India (Thirteenth-Eighteenth Centuries).* New Delhi: Munshiram Manoharlal Publisher.
40. Will, D. (2007). *The Case for India.* Mumbai: Standard Book Stall.
41. Wilson, J. E. (2016). *India Conquered: Britain's Raj and the Chaos of Empire.* United Kingdom: Simon & Schuster.

نمونہ امتحانی پرچہ

(Model Examination Paper)
Maulana Azad National Urdu University
B.A. I Semester Examination
Indian Economic History (Mughal and British Period
Paper Code: BNEC101DET

Time: 2 hrs. Marks: 35

ہدایات:

یہ پرچہ سوالات تین حصوں پر مشتمل ہے: حصہ اول، حصہ دوم، حصہ سوم۔ ہر جواب کے لیے لفظوں کی تعداد اشارۃً ہے۔ تمام حصوں سے سوالوں کا جواب دینالازمی ہے۔

1. حصہ اول میں 05 سوالات ہیں جو معروضی جواب والے سوالات ہیں۔ ہر سوال کا جواب لازمی ہے۔ ہر سوال کے لیے 01 نمبر مختص ہے۔ $(5 \times 1 = 05 \text{ marks})$
2. حصہ دوم میں 08 سوالات ہیں۔ ان میں سے طالب علم کو کوئی چار سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کا تقریباً 100 لفظوں پر مشتمل ہو۔ ہر سوال کے لیے 05 نمبرات مختص ہیں۔ $(5 \times 4 = 20 \text{ marks})$
3. حصہ دوم میں 02 سوالات ہیں۔ اس میں سے طالب علم کو کوئی ایک سوال کا جواب دینا ہے۔ ہر سوال تقریباً 250 لفظوں پر مشتمل ہو۔ سوال کے لیے 10 نمبرات مختص ہیں۔ $(1 \times 10 = 10 \text{ marks})$

حصہ اول

سوال 1.

I. دہسالہ نظام کو کس مغل بادشاہ نے شروع کیا تھا؟

(a) اکبر (b) بابر

(c) جہانگیر (d) شاہ جہاں

II. آئین اکبری کے مطابق سلطنت کی آمدنی کا کتنا فیصد زرعی محصولات سے حاصل ہوتا تھا؟

(a) 50-60 فیصد (b) 60-70 فیصد

(c) 70-80 فیصد (d) 80-90 فیصد

III. آئین اکبری کے مصنف کا نام بتائیں۔

(a) نظام الدین احمد (b) ابوالفضل

(c) عبدالقادر بدایونی (d) عباس خاں شیروانی

IV. برطانوی ہندوستان میں زراعت کی تجارت کاری کا ایک بڑا نتیجہ کیا تھا؟

(a) خوراک کی حفاظت میں اضافہ (b) دیہی غربت

(c) روایتی صنعتوں کی ترقی (d) شہری کاری میں کمی

V. رعیت واری مالگزاری نظام کس نے نافذ کیا؟

(a) لارڈ کارنوالس (b) تھامس منرو

(c) ہالٹ میکنزی (d) لارڈ تھامس میکنزی

حصہ دوم

سوال 2. مغل دور حکومت میں آبپاشی کے لیے استعمال ہونے والے کوئی تین طریقے تحریر کریں۔

سوال 3. مغل دور میں سوتی کپڑوں کے اہم مراکز کون سے تھے؟

سوال 4. ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام پر ایک نوٹ قلم بند کریں۔

سوال 5. برطانوی ہندوستان کے معاشی انضمام میں ریلوے کا کردار بیان کریں۔

سوال 6. مغل دور میں کسان طبقے کی زندگی کا ایک جائزہ پیش کریں۔

سوال 7. محل واری بندوبست کے نقصانات بیان کریں۔

حصہ سوم

سوال 8. عہدِ وسطیٰ اور مغلیہ عہد میں متفرق صنعتوں کی افادیت پر نوٹ لکھیں۔

سوال 9. برطانوی دور میں کپڑے کی صنعت کے زوال پر تفصیلی روشنی ڈالیں۔